صادقین نقاش نمبر

ماہنامہ طلوعِ افکار کراچی

صادقین۔ سلف پورٹریٹ۔ ۱۹۶۵ء

طلوعِ افکار

خرد افروزی کا نمائندہ

اشاعت کا ۱۲واں سال

مدیر مسئول:

حسین انجم

مدیر معاون

جاوید انجم

مجلس ادارت

مظہر جمیل

مسلم شمیم

صدر دفتر اور مقام اشاعت

ایچ ۲۸ - رضویہ سوسائٹی کراچی
(۷۴۶۰۰)

فون ۶۲۳۲۵۶ ، ۶۲۵۴۶۲ تار کا پتا - جاپاک

قیمت

ایک سو پچاس روپے

تقسیم کنندہ
(برائے پاکستان)

مکتبۂ دانیال، کراچی

وکٹوریہ چیمبرز ۲، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

بدلِ اشتراک

(اندرونِ ملک)

فی شمارہ	دس روپیہ
سالانہ	ایک سو پچاس روپے

(بیرونِ ملک)

فی شمارہ	ایک ڈالر
سالانہ	ایضاً بیس ڈالر

سرورق : اقبال مہدی

"صادقین" ایک ایسے نابغۂ عادِ تخلیق کار تھے جو بالآخر ہمارے تہذیبی وجود کی منہاج و علامت قرار پاتے ہیں، انہوں نے اپنی فن کارانہ دانش اور خلاقیت کے معنی خیز خطوط، نقوش اور رنگوں سے جو طلسمات تشکیل دی ہے وہ اپنی لازوال تاثر پذیری کی آپ دلیل ہے اور رہے گی، ان کی نظم و نثر کی سوغات ہمارے ادبی و تہذیبی ورثے کی توسیع نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کے ارتقائی عمل میں ہر عہد اپنے دانشوروں، فن کاروں اور اہلِ کمال شخصیتوں ہی کے چھوڑے ہوئے نقوش کے حوالے سے سانس لیتا ہے، ورنہ وقت کا بے رحم سیلِ رواں سب ہی کچھ اپنے دامن میں سمیٹ لے جاتا ہے، سوائے اُن روشن جواہر کے، جو تہہ در تہہ خاک کے تودوں میں دبے، اپنے تخلیق کاروں کے حوالے سے اُن کے زمانے کی کہانی سنا رہے ہوتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ مکافاتِ عمل کے اس تسلسل میں جب صدیوں بعد بھی صادقین کا کوئی نہ کوئی نقش، کوئی نہ کوئی خط، کوئی نہ کوئی تحریر کوئی نہ کوئی انداز نو کسی نہ کسی خزینۂ تہذیب سے برآمد ہوگا تو ہمارے تہذیبی وجود ہی کی شہادت دے گا، طلوعِ افکار کا تازہ شمارہ اس یقین کی عملی صورت کا اظہار ہے۔

"صادقین" کثیر الجہت MULTI DIMENTIONAL شخصیت کے حامل فن کار تھے۔ ان کی خلاقی نے اپنے اظہار کے لئے مصوری، نقاشی، خطاطی اور شاعری کے وسیع تر ذرائع کو اختیار کیا تھا، انہوں نے جس پیرایۂ اظہار کو بھی ہاتھ لگایا اُسے تنوع وسعت اور گہرائی سے ہمکنار کر دیا۔ تجربہ، ایجاد، اختراع اور تازہ کاری نے اُن کے فن کو وہ عظیم تابناکی اور اثر پذیری عطا کی ہے جو اُن ہی سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے، اُن کے موِ قلم سے کھینچے ہوئے خطوط و نقوش ہوں یا اُن کے کینوس پر بکھرے ہوئے رنگوں کی دھنک کہ اُن کے قلم سے نکلے ہوئے شعری و نثری پیکر، ان سب پر صرف اور صرف صادقین ہی کی چھاپ ہے اور یہ تمام فنی میڈیم مل جل کر اس عظیم شخصیت کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں جسے ہم صادقین کہتے ہیں، ہر چند اس موقع پر صادقین کی مصوری، خطاطی اور شاعری کا جائزہ لینا ہمارا مقصود نہیں ہے کہ ان موضوعات پر پاک و ہند کے معتبر صاحبانِ قلم اور اہلِ الرائے حضرات کے مضامین اس شمارہ میں آپ کے منتظر ہیں لیکن اس مرحلے پر ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ صادقین ایسے فن کار قطعاً نہیں تھے جس نے محض اپنی انا کے غار میں بند ہو کر رنگوں اور خطوط کی آمیزش سے فقط ہیئت ہی کے تجربے کئے ہوں اور اپنے فن کو تجرید کے کسی ایسے کاخِ بلند پر رکھ چھوڑا ہو جہاں خاک نشینوں کا گزر ممکن ہی نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس احوالِ واقعی تو یہ ہے کہ اُن کی شخصیت ایک ایسے عوام دوست اور زندگی آموز جمالیاتی مزاج اور رویے سے مل کر بنی تھی جو ہمارے عظیم صوفیوں اور درویشوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے، ان کے فن کی جڑیں زمین کی گہرائی میں پیوست رہی ہیں۔ وہ ایک حساس سماجی شعور اور گہری بصیرت کے حامل شخص تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنے فن کو صرف صوری اجتہاد تک محدود نہ رکھا تھا بلکہ اسے معنویت کی وہ گہرائی بھی عطا کر رکھی تھی جو روحِ عصر اور شعور کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ ان کی مصوری کے مختلف ادوار اور سیریز جن میں انسانی خطوط اور اشکال نامانوس ہیولے سے نظر آنے لگتے ہیں در اصل اس روحانی کرب اور اذیت کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے ان کا عہد اور معاشرہ گزر رہا ہے۔ انسانی جسموں پر تنی ہوئی نوک دار کانٹوں کی پوشاک اور سروں پر منڈلاتے ہوئے کوّوں اور گدھوں کی علامتیں اس صورتِ آشوب کے علاوہ اور کیا کہی جا سکتی ہیں جن کی بازگشت ان کے ہم عصر ادب میں بھی سنائی دے رہی ہے، صادقین نے بلاشبہ اپنے موِ قلم کو اس عصری جہاد میں شریک رکھا تھا جو شرفِ انسانیت کے احترام اور روشن خیالی کے فروغ و توسیع کے سلسلے میں جاری رہا ہے۔ اسی لئے ان کی تصویروں میں کہیں شہادت کی ثنا خوانی اور کہیں ظلمت پر نور کی فتح و کامرانی کی سرشاری ملتی ہے تو کہیں استحصالی عصبیت و تنگ نظری کے خلاف احتجاج کی پکار۔

انہوں نے خطاطی کا جو آہنگ اختیار کیا ہے اور حروف کو مربوط اور مسلسل لکھنے کا جو گُر ایجاد کیا ہے وہ دراصل اس اختلاط اور اشتراک کی نشاندہی کرتا ہے جو وہ ہماری جمالیاتی اقدار میں آمیز ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ تحریر کو تصویر کر دینے اور خطاطی کو مصوری سے ملا دینے کا فن صادقین ہی سے منسوب ہے اور صادقین ہی سے منسوب رہے گا۔ انہوں نے شاعری میں رباعی جیسی مشکل صنفِ سخن کو بھی غالباً اسی لئے منتخب کیا تھا کہ وہ چار مصرعوں کے محدود حصے میں لفظ و معنی سے متحرک تصویر بنا کر دکھا دیں۔ ان رباعیات میں موضوعات و مضامین کا جو تنوع موجود ہے وہ ان کے وسیع تر شعری افق کی نشاندہی کرتا ہے۔ شاعری کو تصویری پیکر بنا دینے کا انہیں جو ملکہ حاصل تھا وہ دراصل اُن کے خداداد مصورانہ کمال کی دین تھا۔ اور اس اعتبار سے انہیں دوسرے رباعی گو اساتذہ میں اہم مقام حاصل رہے گا۔ ان تمام نکات کی روشنی میں صادقین ایک ایسے خود آگاہ فن کار ٹھہرتے ہیں جنہیں اس بات کا مکمل شعور حاصل تھا کہ ان کا فن عصری شعور سے ہم رشتہ رہ کر ہی اپنے لئے ایسی معنوی توسیع حاصل کر سکتا ہے جو مقامی حد بندیوں سے نکل کر عالمی تناظر کا حامل ہو سکے۔ وہ جانتے تھے کہ ماضی کی روایت تجربے کی پیوندکاری ہی سے برگ و بار پاتی ہے جس کے لئے فن کار کو جہاں ایک طرف اپنی مٹی کی خوشبو اور اپنے عہد کی مہک کے احساس سے سرشار ہونا ہوتا ہے وہیں اس کے لئے اقصائے عالم میں برپا اس کارزار کا ادراک بھی ضروری ہے جس سے دنیا بھر کے نسبتاً کمزور معاشرے دوچار ہو رہے ہیں، چنانچہ ان کے فن میں تیسری دُنیا کے مفلوک الحال عوام کے لئے جو ہمدردانہ رَو جاری و ساری نظر آتی ہے وہ ان کے اسی احساس کی نشاندہی کرتی ہے۔ انہوں نے غالب، اقبال اور فیض کی شاعری کو صورت گری کے لئے اسی لئے تو منتخب کیا تھا کہ وہ اُن برگزیدہ فن کاروں میں جہاں اُن کے عہد کی سچائیوں کو سانس لیتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ وہیں اُن کی آنکھوں میں آنے والے عہد کے خواب کی پرچھائیاں بھی دیکھ پانے کی صلاحیت رکھتے تھے، اسی لئے صادقین نے اپنے پیشروؤں کی شاعری کو محض روایتی انداز میں پینٹ کرنے کی بجائے اپنے مُوقلم سے ان مختلف معنوی جہتوں اور پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے جو غالب، اقبال اور فیض کی شاعری میں انہیں محسوس ہوتے تھے۔

آج جب ہم اپنے ارد گرد کی تہذیبی فضا کو دن بدن بنجر پن کی نذر ہوتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہر قسم کی مجنونانہ تنگ نظری، عصبیت، بنیاد پرستی، خوف و دہشت اور ہلاکت کا زہر سرایت کرتا جا رہا ہے، اور قومی و معاشرتی سطح پر عدل، انصاف، ترحم جیسی انسانی اقدار کی بجائے کچھ اور قدریں فوقیت پاتی چلی جا رہی ہیں تو صادقین کے خطوط، رنگوں اور لفظوں کے آہنگ سے ترتیب پانے والے جہانِ فن کی معنویت میں کچھ اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ آج ہم اس سے زیادہ بہتر اور موثر طور پر جمالیاتی حظ پاتے ہیں۔

صادقین پر شائع ہونے والے طلوعِ افکار کے اس یادگار نمبر کے ادارتی شذرہ کو میں مرحوم کی اس رباعی پر ختم کرتا ہوں۔

خیام کو اک کتاب میں نے دی ہے
سرمد کی مئے عذاب میں نے پی ہے
اصنافِ ادب میں سب سے کڑی ہے جو صنف
اپنے لئے انتخاب میں نے کی ہے

[illegible]

کوائف

پیدائش : ۳۰ جون ۱۹۳۰ء

مقامِ پیدائش : امروہہ

تعلیم : بی۔اے آگرہ یونیورسٹی

نمائشیں : ۱۹۵۴-۶۰ء متعدد انفرادی نمائشیں

مارچ ۱۹۶۰ء حکومتِ پاکستان نے تمغۂ امتیاز دیا۔

جولائی ۱۹۶۰ء کل پاکستان قومی نمائش میں پہلا انعام

دسمبر ۱۹۶۰ء : فرنچ کمیٹی آف دی انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف پلاسٹک آرٹ کی دعوت پر پیرس روانگی۔

اگست اکتوبر ۱۹۶۱ء ۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کراچی میں میورال بنائی (۸' × 12')

ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء BIENNALE OF PARIS میں شرکت اور LAUREATE BIENNALE DE PARIS ایوارڈ

مارچ ۱۹۶۲ء : صدر پاکستان کی جانب سے تمغۂ حسن کارکردگی۔

جون جولائی ۱۹۶۲ء MUSEE MAISON DE CULTURE فرانس میں نمائش

اکتوبر ۱۹۶۲ء GALERIE LAMBERT پیرس میں انفرادی نمائش اور GALERIE MONA LISA پیرس میں مستقل نمائش

مئی اگست ۱۹۶۳ء ۔ دورۂ امریکہ

اگست ۱۹۶۳ء HENRY GALLARY واشنگٹن میں نمائش

اکتوبر نومبر ۱۹۶۳ء COMMAN WEALTH INSTITUTE GALLARY لندن میں نمائش

دسمبر ۱۹۶۳ء MUSEUM OF MODERN ART لندن میں نمائش اور PARIS کے 5TH SALOU میں شرکت

کراچی ۱۹۵۷ء کراچی ۱۹۶۵ء کراچی ۱۹۶۲ء کراچی اگست ۱۹۶۸ء کراچی ستمبر ۱۹۶۸ء
کراچی اکتوبر ۱۹۶۸ء ۔ کراچی نومبر ۱۹۶۸ء کراچی دسمبر ۱۹۶۸ء کراچی مئی ۱۹۶۹ء کراچی مئی ۱۹۷۰ء کراچی جولائی ۱۹۷۰ء
کراچی نومبر ۱۹۷۰ء کراچی فروری ۱۹۷۱ء کراچی ۔ ستمبر ۱۹۷۱ء کراچی ۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء کراچی ستمبر ۱۹۷۵ء کراچی ۱۹۸۳ء
کراچی ۱۹۸۴ء کراچی ۱۹۸۵ء کراچی ۱۹۸۶ء

لاہور

ستمبر ۱۹۶۵ء مارچ ۱۹۶۸ء فروری ۱۹۷۲ء اگست ۱۹۷۳ء فروری ۱۹۷۶ء مئی ۱۹۷۶ء اگست ۱۹۷۷ء
نومبر ۱۹۷۷ء جنوری ۱۹۷۸ء جولائی ۱۹۷۹ء

راولپنڈی ، اسلام آباد ، پشاور ، حیدرآباد

کوئٹہ ۱۹۵۵ء۔

مَمالکِ غیر:

واشنگٹن

اگست ۱۹۶۳ء

لوزان SWITZERLAND

ستمبر ۱۹۶۲ء

مشرقِ وسطیٰ: اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۷۴ء

دوبئی، جدہ، قاہرہ، بیروت، دمشق، عمان، ابوظہبی، کویت، بغداد

اعزازات: قومی نمائش پاکستان پہلا انعام ۱۹۶۰ء تمغۂ امتیاز ۱۹۶۰ء

۱۹۶۱ء تمغۂ حسنِ کارکردگی ۱۹۶۲ء

ثقافتی اعزاز آسٹریلیا ۱۹۷۵ء ستارۂ امتیاز ۱۹۸۰ء۔ انٹرنیشنل گولڈ مرکری ایوارڈ ۱۹۸۲ء

نمائش:۔

فرانس۔ پیرس

جولائی ۱۹۶۲ء اکتوبر ۱۹۶۲ء دسمبر ۱۹۶۳ء فروری ۱۹۶۴ء سے مئی ۱۹۶۴ء

لندن:

اکتوبر نومبر ۱۹۶۳ء دسمبر ۱۹۶۳ء اکتوبر ۱۹۶۶ء

یورپ:۔ (مشرقی) اکتوبر دسمبر ۱۹۷۵ء

بخارسٹ (رومانیہ) ماسکو، لینن گراڈ، باکو، تاشقند، سمرقند، بخارا (روس) انقرہ (ترکی) طہران (ایران)

بھارت: نومبر ۱۹۸۱ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء

دلی (۵ نمائشیں) علی گڑھ، حیدرآباد (دکن) لکھنؤ،

میورال:

جنگ دامن (۲ ۳/۴ × ۱۰) ۱۹۶۵ء اسٹیٹ بینک آف پاکستان کراچی (۶۲ ۱/۲ × ۱۲) ۱۹۶۱ء

منگلا ڈیم (۱۷۹ ۱/۲ × ۲۳) ۱۹۶۷ء

پنجاب پبلک لائبریری (۳۶ × ۱۴ ۱/۲) ۱۹۶۸ء

پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۸ء

مشرقی پاکستان کے طوفان سے متعلق (۷ ۱/۲ × ۱۰) ۱۹۶۹ء

لاہور عجائب گھر کی چھت (۹۲ × ۲۴) ۱۹۷۳ء

پاکستان اسپورٹس بورڈ (۳ × ۱۲) ۱۹۷۶ء

عجائب گھر لاہور۔

سورۃ لیٰسین	(۲۹۰ × ۴)	سنہ ۱۹۷۸ء
ارضی تحقیقات کا مرکز حیدرآباد (دکن)		سنہ ۱۹۸۲ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ		سنہ ۱۹۸۲ء
ہندو یونیورسٹی بنارس		سنہ ۱۹۸۲ء
غالب اکیڈمی دلی		سنہ ۱۹۸۲ء
اردو گھر حیدرآباد		سنہ ۱۹۸۲ء
ہمدرد مرکز دلی		سنہ ۱۹۸۲ء
اسٹیٹ بینک پشاور		سنہ ۱۹۸۴ء
فریئر ہال کراچی (۱۰ × ۴۰)		سنہ ۱۹۸۶ء

ان میورال میں سوائے چار کے یعنی اسٹیٹ بینک کراچی و پشاور منگلا ڈیم اور اسپورٹس بورڈ کے تمام میورال بطور تحفہ مختلف اداروں کو دے دیے۔

جن مقامات پر صادقین کے بنائے ہوئے شاہکار مستقلاً آویزاں ہیں۔

۱۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کراچی۔
۲۔ NIPA کراچی۔
۳۔ فریئر ہال صادقینؒ
۴۔ عجائب گھر لاہور
۵۔ نیشنل بینک آف پاکستان لاہور۔
۶۔ ADMINISTRATIVE STAFF COL EG! لاہور۔
۷۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور
۸۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور
۹۔ اسپورٹس کمپلیکس اسلام آباد
۱۰۔ گیلری صادقین اسلام آباد
۱۱۔ اسٹیٹ بینک پشاور
۱۲۔ منگلا ڈیم پاور ہاؤس

تصنیفات :

۱۔ رباعیات صادقین نقاش	۱۱۰۰ رباعیات
۲۔ رباعیات صادقین خطاط	۴۰۰ رباعیات
۳۔ بیاضِ صادقین	۱۵۰ رباعیات
۴۔ جزو بوسیدہ	اور رباعیات کا مجموعہ

۵ - رقعاتِ صادقین — خطوط

۶ - زیرِ ترتیب مجموعۂ رباعیات تقریباً ۱۵۰۰ رباعیاں

انتقال :- ۱۰ر فروری ۱۹۸۶ء بوقت ۳ بجے شب ـ او۔ ایم آئی اسپتال کراچی

آخری آرام گاہ :- سخی حسن ـ کراچی ـ

صادقین نمبر

صفحات : ۲۷۶ —— سرِورق : اقبال مہدی : قیمت ۱۵۰/- روپے

ہم اپنے اُن قارئین کی خدمت میں جو طلوعِ افکار کے سالانہ خریدار نہیں ہیں یا جنہیں طلوعِ افکار اعزازی طور پر ارسال کیا جاتا ہے ، 'صادقین نمبر' بوجوہ ارسال کرنے سے قاصر ہیں ـ ان تمام قدردانانِ ادب سے جو 'صادقین نمبر' حاصل کرنا چاہتے ہیں ہماری گزارش ہے کہ وہ :

- دو سو روپے زرِ سالانہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر کے 'طلوعِ افکار' کے سالانہ خریدار بن جائیں یوں 'صادقین نمبر' انہیں انتہائی رعایتی قیمت پر (یعنی صرف پچاس روپے میں) حاصل ہو سکتا ہے۔
- ایک سو پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کر کے یہ نمبر طلب فرمایا جا سکتا ہے۔
- وی پی طلب کرنے کی صورت میں محصولِ ڈاک خریدار کے ذمہ ہوگا۔
- اس کے علاوہ دفتر 'طلوعِ افکار' سے شام پانچ بجے تا ۹ بجے شب دو سو روپے (زرِ سالانہ کی صورت میں) یا ڈیڑھ سو روپے نقد ادا کر کے یہ نمبر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (منصرم ادارہ)

نقش و نقاش

صادقین کے والدین اور اُن کے اقربا کی بعض

یادگار تصاویر

اس کے علاوہ

صادقین کی خطاطی و مصوری کے چند نمونے

محبوبہ گل افشانی

سید سبطین احمد نقوی
(صادقین کے والد مرحوم)

سیدہ فاطمہ مرحومہ
(والدۂ صادقین)

سیّد کاظمین احمد نقوی مرحوم
(صادقین کے حقیقی بڑے بھائی)
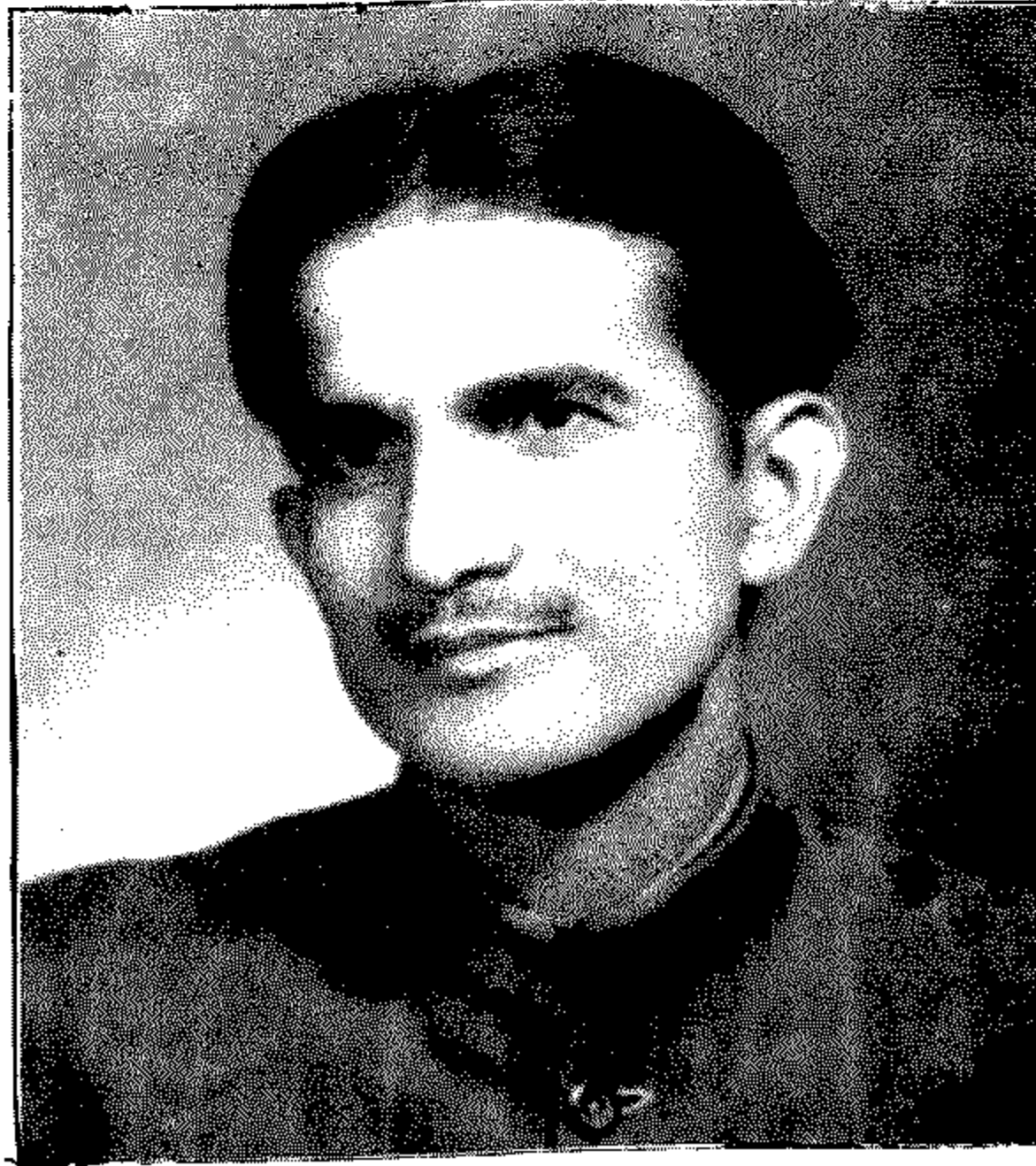
سیّد حسنین احمد نقوی مرحوم
(صادقین کے حقیقی چھوٹے بھائی)

(دائیں سے کھڑے ہوئے) سیما فاطمہ، رضا سلطان، سلطان احمد، سیدہ شیریں عباس اور عرفان احمد
(بیٹھے ہوئے) صفدر عباس، صادقین، سیدہ حسینہ خاتون (اہلیہ حسنین احمد مرحوم)۔
بچگان: حسنین مصطفیٰ، علی مصطفیٰ اور عنبرین فاطمہ (اطفال سیدہ شیریں عباس)، فاطمہ زہرا (دختر سلطان احمد)
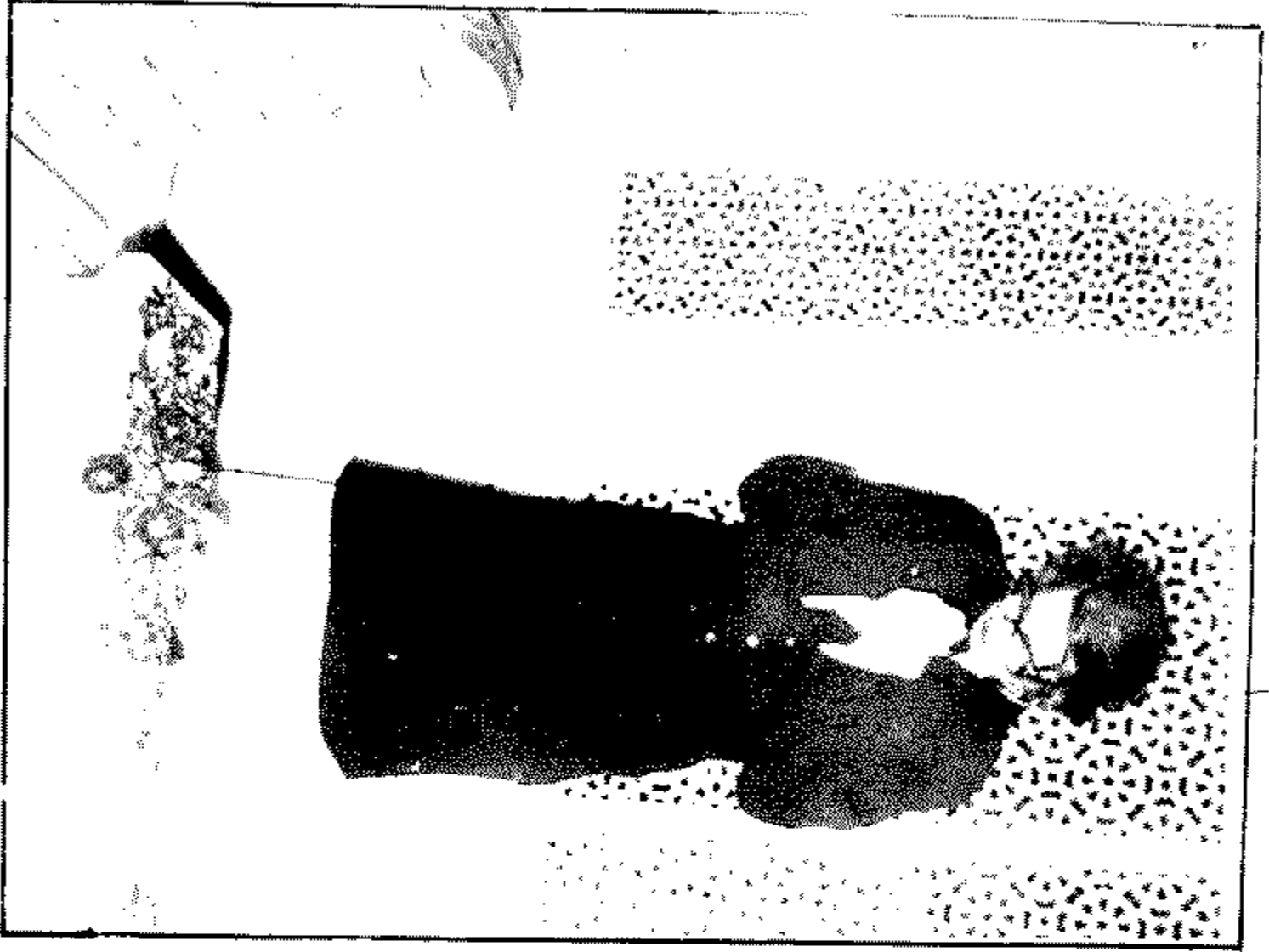
صادقین مزارِ غالب پہ

صادقین و شیریں عباس دخترِ حسنین احمد مرحوم

گیلری صادقین فریئر ہال

جناب وسیم سجاد (چیئرمین سینٹ)، جناب ڈاکٹر فاروق ستار (میئر کراچی) اور سلطان احمد (صادقین کے بھتیجے)

نسرین فاطمہ مرحومہ (صادقین کی بھتیجی) کی رسمِ عقد کے موقع پر

سلمان احمد، اہلیہ سلطان احمد اور صادقین
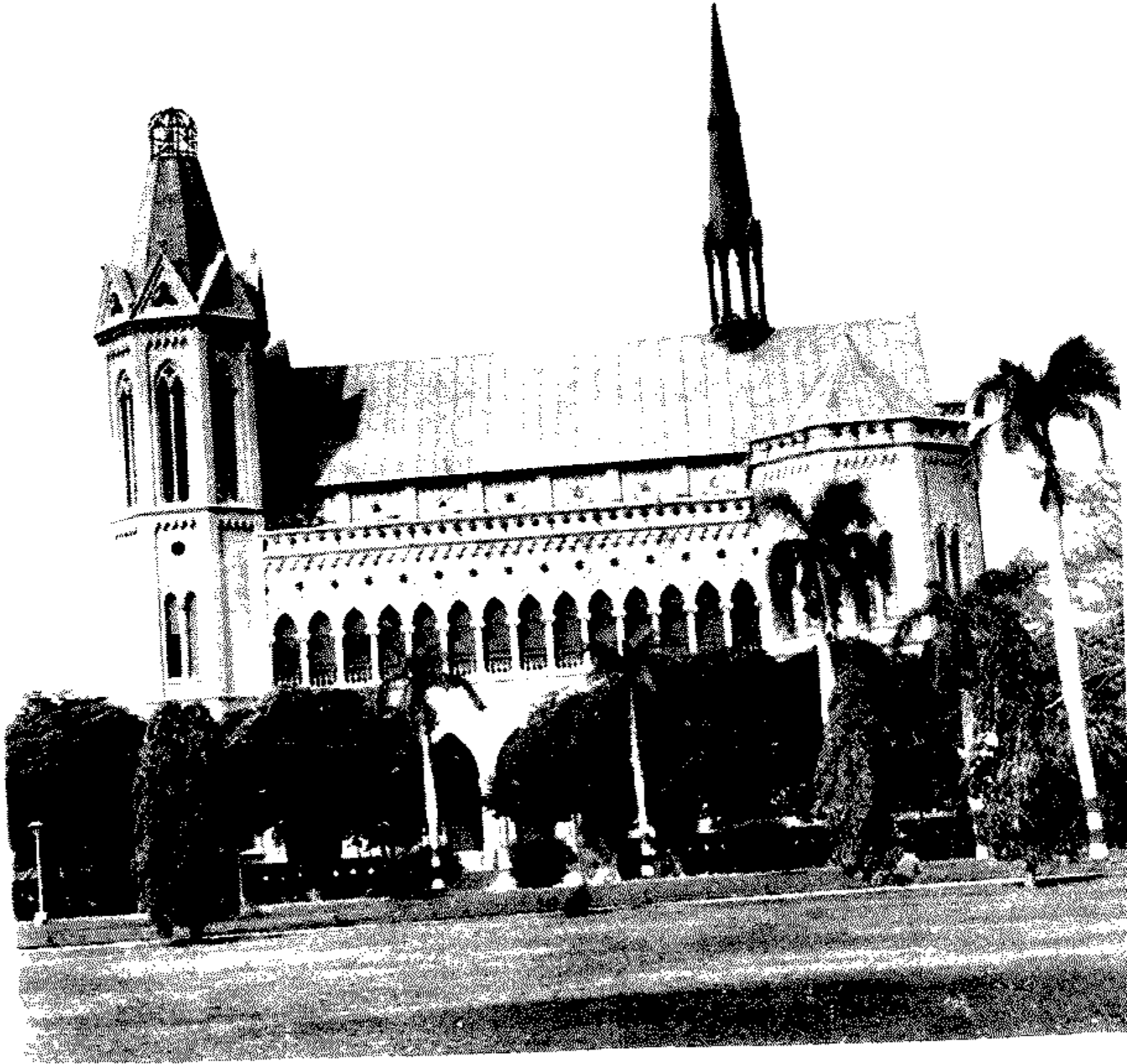
گیلری صادقین فریئر ہال کراچی
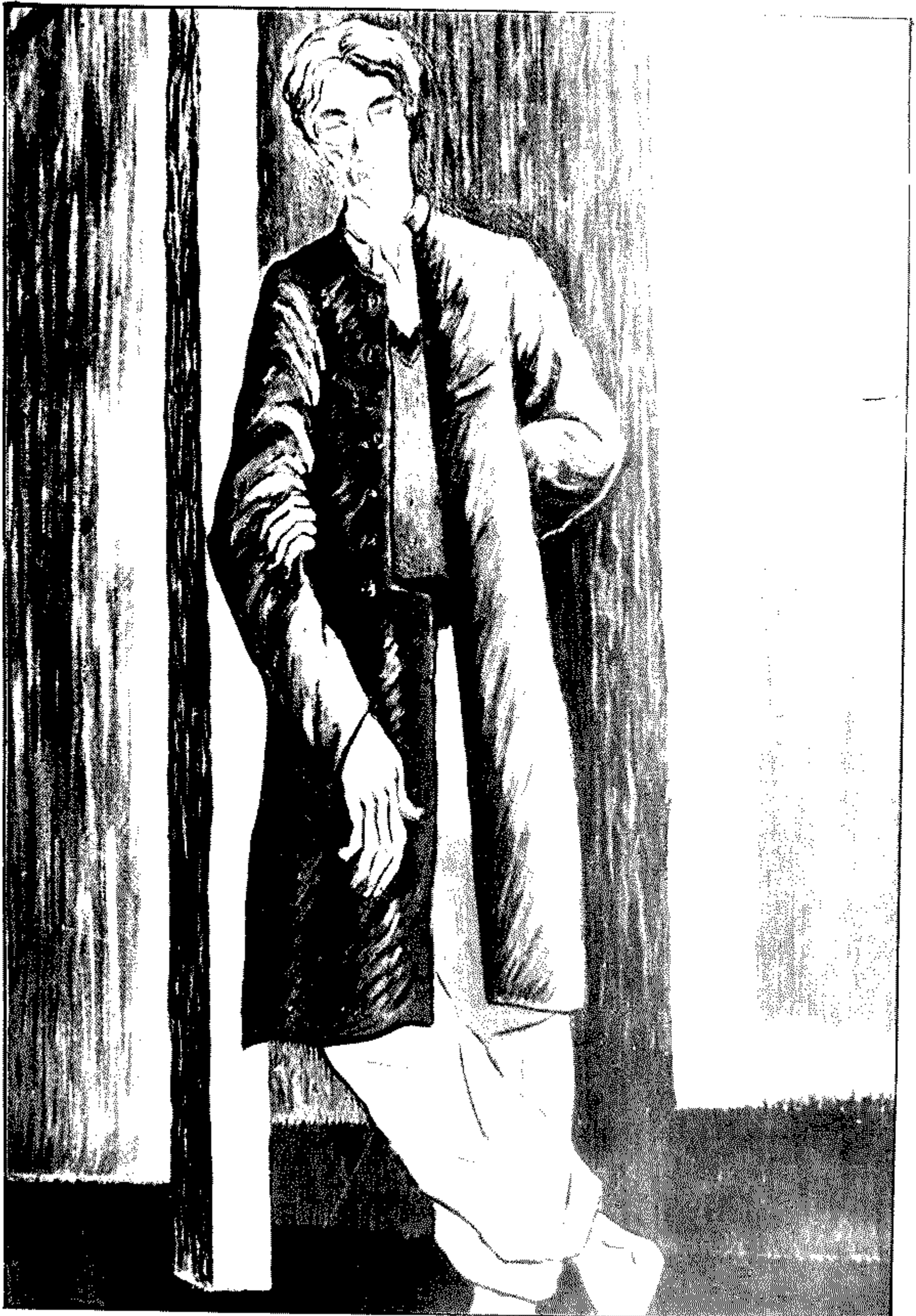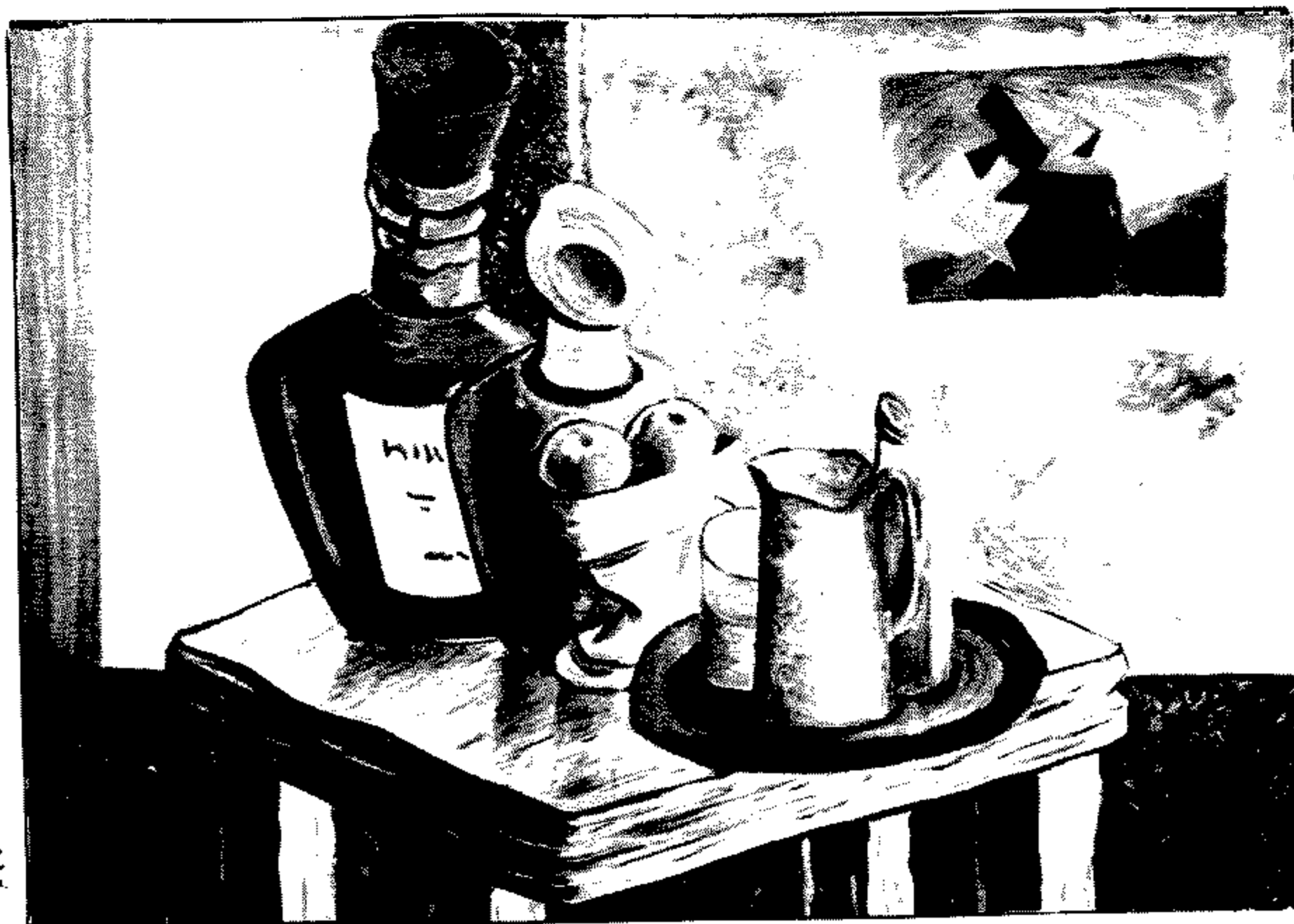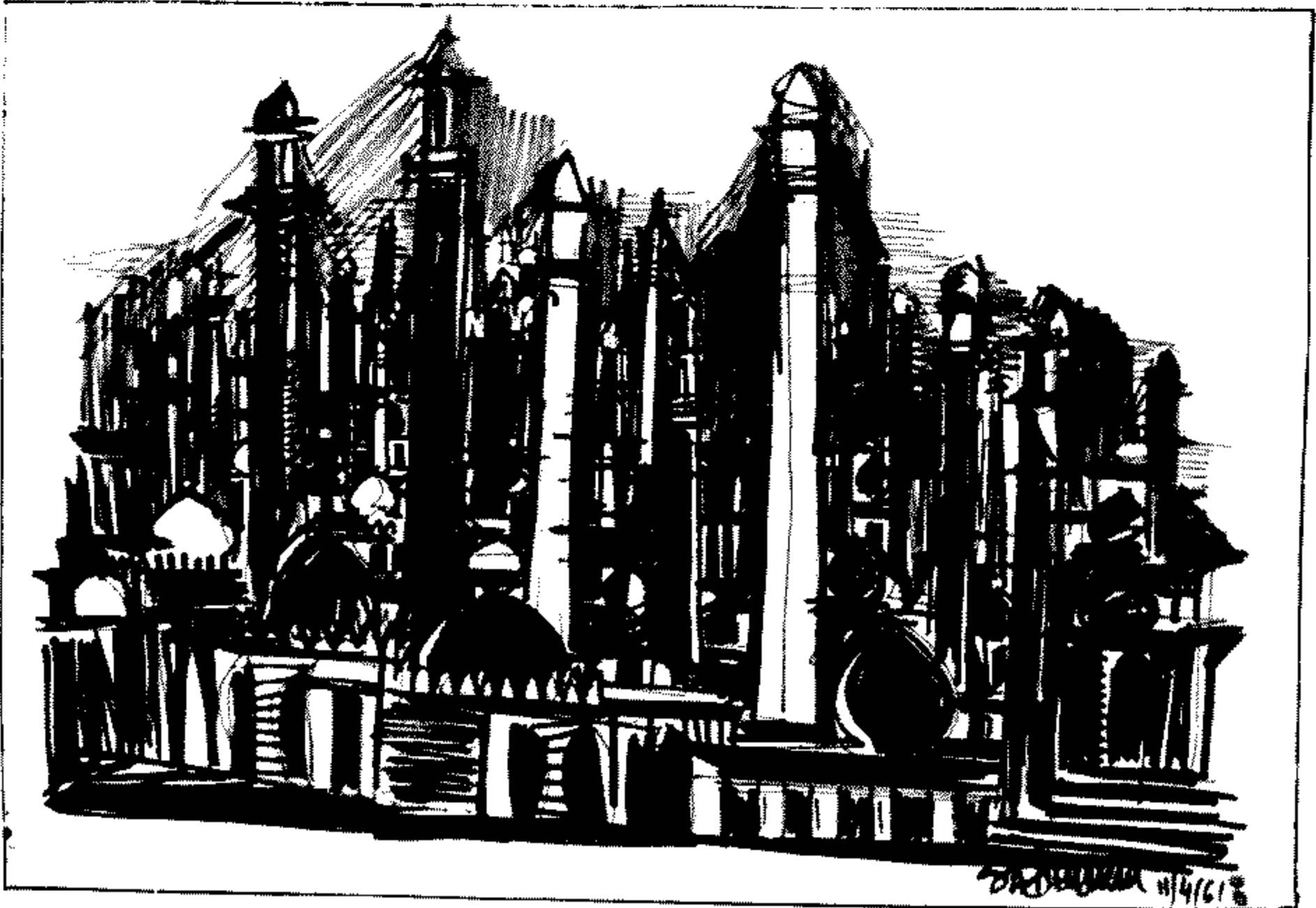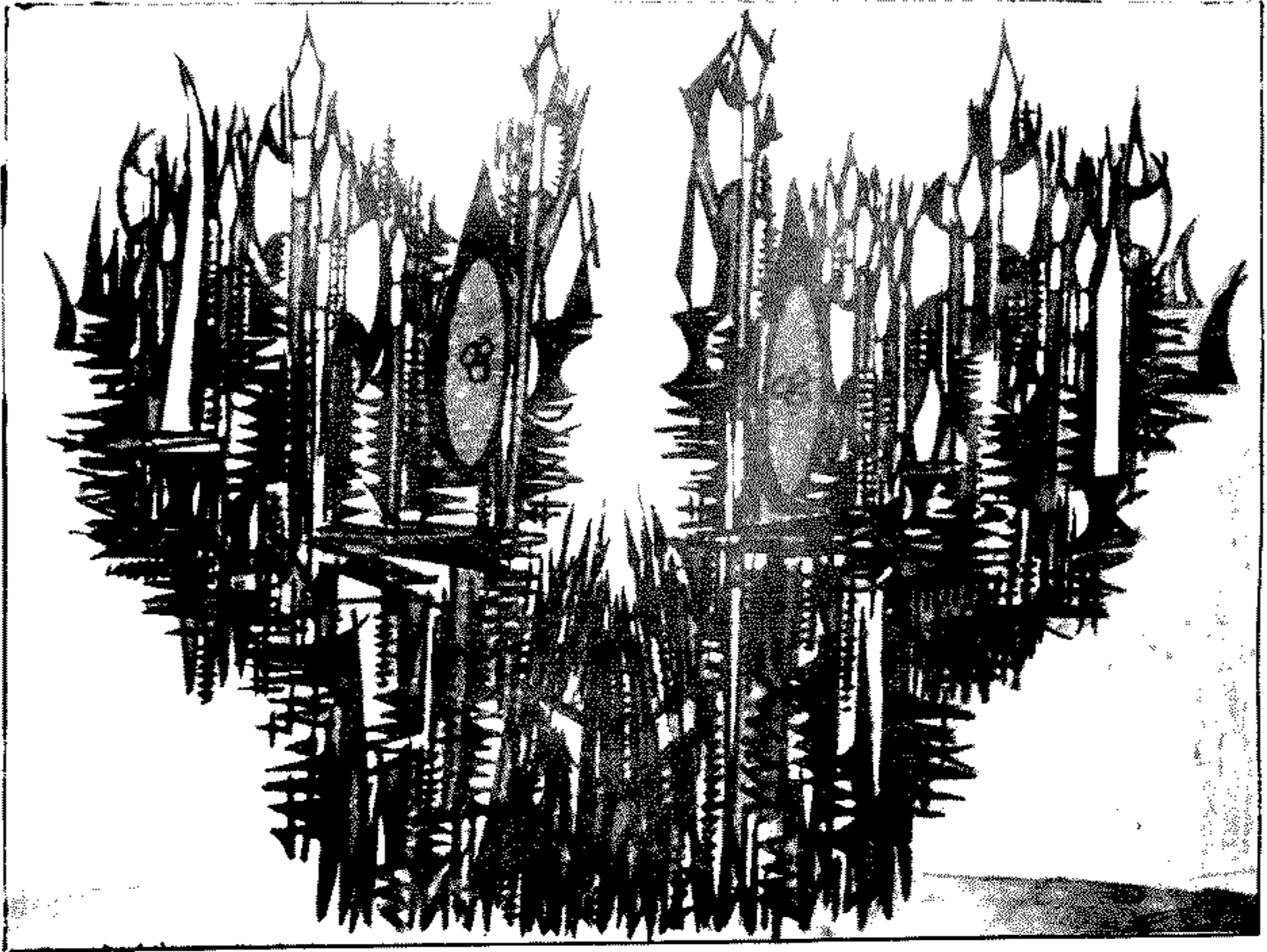
(تفصیلات ص ۲۶۳ پر ملاحظہ کیجئے)

↑ ۱۹۶۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہر کراچی کو ایک تحفۂ فن صادقین

بروز ہفتہ ۱۵ فروری ۱۹۸۶ء بوقت ۵ بجے شام

باغ جناح فریئر ہال عبداللہ ہارون روڈ

[illegible]

من جانب

میئر، ڈپٹی میئر و اراکین بلدیہ عظمیٰ

کراچی

آر ایس وی پی ۲۱۰۹۲۷

A Gift From SADEQUAIN to the City of KARACHI

THE MAYOR, DEPUTY MAYOR & THE MEMBERS OF KMC.

CORDIALLY INVITE YOU ON THIS SIMPLE OCCASION TO RECEIVE IT AS A CITIZEN of THE CITY

ON SATURDAY, 15th FEBRUARY 1986, 5-00 P.M.

AT BAGH-E-JINNAH LAWNS (FRERE HALL), ABDULLAH HAROON ROAD, KARACHI.

R.S.V.P. 210927

نقدِ فن

فیض احمد فیضؔ ، ایم۔ ایف حسین، علی سردار جعفری،

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، محمد علی صدیقی، امجد علی

ابرار کرتپوری اور فاروق جمال

فیض احمد فیض

صادقین ایک صنّاع ایک مفکّر

صادقین نے اپنی ایک تصویر کو نقشِ فریادی موسوم کیا ہے۔ اُن کی کلیاتِ فن کے بیشتر اوراق کے لئے، غالباً یہی عنوان سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ان نقش ہائے رنگ رنگ کا ہر پیکر فریادی ہے۔ صرف کاغذی پیرہن کا رنگ اور فریاد کی لَے مختلف ہے۔ یہ پیکر اگر ابنِ آدم ہے تو کبھی مجنوں کبھی مسیحا، جس کی رگوں کا کرب خار و خس میں پیوست ہے۔ اور قلب و نظر کا غُلو وکہکشاں میں گُم۔ یہ نقش کسی شہر یا معمورے کی نیم تاریک دیواروں اور نیم روشن دریچوں کا عکاس ہے تو اس کے منزل و در سنگ و خشت سے آزادی کے متمنی نظر آتے ہیں اور اس کے کنگرے فضا میں مائلِ پرواز۔ اگر یہ بنتِ حوّا کا کوئی بہروپ ہے تو آبِ رواں کی طرح موج در موج غلطاں و پیچاں۔ اگر شجر و حجر ہے تو موجودات کی اعلیٰ تر صورتوں کے شوقِ وصال میں کوشاں و سرگرداں صادقین لذتِ محض اور مُجرّد صناعت سے بھی خوب آشنا ہیں لیکن اُن کے صُوری تخیّل میں پیدائش، نمو اور ارتقا کے کرب و اضطراب کا اظہار اُن کے خطوط کو بیشتر پیچ و تاب میں رکھتا ہے۔ ایسے خطوط جو گویائی اور وضاحت کے لئے شوخیٔ رنگ سے قریب قریب بے نیاز ہیں۔ صادقین کے رنگ عام طور سے اسی درجہ خاموش ہیں جس درجہ اُن کے خطوط متکلّم۔ اُن کے عمل میں قدیم مشرقی طغرا نگاروں کی خطوط کشی، جدید مغربی مصوروں کے تجریدی تخیّل، قدیم اہلِ تصوف کے وحدتِ کائنات کے تصور، جدید اہلِ فکر کے فلسفۂ ارتقا کی رجائیت، سبھی کے عناصر موجود ہیں لیکن اِن عناصر کا ظہور زیرِ ترتیب اُن کے اپنے ذہن اور مُو قلم کی تخلیق ہے، کاوشِ حیات کی طرح ان تھک اور مسلسل۔

غالب کے گنجینۂ معنی کا طلسم تو کس کے ہاتھ لگا ہے لیکن گزشتہ ایک صدی میں کون صاحبِ نظر ہے جو اس کی تلاش میں سرگرداں نہ رہا ہو۔ میری ناقص رائے میں اِس طلسم کا بھید غالب کی ایک اصطلاح میں پوشیدہ ہے اور وہ اصطلاح ہے "تصور"۔ جو گرمیٔ نشاط بھی ہے رنگینیٔ خیال بھی۔ جو نا آفریدہ گلشن کی جھلک بھی ہے، فراقِ صحبتِ شب کی کسک بھی۔ تصورِ دی روز کی یاد بھی ہے، امروز کا کرب بھی ہے، فردا کی امید اور ہراس بھی۔ تصور جس سے خیال کی شریانیں جذبات کی رو سے سیراب ہوتی ہیں اور جذبات کے شعلوں کو خیال کا نور عطا ہوتا ہے۔ اِسی تصور کے طلسم سے غالب نے تاریخ کا ایک ایسا لمحہ اسیر کیا جب یار و اغیار دونوں ایک "بستانِ نو" کو آباد کرنے کی خاطر ایک بنیادِ کہنہ کی ویرانی کے در پے تھے۔ یہ عمل غالب کی ولادت سے قریب قریب ایک صدی پیشتر شروع ہوا اور اس کی وفات سے ایک صدی بعد تک جاری ہے۔ غالب کے تصور میں اس شکست و ریخت، حسرت و تعمیر کے وہ سب نقوش متشکل ہوئے جو اسے کبھی اپنے دشت نما گھر میں نظر آئے کبھی بہار صفت دشت میں۔ ان میں ایک صدی پہلے کا درد اضمحلال بھی تھا ایک صدی بعد کا تجسّس اور خروش بھی۔ ان میں عمرِ گریزپا کا تأسف بھی تھا حیاتِ انسانی کے دوام کا تیقّن بھی۔ حقیقتِ عالم کی تلاش بھی تھی، آرائشِ خم کا کُل کے اندیشہ ہائے دور دراز بھی۔ غالب کا تصور اِس لمحے کی اُس نہ تک پہنچا جہاں فرد اور دی کا تفرقہ یکبار مٹ جاتا ہے۔

جس طرح غالب نے تصور کے اِس آبگینے کو پگھلا کر الفاظ کے ساغر میں انڈیلا، تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر، اسی طرح صادقین

نے الفاظ کے آبگینے کو گداز کر کے رنگ وخط کے ساغر میں ڈھالا ہے۔ ہم اِن دونوں کے شکر گزار ہیں کہ دونوں کے

"معجزۂ فن میں ہے خونِ جگر کی نمود"

یوں تو صادقین کی ہر "نمائش" کسی نہ کسی اعتبار سے عجوبہ ہوتی ہے لیکن گزشتہ دو تین برس میں آپ نے جلال وجمال کا جو مُرقع خطاطی کی صورت میں تخلیق کیا ہے اُن عجائبات میں یقیناً ایک نادر اضافہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ مصوری کو جو صادقین کے خیال و مُوقلم کی صحیح جولانگاہ ہے یکا سو اور اُس کے ساتھی اب سے نصف صدی بیشتر روایت کے رسوم وقیود سے آزاد کر چکے تھے۔ لیکن خطاطی کو جو ذوق وعقیدت کی یکجائی کے سبب مسلم معاشروں کا سب سے معتبر اور مستند فن ہے، صدیوں کوئی ایسا صاحبِ دل ونظر میسّر نہ آسکا جو اُس کے مروجہ قواعد وضوابط کو پھلانگ کر اُس کی صوری اور جمالیاتی صلاحیتوں میں نئے امکانات کا کھوج لگا سکے۔ یہ منصب شاید صادقین کے ہاتھ اس لئے آیا کہ ان کی فنی تربیت کا محاورہ دوسرا تھا اور انہوں نے مصوری کے بنیادی اجزا کی ماہیت اور ترکیب وترتیب پہ قدرت حاصل کرنے کے بعد ادھر رجوع کیا۔ خطاطی کے قدیم اساتذہ نے خط وخم اور نقطہ ودائرہ کے ساتھ جو اٹھکھیلیاں کی ہیں اور صورت گری کا سہارا لئے بغیر الفاظ وحروف کے دست وپا سے جو حسین وجمیل نقوش ونگار متشکل کئے ہیں آج تک اہلِ نظر کے لئے تحیّر و انبساط کا سامان بہم کرتے ہیں لیکن اُن کی ہر اُپج بعد میں آنے والوں کے لئے رسمِ شرعی اور اُن کی ایجادات کو اُن کے متبعین نے قاعدہ قانون میں بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی دو صدی میں ہمارے ہاں چابک دست اور زریں قلم خطاط تو ضرور پیدا ہوتے رہے اور خوش قسمتی سے آج بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ اہلِ کمال ہمارے پرانے خزائن میں کوئی نیا گوہر ریزہ شامل نہ کر سکے۔ خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ شاید موجودہ حالات میں یہ فنِ جمیل بعض اور روایتی فنون کی طرح بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکے۔ صادقین نے قلم اُٹھایا، سب سے پہلے مروجہ خطاطی کے قواعد وضوابط بر الفقط لکھا پھر لفظ کے بجائے حروف کو تحریر کی اکائی قرار دیا۔ اس کے بعد حروف کو باہم دگر پیچاں کر کے اور الفاظ کو ایک دوسرے سے ہم آغوش بنا کر جلا اور کفایت کی جو نئی صورتیں ایجاد کی ہیں۔ نہ صرف اپنی جگہ حُسن ورعنائی میں دیدہ زیب بلکہ بہتر از ین۔ ان سے اس فنِ جمیل میں ایک نئے دبستاں کا در کھلتا ہے جسے اس فن کی حیاتِ نو کا ضامن سمجھنا چاہیئے۔ اسلئے کہ روایت صرف ایجادہی کے بل پر زندہ رہ سکتی ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

اور صادقین اپنے فن میں صرف صنّاع ہی نہیں مُفکّر بھی ہیں!

صفحہ ۴۹ کا باقی

ہم ہندوستانی نقاش پاکستانی مصوروں کو خوش آمدید کریں گے۔ اپنے قیام کے دوران ہندوستانی تجربات کو انہوں نے اپنی نقاشی کے فن میں ظاہر کیا ہے۔

میں آخر میں اردو کے عظیم زندہ جاوید شاعر فیض احمد فیضؔ کے ان الفاظ کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں، جو انہوں نے صادقین کی مصوری کے بارے میں تعارفی نوٹ تحریر کرتے ہوئے رقم کی تھیں۔

"۔۔۔ ایک نفرت زدہ اور خوفناک دنیا کی تصویر کشی ۔ ایک بجوکے کی دُنیا جو خون کے پیاسے کنوؤں کے مالک کی طرح اپنے کو پیش کرتی ہے، ایک بدصورت بوڑھی عورت جو اپنے کو ملکۂ حُسن کی طرح آراستہ کر کے پیش کرتی ہے قفل زدہ زبانوں، فریب آلودہ قلوب، کم قدر جسموں اور فرومایہ چاپلوسوں کی دنیا۔۔۔ حقیقت کی یہ تلخ منظر کشی ممکن ہے مکمل طور پر سچ نہ ہو۔۔۔ صادقین اُس اُمید سے بے خبر نہیں ہے جسے وہ بڑے کینوسوں پر نقش کرتا ہے۔۔۔ بڑا من قوتوں اور اُن کے مخالف گروہوں کے درمیان کش مکش کی تصویر کشی۔

ایم۔ ایف۔ حسین

مصورِ ہندوستان بنام مصورِ پاکستان

میں شاذ و نادر یہ لفظ استعمال کرتا ہوں اور وہ بھی یہ الفاظ جب اپنے عہد کے کسی مصور کے لئے ہوں تو یہ بے حساس قلم نے زبردست رکاوٹ کے بعد تلوار سے سفید کاغذ پر چلنا شروع کیا۔ ایک قطعی مداخلت۔ خواہش اس جیسی کی طرح ہے جس کے نزدیک قلم تہذیب بُرش ایک آلہ ہے۔ صادقین نے قرونِ وسطیٰ کی عربی خطاطی سے تاثر قبول کیا ہے۔ موجودہ دور میں وہ قرآن آیات کی خطاطی سے گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس خطاطی کے کچھ حصے کی نمائش پاکستانی پویلین پرگتی میدان، نئی دہلی میں کی گئی ہے۔ یہ کسی بھی عظیم پاکستانی مصور کے فن پاروں کی ہندوستان میں پہلی اہم اور عظیم نمائش ہے۔ میں صادقین کی تخلیقات سے پچھلی دو دہائیوں سے واقف ہوں۔ میں نے پیرس کے پاکستان ایئر آفس میں یا بین الاقوامی نمائشوں میں اکثر جھلکیاں دیکھی ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۳۰ نومبر ۱۹۸۱ء کو دہلی کے ایک ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوئی۔ دیوار کی کھونٹی سے کالی شیروانی (امروہہ کٹ) ٹنگی تھی۔ آدھے کھلے ہوئے سوٹ کیس، فرش پر بکھرے ہوئے بے ترتیب اخبارات۔ اچانک صادقین اخبارات پر جھک کر انہیں اُلٹنے پلٹنے لگے۔ خیال یہ ہوا کہ اب وہ کوئی اندوہناک خبر سنانے والے ہیں مگر ہوا یہ کہ انہوں نے ایک موٹی نوک والا قلم نکالا اور اخبار کے کاغذ پر عربی رسم الخط کے دو حرف "ت" "ن" کھینچ دیئے۔ دو نیم دائرے۔ ایک کے بعد ایک اور ہر ایک میں ایک نقطہ۔ صادقین یہاں پر رُک کے طنزیہ انداز میں ہنسے اور بولے "جب کبھی بھی میرے ملک کے نام نہاد ملّا یہ دیکھتے ہیں، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نسوانی چھاتیوں کی عریاں نمائش غیر اخلاقی ہے۔" بعد میں ان دو حروف کو ملا کر لفظ "عین الیقین" تو ان ملّاؤں کو بے انتہا مایوسی ہوئی۔ (اس نقاشی کا اصل مسودہ دستخط شدہ میرے پاس محفوظ ہے)

مجھے دوبارہ پھر صادقین کے ہوٹل والے کمرے میں پلٹنے دیجئے جہاں پر بہت سے پیاسے جام ایک ساقی کی تلاش میں تقریباً کھنکتے ہوئے یہ شعر گنگناتے ہیں۔

پلا دے اوک سے ساقی اگر پیالہ نہیں دیتا۔۔۔۔۔۔۔ نہ دے۔۔۔۔۔۔۔

صادقین اپنی کیمیائی انگلیوں سے اپنی یادداشت کے ٹرنک سے صوفی سرمد کی تصاویر کا خزانہ کھود کر نکالتے ہیں۔ نقاشی کا ایک سلسلہ سرکٹ، اپنی ہتھیلیوں سے اپنے ہی سر کو تھامے ہوئے موجودات کی قوتوں سے نبرد آزما۔ صادقین ہندوستان آنے کے بعد سیدھے سرمد اور غالبؔ کے مقبرے پر گئے۔ اپنے ہاتھوں میں جام لے کر اپنے گردوں کے کتبوں کو بوسہ دینے کے لئے۔ غالبؔ اور سرمد کی پُرسکون خاموشی کو سننے کے لئے۔ صادقین کہتے ہیں "لاہور سے امرتسر کا فاصلہ ۴۵ منٹ کا ہے۔ بن تکلیف وہ فاصلے کو طے کرنے میں مجھے ۳۴ برس لگے۔"

اب یہاں وہ ہزاروں اصنام سے گھرے ہوئے ہیں۔ جن کے لئے اقبالؔ نے کہا تھا ؎
"ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں" یہی ہے جو صادقین کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کئی ماہ ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد انہوں نے "جمالِ اجنتا" اور "جمالِ ہمالیہ" کی نقاشی کا منصوبہ بنایا۔ (انسانی ساخت کا حُسن اور ہماری پیدائش کی عظمت۔۔۔ یقیناً درمیان میں وقت کے زخم کے نشانات ہیں)

علی سردار جعفری

سفیرِ محبت

آج انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان 'ہماری زبان' کے تازہ شمارہ میں صادقین کے انتقال کی خبر پڑھی تو ایک بجلی سی گری۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تعزیت کا خط کس کو لکھوں۔ برادرِ بزرگ رئیس امروہوی کو یا برادرِ عزیز خورشید مصطفیٰ کو۔ صادقین کے گھر کا پتہ میرے پاس نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ میرا تعزیت نامہ سادات امروہہ کی پوری برادری کے پاس جانا چاہئے جو میری طرح سوگوار ہے اور ان کے ذریعہ اور توسط سے یہ تعزیت صادقین مرحوم کے پس ماندگان کے پاس بھی پہنچ جائے گی۔

میرے پاس کہنے کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ صادقین مرحوم کے انتقال کی خبر ہندوستان کے اخباروں میں ایک مہینہ بعد شائع ہوئی ہے۔ یہ ہمارے اور پاکستان دونوں کے لئے شرمناک ہے۔ کیا ہم صادقین مرحوم کے نام پر اپنے تعلقات کو بہتر نہیں کر سکتے۔ صادقین کے ہزاروں چاہنے والے ہندوستان میں ہیں اور لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں نے فلم کے ذریعہ اور وساطت سے صادقین کے فن کی تھوڑی سی جھلک دیکھی ہے۔ یہ خیال میرے لئے بے حد تکلیف دہ ہے۔ اور آپ بھی میرے اس جذبہ میں شریک ہیں کہ وہ صاحبِ اعجاز کے ہاتھ ہمیشہ کے لئے جنبش سے محروم ہو گیا جس نے لکیروں کو لافانی بنا دیا ہے اور ان لافانی لکیروں میں وہ خود زندہ ہے۔

میں آخری بار صادقین سے فروری ۱۹۸۵ء میں ملا تھا۔ اس کے بعد پاکستان آنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب اپریل کے آخر میں آنے کا ارادہ ہے۔ میں اس خیال سے خوش تھا کہ اپنے محبوب مصوّر دوست سے پھر ملاقات ہوگی لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ موت بڑی سنگین حقیقت ہے لیکن زمانہ کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں خون ہو جاتا ہے۔ وہ اشعار جو اقبال نے سر راس مسعود کے انتقال پر کہے تھے مجھے یاد آ رہے ہیں اور چند شعر اپنے عزیز دوست اور عظیم مصوّر صادقین مرحوم کی یاد میں لکھ رہا ہوں ؎

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے | کسے خبر کہ یہ نیرنگ سیمیا کیا ہے
ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور | مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا کیا ہے
غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال | خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے
دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز | نہیں تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے
جہاں کی روح رواں لا الٰہ الا ھو | مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے
قصاصِ خونِ تمنّا کا مانگئے کس سے | گناہ گار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے

یہ اشعار میری جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں۔ صادقین مرحوم کے لئے اقبالؒ کا ایک شعر ہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگِ تست مرگِ دوام | خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد[1]

صادقین کی موت مرگِ دوام نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

---

[1] یہ شعر مجھے اسی طرح یاد ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کسی اور انداز سے لکھا ہے۔ (علی سردار جعفری)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

صادقین

شاعر، خطاط، مصوّر

مجھ سے مجتبیٰ حسین صاحب نے کہا کہ صادقین حیدرآباد جا رہے ہیں اور وہاں ادارہ سیاست کی طرف سے ان کے فن کی نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے اس موقع کے لئے تم سیاست کے لئے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ دو۔ میں نے کہا آپ کی فرمائش ہو، صادقین موضوع سخن ہوں، اور اخبار سیاست کے صفحات پر چھپنا ہو تو میری کیا مجال ہے کہ انکار کرسکوں، یہ سب نام مجھے بہت عزیز ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اگر صادقین چھوٹے سے آرٹسٹ ہوتے تو میں بھی چھوٹا مضمون لکھ دیتا۔ ان کے لئے تو مضمون بھی ان کے فن کی طرح منفرد اور قد آور لکھا جائے تو یہ بات بن سکتی ہے بقول غالب

غالب غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

میں نے مجتبیٰ سے وعدہ تو کرلیا اس لئے کہ اسکے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن جب لکھنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ کئی وجوہ سے اس کے لئے غیر موزوں بلکہ DISQUALIFIED ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں مصور کی تنقید اور پرکھ کے معیاروں سے بالکل نابلد ہوں۔ اور اس موضوع پر اصطلاحی گفتگو نہیں کرسکتا۔ دوسری خامی یہ ہے کہ میں صادقین کا مداح اور ان کے فن سے متاثر ہوں وہ مداحی اور پسندیدگی ایک عام آدمی کی ہے مگر اس سے تنقیدی بصیرت تو ضرور متاثر ہوتی ہوگی۔ تیسری کمی یہ ہے کہ صادقین کا وطن سابق بھی امروہہ (ضلع مراد آباد) ہے اس لئے ان کی تعریف میں مبالغہ کروں گا تو خود مجھے یہ شبہ ہوگا کہ حق ہم وطنی ادا کر رہا ہوں لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس رشتہ کی وجہ سے میں بعض وہ باتیں لکھ سکتا ہوں جو دوسرے شاید نہ لکھ سکیں گے۔

امروہہ شمالی ہندوستان میں مغربی اترپردیش میں ایک قدیم بستی ہے۔ رئیس امروہوی، سید محمد تقی (سابق ایڈیٹر جنگ) جون ایلیا (ایڈیٹر عالمی ڈائجسٹ) کمال امروہوی (فلمساز) اور صادقین یہ سب حضرت شاہ شرف الدین سہروردی شاہ ولایت امروہہ کی اولاد ہی میں سے ہیں۔ ان نقوی سادات کی ایک بستی امروہہ کے عین قلب میں بھی ہے جو بنگلا کہلاتی ہے۔ صادقین کی ولادت اسی محلہ میں جون ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ ان کا خاندان ایک زمیندار خاندان تھا جس میں شعر و ادب کی روایت بھی چلی آ رہی ہے صادقین نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں شعر و شاعری، خطاطی اور ادب دوستی یقیناً تھی مگر اب کوئی محرک نہ تھا جو انہیں مصور بننے کے لئے ابھارتا لیکن انہیں پوری طرح شعور سنبھالنے سے بھی پہلے خطاطی مصوری اور شاعری تینوں کا چسکا لگا ہوا تھا گویا یہ صلاحیتیں وہ خلقی طور پر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان تینوں میدانوں میں انہوں نے جو بھی کچھ حاصل کیا وہ صرف اپنی مسلسل محنت اور لگن سے پایا ہے۔ ان کا کوئی استاد نہیں ہے۔ غالب کی طرح وہ بھی کہہ سکتے ہیں مجھے مبدأ فیاض سے تلمذ ہے۔ غالب ہی کی طرح وہ بھی ۱۵ سال کی عمر میں صاحب دیوان ہو چکے تھے ابتدا میں غزلیں، نظمیں، قطعات رباعیات سب کچھ لکھا۔ لیکن اکثر کلام ضائع ہو گیا جو کچھ زمانہ کی دستبرد سے بچ گیا وہ اب انہوں نے جزو بوسیدہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں بعض نظموں کا لب و لہجہ اور خیالات کی پرواز دیکھ کر

حیرت ہوتی ہے کہ یہ ایک پندرہ، سولہ سال کے لڑکے نے کیسے کہا ہوگا۔ صادقین کے مزاج میں انفرادیت پسندی بہت ہے اس لئے انہوں نے نظم و غزل کو روشِ عام سمجھ کر چھوڑ دیا اور اب صرف رباعی کہتے ہیں اس لئے کہ یہ مشکل صنفِ سخن ہے اور اس میں ہر شخص طبع آزمائی نہیں کرسکتا۔ اُن کی رباعیات کا ایک ضخیم مجموعہ خود ان کا لکھا ہوا بھی شائع ہوچکا ہے۔ ان رباعیوں میں گہرے افکار و مسائل بھی ہیں اور طنز و مزاح یا چونچال بھی ہے۔ لیکن ہر حال میں پختگی اور انفرادیت کا رنگ چوکھا نظر آتا ہے وہ پہلے صدق تخلص کرتے تھے اب صرف صادقین ہیں۔ نام سے احمد نقوی بھی ساقط کردیا ہے۔ امروہہ میں ایک قدیم اسکول جو امام المدارس پہلے ہائی اسکول تھا۔ اب انٹر کالج ہے۔ یہاں صادقین ڈرائنگ ٹیچر تھے اور جس زمانہ میں وہ کالج میں تھے اس کے ڈرائنگ روم کا در و دور کسی اسکول میں جواب نہیں تھا۔ در و دیوار سے رنگ پھوٹے پڑتے تھے۔ غالباً اکتوبر ۱۹۴۸ء میں صادقین نے امروہہ کو خیرباد کہا اور پاکستان کو پیارے ہوگئے۔ بہت دنوں تک اسکول کا ڈرائنگ روم ان کی یاد دلاتا رہا۔ آخر وہاں رفتہ رفتہ دھول اُڑنے لگی اس لئے کہ مکان کا شرف تو مکین سے ہی ہوتا ہے۔ صادقین پاکستان تو چلے گئے لیکن وہاں اُنہیں ابتدائی زمانہ خاصی آزمائشوں میں گزارنا پڑا وہ ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے اور پھر اِدھر اُدھر تلاشِ معاش میں سرگرداں بھی۔ کراچی میں ایک ایسے علاقہ میں ان کی بود و باش رہی جہاں چاروں طرف ناگ پھنی کے پودے نظر آتے۔

یہ ٹیڑھے میڑھے خاردار بدشکل بدوضع پودے ایک تو اپنی بدقوارگی میں بھی ایک حسن رکھتے ہیں دوسرے نہایت سخت موسم میں پھلتے ہیں اور ریگستانی علاقہ ان کے لئے بہت موزوں ہوتا ہے۔ حوادثِ زمانہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور دوسری نباتات کے مقابلے میں زیادہ سخت جان ہوتے ہیں۔ ناگ پھنی کا صادقین نے اپنے ماحول میں ایسا مسلسل مشاہدہ کیا کہ وہ ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا۔ وہ بھی نامساعد اور سخت حالات میں پنپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ صادقین کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں تو مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ میرا وجود بھی ناگ پھنی میں تبدیل ہوگیا ہے۔ چنانچہ ان کی تصویروں میں جو انفرادیت، سخت کوشی ناسازگار حالات سے مقابلہ کرنے کی قوت انفرادیت اور صلاحیت نظر آتی ہے اس پر ان کے ماحول کا اثر صاف دیکھا جاسکتا ہے شاعری اور مصوری کی طرح خطاطی میں بھی ان کی مشق جاری رہی۔ مسلمانوں نے خطاطی کے فن میں ڈیڑھ ہزار سال تک ریاض کیا ہے۔ خطِ کوفی، نسخ اور نستعلیق سے لے کر خطاطی کی دوسری درجنوں اصناف پیدا ہوئیں خطِ شفیعا، گلزار، ریحان، غبار وغیرہ وغیرہ ابنِ مقلہ، یاقوت عبدالرشید دیلمی، میر علی اور پنجہ کش جیسے استادوں کے بعد اس میدان میں کوئی ایسی راہ نکال لینا جس کی طرف بے اختیار نگاہیں اٹھ جائیں کچھ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن صادقین کی شخصیت ان کے مزاج کی انفرادیت پسندی ان کا ذوقِ شعرگوئی اور ان کی مصوری کی مہارت ان سب نے مل کر ان کی مدد کی۔ اور انہوں نے ہماری رسم الخط کو ایک ایسا منفرد موڑ دے دیا جہاں حروف کی شکلیں کبھی سالم ہیں کبھی آدھی مگر نسخ اور نستعلیق دونوں سے الگ ہیں۔ ہمارے فنِ خطاطی کی طویل اور شاندار تاریخ میں کوئی مصور خطاط نہیں۔ یہ امتیاز صادقین ہی کو ملا ہے۔ انہوں نے سورۃ الرحمٰن کی چالیس آیات کو چالیس مختلف انداز میں لکھا ہے، ہر آیت میں خطاطی اور مصوری کے امتزاج کا ایک نادر نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے اور رنگوں کا استعمال بھی ایسا ہے کہ جیسے رنگ و نور کی برسات ہورہی ہے۔ ان مصوری کے شاندار نمونوں میں غالب کے اشعار کی تصویرکشی بھی ہے۔ ایسی ۲۷ تصاویر نقوش لاہور کے بیاض غالب نمبر میں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے غالب کے اشعار کی وسعتوں کو جس طرح دیکھا اور دکھایا ہے وہ اسی وقت ممکن ہوسکتا تھا جب شاعر کے جذبہ و احساس کی بازیافت کرلی گئی ہو۔ صادقین اپنی تصویروں میں نہ فارم FORM کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں نہ فکر کی سطحیت کو رنگوں کی شدت سے چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ اکثر بہت ہلکے اور بجھتے ہوئے رنگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن جو چیز ابھر کر آتی ہے وہ تصویر کا موضوع ہوتا ہے۔ اور آج آرٹ کی تنقید میں اسی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس میں فارم سے زیادہ موضوع پر توجہ کی گئی ہے۔

صادقین اب پاکستان ہی کے مصور اور خطاط نہیں ہیں۔ اُن کے فن کی نمائش دنیا کے تقریباً تمام بڑے اور قابل ذکر ملکوں میں ہو چکی ہے۔ پیرس کی اوّل درجے کی آرٹ گیلریوں میں ان کی تصاویر رکھی گئیں۔

آرٹ کے موضوع پر شائع ہونے والے رسالوں میں ان کے فن کی ستائش کی گئی۔ مشرق وسطیٰ میں ان کے قرآن شریف کی خطاطی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا۔ غرض آج کی دنیا میں جو شخص آرٹ، مصوری کا معمولی سا ذوق بھی رکھتا ہو اس کے لئے صادقین کا نام یا ان کا کام نیا نہیں ہے۔ لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان میں ہجرت سے ۲۲ برس بعد تک یہاں ان کی شہرت تو پہنچ چکی تھی اب ان کے فن کو سب نے آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ دلی میں وہ کئی نمائشیں کر چکے ہیں سب سے پہلے تو یہاں بین الاقوامی نمائش میں پاکستان کے اسٹال پر ان کی تصویریں اور خطاطی کے بے مثال نمونے دیکھنے کے لئے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پھر ایک درجن میں ان کی تصاویر کی نمائش ہوئی غالب اکیڈیمی دہلی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اور دوسرے اداروں میں اُن کے لکچر یا اُن کے فن کی نمائش کا سلسلہ برابر جاری ہے پندرہ دن وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں رہے تو وہاں ایک جشن سا ہوتا رہا۔ اب وہ حیدرآباد آ رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد کے خوش ذوق باشندے جن کو صدیوں کی تہذیبی تاریخ ورثہ میں ملی ہوئی ہے، صادقین کے فن کی سب سے زیادہ قدر شناسی کا ثبوت دیں گے۔ ایک بات اور کہہ دوں، صادقین مصور خطاط اور شاعر تو جیسے ہیں وہ سب دیکھیں گے سنیں گے لیکن جو حضرات ان سے ذرا قریب آئیں گے وہی اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ صادقین بہت ہی پیاری من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کی طرح معصوم کسی طرح کی خود پسندی، تکبر یا انانیت کا نام تک نہیں۔ وہ اپنا نام بھی "فقیر صادقین عفی عنہ" لکھتے ہیں۔ واقعی فقیرانہ مزاج رکھتے ہیں اور اگر ان کا تعارف نہ کرایا جائے تو مجمع عوام میں کوئی انہیں نہیں پہچان سکتا کہ یہ عالمی شہرت رکھنے والا آرٹسٹ صادقین ہے۔ بکھرے ہوئے روکھے بالوں پر سیاہ ٹوپی منڈھی ہوئی معمولی پلاسٹک فریم کا چشمہ، سیاہ شیروانی، پاجامہ، چپل، دھان پان جسم لکھتے لکھتے اور رنگ بھرتے بھرتے ان کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں مستقل طور پر ٹیڑھی ہو گئی ہیں لیکن فطرت نے اس بلا کی صلاحیت بھر دی ہے کہ جب کبھی کوئی تصویر بنانے بیٹھ جاتے ہیں تو دس، پندرہ دنوں تک مسلسل اسی میں لگے رہیں گے۔ ان کے کھانے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص جیتا کیسے ہے!

صادقین جیسا فنکار کسی ملک یا خطے کا نہیں ہوتا وہ عالمی انسانی برادری کا ایک فرد بن جاتا ہے اور اس کا فن عالمگیر ورثہ ہوتا ہے۔ صادقین کو بھی اگر ہم پاکستانی آرٹسٹ کہیں تو اس سے پاکستان کی شان یقیناً بڑھتی ہے مگر ہماری اپنی کور ذوقی بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر صادقین کی نمائش دیکھنے کے بعد وہاں کے اہل ذوق اور اہل نظر سیاست کے صفحات پر اپنے تاثرات بھی پیش کرتے رہیں۔

> آپ خواہ کہیں ہوں انفرادی یا اجتماعی کسی سطح پر بھی اگر اُردو زبان و ادب کے حوالہ سے کوئی مفید بات آپ کے علم و اطلاع میں ہے تو ہمیں ضرور باخبر کیجئے۔ ہم ایسی تمام اطلاعات آپ کے نام اور شکریہ کے ساتھ شائع کریں گے۔ اُردو انٹرنیشنل زبان و ادب کے حوالے سے بین الملی سطح پر تبادلہ اطلاعات و روابط کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کو موثر تر بنانے کے لئے ہم آپ کے تعاون کے تمنائی و طلبگار ہیں۔ (مدیر مسئول)

محمد علی صدیقی

صادقین

یگانۂ روزگار مصوّر

صادقین کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ ساری زندگی ایک نیا جہان آب و گل تخلیق کرنے کی سعی میں مصروف ہی صرف اس لئے تھے کہ ان کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکے۔ بعض فنکار صرف اپنے بارے میں گفتگو کرواتے ہیں۔ وہ فنکار ہی رہ جاتے ہیں۔ بذاتِ خود صادقین نہیں ہو پاتے۔ صادقین کا کمال یہ تھا کہ وہ اس دنیا میں ۵۷ سال رہے۔ اور انہوں نے نئی FORM اور نئی جمالیاتی STRUCTURES کی تلاش میں خود کو اس درجہ گم کر دیا کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ غالباً ایک پوری نسل کی کم کوشی اور کم سوادی کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔

صادقین امروہہ کی مردم خیز سرزمین پر پیدا ہوئے ان کے خاندان میں خطاطی، شاعری اور آخری صدی کے نصف اول تک سپاہ گری خاندانی تربیت کا معمول تھی۔ اپنے شہر کے بہت ہی سربرآوردہ خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے دل میں فطرت کو چار چاند لگانے کا خواب دیکھ سکتے تھے۔ میری معلومات کی حد تک ان کے یہاں فنِ مصوری سے رغبت مصور ایرانی کتب پر بادہ و ساقی کے جہانِ کیف و مستی کے استغراق سے پیدا ہوئی۔ اس زمانہ کی مسجدوں کے صحنوں میں بھی آج کے دور کے برخلاف حافظ و خیام کے اشعار گنگنائے جا سکتے تھے۔ یہ دور تماما آزاد منش لوگوں کا دور تھا۔ صادقین کی بستی میں بھی پرانا نظام دم توڑ رہا تھا۔ اور نیا جہان، کم از کم ان کے خاندان کی حد تک پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے ان کے پاس مغربی مصوری کی کتابیں اپنے طالب علمی کے دور میں بھی دیکھیں اور وہ جس طرح مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ مغربی مصوری کے دلدادہ نظر آتے تھے اس سے کوئی اور خوش ہوا نہ ہو کم از کم غالب کی روح ضرور خوش ہوئی ہوگی۔ مغرب صادقین کے لئے انسانی تہذیب کا نقطۂ عروج تھا۔ قطع نظر اس کے کہ مغرب کی مادی ترقی اس کے سیاسی عروج کا سبب بنی اور اس کا ایک اظہار انسانیت کش نو آبادیاتی نظام کی شکل میں ہوا جس کا مقصد یہی تھا کہ غلام سماج اپنی شناخت کھو بیٹھیں لیکن مغرب نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں نئے علوم اور فنون کے لئے ایک ایسی تڑپ بھی پیدا کی جس کی بدولت مغ... کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر بلادِ مشرق میں اندھیروں کی حکمرانی کا خاتمہ بھی تھا۔ صادقین نے مغربی آرٹ کی زبان سے خوابیدہ مشرق کی غیرت کو للکارا اور وہ ایک طرح سے ایک ایسے انقلابی آدرش کے وکیل بن گئے جو ملکی سیاست میں آزادی کی جنگ کی صورت میں کارفرما تھا، اور فنون کی سطح پر ایک انقلاب انگیز فکر کا مل کی صورت میں آشکار ہوا جس نے انہیں یہ ترغیب دی کہ وہ صدیوں کی منجمد روایت میں روشنی اور حرکت کی شمعیں جلائیں۔

میں صادقین کو بحیثیت انسان اور فن کار بچپن سے جانتا ہوں۔ میری پرائمری تعلیم ان کے آبائی امام بارہ کے اسکول میں مکمل ہوئی تھی۔ میں نے اپنی آٹھویں جماعت میں ایک روز بھائی صادقین کو بحیثیت ڈرائنگ کے استاد داخل ہوتے دیکھا۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے اور اب اس تاثر کی عمر ۴۰ سال ہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ صادقین بھی ہجرت کے بعد کراچی میں آباد ہوئے اور اس طرح ان سے انقلابی اور شعوری ملاقات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا۔ خاص طور سے ۱۹۶۰ء

کے بعد سے کہیں ان کے ہزاروں، لاکھوں عقیدت مندوں کی طرح ان کے بارے میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرنے پر مجبور پاتا ہوں لیکن اس حق کو میں استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ صادقین میرے لئے دیگر تمام حیثیتوں سے الگ ایک مصور تھے۔ ایک ایسے مصور جس نے مصوری کو ایک ایسے دور میں زندہ رکھا جب ہمارے یہاں اس فن کے خلاف "غیر اسلامی" ہونے کے فتاویٰ صادر کئے جا رہے تھے۔ صادقین مصوری کی دیوی کے واحد پجاری نہیں تھے۔ اس دیوی کے سیکڑوں پجاری ہیں اور میں ان سب کا احترام کرتا ہوں کہ مجھے ایسے کسی گلدستے سے اغماض ہوگا جس میں ایک ہی رنگ اور خوشبو کے پھول ہوں۔ گلدستہ مشتمل ہوتا ہے یا اسے مشتمل ہونا چاہیئے۔ بہت سے پھولوں پر۔ صادقین بھی ایک پھول تھے۔ لیکن ایک ایسے پھول جس کی خوشبو کی مہک پورے ملک بلکہ پوری دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی۔

صادقین نے اتنا بڑا کام اس قدر کم مدت میں انجام دیا کہ بعض حلقے ان کے تخلیقات و نزار وجود کے ہاتھوں عظیم کاوش دیکھ کر یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ یہ ہمہ وقت مختلف FORM میں کام کرنے والا شخص ایک بنیادی سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہا جو اس ملک میں بہت فنکاروں اور ادیبوں ہی کا فرض منصبی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجیئے کہ دنیا کے بڑے ذہنوں نے اس ملک کو شاعری کے حوالے سے فیض اور مصوری کے حوالے سے عبدالرحمٰن چغتائی اور صادقین کے ذریعہ جانا ہے اور صادقین کے ساتھ خوش قسمتی یہ رہی کہ انہوں نے دنیا بھر کی معروف گیلریوں میں اپنے کام کی نمائش کی اور اپنے ملک کو صحیح معنوں میں بین الاقوامی مصوری کے نقشہ پر کچھ اس طرح منقش کیا ہے کہ آج دنیا کی تمام بڑی گیلریوں میں جن میں ماسکو کی بین الاقوامی گیلری بھی شامل ہے صادقین اپنے ملک اور اپنی قوم کی شناخت بنے ہوئے ہیں۔ ماسکو کی گیلری میں ان کی ایک شاندار تصویر آویزاں ہے۔ فاشزم کے خلاف انسانیت کی فتح پر ایک سرمدی انبساط کے اظہار کے طور پر۔ تباہ شدہ دنیا کے کھنڈرات پر ایک کم عمر بچہ پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھا ہوا یہ بتا رہا ہے کہ انسان کا مستقبل تابناک ہے۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ انہوں نے اس کم عمر نوجوان کو اپنے بھتیجے سلطان احمد کی شکل میں دیکھا تھا۔ سلطان احمد یہاں موجود ہیں۔ یہ نوجوان محض ایک استعارہ ہے۔ انسانی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ ہے۔ ایک روسی نقاد نے صادقین کی تصویر کو دیکھ کر نیم وجد کی کیفیت میں کہا تھا کہ صادقین کے مضبوط اسٹروکس اور بے پایاں طاقت کے حامل رنگ جس نظریہ کی بالا کے لئے کوشاں ہیں وہ پاکستان کی طرف سے دکھوں اور غموں میں جکڑی ہوئی دنیا کے لئے ایک تحفہ ہے جسے روسی عوام ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ادھر پیرس کے مشہور آرٹ نقاد پیر PERRELAMBOU نے کہا تھا کہ صادقین مشرق اور مغرب کا اس قدر خوبصورت امتزاج۔ کہ اس کی تصویروں کے پاس بیٹھ کر اور اس کی تصویروں کی زبان سمجھ کر برِ صغیر کے سابق انگریز آقا بھی دنگ رہ گئے تھے۔ مغربی مصوری نے مشرقی مصوری کو جو قرض دیا تھا وہ صادقین نے مشرق کی طرف لوٹا دیا ہے۔ ایک ایسے تخلیقی رجحان کے طور پر جو مغرب کے لہجے میں مشرق نغمگی (LYRICISM) کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے۔

صادقین کہا کرتے تھے۔ "دیکھو بھئی انسان پر اپنی پیدائش کا احسان قرض ہے۔ میں صرف ایک مواخذہ پر یقین رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ ہر انسان اپنی زندگی کی شام سے صبح تا شام کی کاوش پر نظر دوڑائے اور یہ غور کرے کہ آیا اس نے اوپر واجب الادا قرض ادا کر دیا ہے یا نہیں۔ میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ میں اصل کے ساتھ سود در سود ادا کرنا چاہتا ہوں" غالباً صادقین فیض کے اس مصرعے کا مفہوم سمجھنا بھی چاہتے تھے اور اپنے ہونے کا قرض اپنے تخلیقی کارناموں کی صورت میں ادا کرنا چاہتے تھے۔

ع وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب ہم نے چکا دیا۔

صادقین نے مصوری اور مصوری کی اہمیت کو جس طرح پھیلایا ہے وہ ہماری مصوری کی تاریخ کا ایک درخشندہ

باب ہے۔ وہ مصوّری کو کھیتوں، کھلیانوں، ترقیاتی سرگرمیوں کے مراکز، اخباروں، کیلنڈروں اور ڈائریوں میں جس واضح مقصدیت کے تحت لائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصوّری خواص سے نکل کر عوام کے ایک بڑے حلقہ تک آ گئی۔

صادقین ہماری مصوّری کی تاریخ میں وہ واحد مصوّر ہے جن کے حوالے سے مصوّری کے مباحث ادبی مباحث کی سطح پر آ گئے۔ صادقین ہمارے درمیان اس قدر سرگرمی کے ساتھ زندہ رہے کہ ہم بسا اوقات ان کے برش کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکے۔ صادقین کا خیال تھا کہ کلچر کے بنیادی تصوّرات، جو عوام کی غالب اکثریت کے لاشعوری اور تحت الشعوری رویّوں میں جاگزیں ہوتے ہیں، انہیں عوامی شعور کی سطح پر لانا ضروری ہوتا ہے۔ ایرانی مصوّری، فارسی غزل، ایرانی موسیقی، فنِ تعمیر اور عہدِ متوسط کے ایرانی فلسفۂ زیست کے مابین ایک غیر مرئی رشتہ موجود تھا لیکن صرف وہی ایرانی اس رشتہ کی معنویت سے واقف ہو سکتے تھے جو ایرانی شاعری اور فنون کے تاریخی ارتقاء پر نظر رکھتے تھے اور تاریخی اثرات کی اصل حقیقت سے واقف تھے۔ برِّصغیر پر عرب، ایرانی اور وسط ایشیائی اثرات اس طرح جاگزیں ہوئے ہیں کہ جب پرتھوی راج کے عہد میں "پربھارا سا" تحریر ہوا تو اس میں بعض فارسی الفاظ موجود تھے لیکن وہ اس دور کی پراکرت میں اس درجہ بس گئے تھے کہ ان الفاظ کے استعمال کرنے والے ان الفاظ کو قطعی طور پر اپنا چکے تھے۔ راجپوت مصوّری، ایرانی مصوّری کے ان اثرات کا نام ہے جنہیں ہندوستان کی جینئس نے قبول کیا تھا۔ برِّصغیر کی مصوّری پر مغربی اثرات شروع شروع میں غیر ملکی اثرات کے ذیل میں آتے تھے لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ برِّصغیری ملغوبہ میں اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ آج کے برِّصغیر کی جدید مصوّری ایک مشترک عالمی ورثہ بن چکی ہے۔ صادقین، ایرانی برِّصغیری اور مغربی مصوّری کا اس قدر خوبصورت آمیزہ BLEND بن کر سامنے آئے کہ آپ خواہ ان کے ابتدائی دور کی تصاویر سامنے رکھیں جو مغربی اثرات کا ارتعاش تھیں یا بعد کی تصاویر، صادقین ایک بین الاقوامی روایت کے نقیب کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ صادقین (CACTUS) اور (CHOW) سرمد (PENODS) کی مصوّری کے دور میں صدر درجہ (ORIGINAL) مصوّر تھے، پھر ایک ایسا دور آیا جب انہوں نے ایک نقّاد کے بقول، سرمد کے ساتھ مسیحا کی IMAGES کی طرف مائل ہوئے۔ صادقین کی زندگی میں ایک اور انقلاب آیا کہ انہوں نے سرمد اور مسیحا کو یکجا کر دیا۔ ہم اس دور میں ان کے کینوسوں میں جگہ جگہ صادقین ہی کی صورتیں دیکھتے ہیں۔ وہ صعوبتیں جھیلنے والا فن کار بیک وقت مسیحا نفس بھی ہے۔ اس دور کا مفکّر صادقین اپنی سوچ کی پوری قیمت ادا کرتا نظر آتا ہے۔ صادقین کی زندگی کا یہ وہ دور ہے جب بہت سے مصوّروں نے نقطۂ نظر یا (CONTENTS) کے بارے میں ایک منفی رویّہ اختیار کیا اور وہ صادقین کے ردِّ عمل میں اس نتیجے پر پہنچے کہ تصویریں محض COMPOSITION ہوتی ہیں۔ ادب کی طرح یہ رویّہ بھی خالصتاً (FORMALISTIC) ہے اور اس موڑ پر ادب اور مصوّری کی تنقید کا منبع ایک ہو جاتا ہے۔

صادقین جس نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ وہ اس "نقطۂ نظر" کی اہمیت کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ معاشرہ پر تنقید کے حق کو فرضِ منصبی خیال کرتے ہیں۔ صادقین نے اپنی (CACTUS SERIES) میں ویرانوں میں جس نوع کی گلکاری اور چمن افروزی کی تھی وہ بھی سندِ لاتعلّق اور مغائرت پر تازیانہ کا حکم رکھتی تھی۔ صادقین نے معاشرے کے رگ و ریشہ میں پھیلتے اور بڑھتے سرطان (CANCER) کی MALIGANT GROWTH کا جس پامردی کے ساتھ جائزہ لیا اور پھر اپنی (CROW SERIES) کی تصاویر پر انسانی جسم کے ساتھ ساتھ انسانی روح کو مسموم کرنے والے رجحانات کی جس بے باکی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے وہ ایک طرح سے مواد اور نقطۂ نظر کی بالادستی کی حمایت ہے۔ سرمد SERIES کی تصاویر میں سرمد کی علامت جو خود ان کی شبیہہ سے مماثل ہے، خود صادقین اور سماج کے درمیان ایک اصولی رشتہ کا

درجہ رکھتی ہے۔ صادقین نے جس طرح اپنے ملک اور اپنے ملک کے عوام سے محبت کی ہے اور اپنی محبت کے میثاق کو جگہ جگہ متشکل کیا ہے۔ وہ نہ صرف مصوری بلکہ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے محکم افراد کے لئے باعثِ طمانیت ہے۔

صادقین اتنے بڑے مصور تھے کہ ان کے کام کا جائزہ کسی ایک شہر میں بیٹھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔ لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ اور ڈھاکہ محض اس سفر کے سنگِ میل ہیں۔ اس کے بعد وہ کون سے اہم یورپی اور امریکی پایۂ تخت (CAPITALS) ہیں جہاں صادقین کا کام موجود نہ ہو۔ پھر ہندوستان چلئے اور وہاں دیکھتے ہیں کہ اس فنکار نے ہندوستان کی جامعات اور تہذیبی مراکز کو کروڑوں روپیہ کی مالیت کا کام تحفتاً دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جس طرح امریکی (STATUE OF LIBERTY) کے خالق فرانسیسی مجسمہ ساز کے لئے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ اعزاز صرف صادقین ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے یک طرفہ طور پر پاکستان کی جانب سے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ شاید ہی کسی پاکستانی مصور کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ مصوری کے تحائف کی یک طرفہ ٹریفک کا بھی ایک مقام ہے۔

میں نے بھائی صادقین سے ایک دفعہ یہ سوال کیا کہ آپ نے آخرانی زندگی کی ایک سال کی کاوش، سینکڑوں فٹ طویل میورل (MURAL) درجنوں تصاویر اور ہزاروں اسکیچوں کی شکل میں کس لئے تحفتاً دے دیں۔ میں ذاتی طور پر ان کے اس ایثار کا قائل تھا۔ لیکن ان کی زبان ہی سے جواب چاہتا تھا کہنے لگے۔

"میاں یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ فیض کہہ گئے ہیں ؎ وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب ہم نے چکا دیا۔"

واللہ اعلم انہیں قرضہ چکانے کی اس قدر جلدی کیوں تھی اور پھر انہوں نے قرضہ چکانے کا جو اسٹائل وضع کیا تھا اسے قرض خواہ پر اصل کے ساتھ ساتھ کشورِ فن کے سیم و جواہر کی بارش کیوں نہ سمجھا جائے۔

صادقین زندہ رہے تو مصوری کے امین رہے اور اس جہاں سے گزرے تو مصوری کے افق پر روشن ستارہ بن چکے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل سنگ تراش ہنری مور نے غالباً صادقین ہی کے لئے کہا تھا کہ جب کوئی آرٹسٹ اپنی موت کے بعد اپنی ذات سے زیادہ اپنے فن پر گفتگو کو ممکن بنا دیتا ہے تو وہ فن کی دیوی MUSE کے ساتھ یک جان ہو جاتا ہے۔ صادقین اس وقت بذاتِ خود فن ہیں۔ ان کی بغاوتیں بھی فن ہیں اور ان کے یہاں روایت کی پاسداری بھی فن ہے۔ مجھے علم نہیں ہے کہ پاکستان کب تک اور صادقین کا انتظار کرے گا۔ یہ بات اس لئے اور بھی تکلیف دہ ہے کہ پاکستان کو گزشتہ ماہ تک اس تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ موت سے کس کو رستگاری ہے تب بھی یہ ایک عجیب و غریب اتفاق ہے کہ فروری غالب اور فیض کی ولادت کا مہینہ ہے اور جوش اور صادقین کی وفات کا۔

صادقین نے صرف مصوری ہی نہیں کی وہ بہت اچھے خطاط اور رباعی گو بھی تھے۔ وہ فنِ عروض پر مکمل گرفت رکھتے تھے۔ انہوں نے بعض اس قدر اچھی رباعیاں کہی ہیں کہ یوں گمان پڑتا ہے کہ جیسے وہ عمر خیام اور جوش کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں۔ صادقین کی رباعیات ایک علیحدہ مضمون چاہتی ہیں۔ ان رُباعیات کے عنوان میں اس قدر تنوع ہے، بے ساختگی اور بسا اوقات ایک انتہائی شریر وجود چھپا بیٹھا ہے کہ وہ اردو کی حد تک، پہلے رُباعی گو ہیں جس نے مصوری کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ یہ وہ امتیاز ہے جو شاید ہی کسی اور مصور کے ہاں موجود ہو۔ صادقین واقعتاً ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور شاید وہ اس حقیقت سے آشنا بھی تھے۔

اور اس طرح جب برف اور بادِ شمال کے تھپیڑوں کی ستائی ہوئی (LANDSCAPE) یا منظر کشی مسیحا نفسی آتشِ مراد کے انتظار میں ہوگی۔ صادقین کا کوئی نہ کوئی شاہکار، کہیں نہ کہیں، امیدِ بہار کے ساتھ موجود ہوگا۔

سید امجد علی / ریاض صدیقی

صادقین کا ابتدائی دور

صادقین جیسے فنکار کی تخلیقی زندگی میں ایک نیا موڑ جولائی ۱۹۶۸ء سے شروع ہوا اور مصوری کی اس عہد ساز نمائش پر مئی ۱۹۶۹ء میں تمام ہوا جس میں انہوں نے غالب کے اشعار کی وضاحت رنگوں اور خطوط کے امتزاج سے پیش کی تھی۔ یہ وقفہ ایک مالی سال کے برابر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح موسمی تبدیلیاں دوران بہار پودوں کے اندر غذائی محلول کو اوپر لے جاتے ہیں اور دوران خزاں برگ و بار گرنے لگتے ہیں اسی طرح ملیاتی مسائل بھی تخلیقی اور فنکارانہ تحریک سے کسی نہ کسی طرح کوئی پراسرار تعلق ضرور رکھتے ہیں مگر صادقین پر یہ صورتحال یوں اثر انداز نہیں ہوتی کہ اس نے تو پہلے ہی مرحلے میں غالب پر اپنی بنائی ہوئی پچاس تصویریں ادارہ یادگار غالب کو بطور عطیہ دے دیں۔ ان تصویروں کو اسکی اولین نمائش میں سراہا گیا تھا اس سے پہلے بھی بچی اداروں کو انہوں نے اسی قسم کے عطیات دیئے تھے۔ کہنا یہ ہے کہ سال ۱۹۶۸ء صادقین کی زندگی کا انتہائی تخلیقی دور ثابت ہوا۔ اس سے پہلے بھی ان کا شمار پاکستان کے اہم اور معتبر مصوروں میں ہوتا تھا۔

صادقین نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے عوام سے قریب تر رہے چنانچہ اس نے ایسے ہر موقع سے استفادہ کیا جہاں عوام کے درمیان تخلیقات کی نمائش کا امکان رہا ہو۔ اس نے اپنے کاموں کی نمائش گاہوں۔ لائبریریوں۔ ہوائی اڈوں۔ اور منگلا بند سے دیوہیکل انجنیئرنگ کے علاقوں میں پیش کیا جہاں عوام کی آمدورفت زیادہ رہتی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے لئے اس نے ایک دیوہیکل تصویر بغیر کسی معاوضے کے بنائی کیونکہ وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا اس کی خواہش تھی یہ کام جواں سالوں کی توجہ کا مرکز بنے۔ چنانچہ اس نے یونیورسٹی کی اس مجبوری کو کہ وہ مالی وسائل کی کمی کے سبب اسے معاوضہ نہیں دے سکتی ہے یکسر نظرانداز کر دیا۔ یہی خواہش تھی جس کی تکمیل کے لئے اس نے اپنی ایک پرائیویٹ گیلری اسٹریچن روڈ پر کراچی میں قائم کی وہ ایک ایسی فضا اور جگہ چاہتا تھا۔ جہاں جس وقت اور جب چاہے اپنی تخلیقات کو لوگوں کے لئے پیش کر سکے۔ رہائشی جگہ حاصل کرنے کے بعد وہ شب و روز پوری سپردگی کے ساتھ تخلیقی مشغلہ میں منہمک رہا یہاں تک کہ مصوری کے جو نمونے اس نے جولائی تک مکمل کر لئے تھے ان کو اگست میں نمائش کے لئے پیش کر دیا اسکے بعد سیڑھیوں سے اوپر کے اسٹوڈیو میں وہ تصویروں کے ذخائر جمع کرتا رہا ان دنوں اس کی مصوری کی شرح فی دن ایک تصویر ہوا کرتی تھی۔ ان ذخائر کو وہ ہر ماہ عوام کے سامنے لاتا تھا جہاں فن کے متوالے جوق در جوق ان تصویروں کو دیکھنے آتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ رفتار بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکے گی مگر اس نے مسلسل پانچ مہینوں تک اسی انہماک کا ثبوت دیا جس کے بعد وہ کچھ عرصے کے لئے منظر عام سے چھپ سا گیا اس کا سبب ایسی بہت سی تصاویر مکمل کرنا تھیں جنہیں وہ کراچی میں منعقدہ ہفتہ غالب کی نمائش میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ آخری نمائش کا زمانہ ماہ رمضان کی آمد آمد کا زمانہ تھا چنانچہ یہ خیال کیا گیا کہ رمضان اس کی تخلیقی زندگی میں عارضی تعطل پیدا کرے گا مگر اسی دوران صادقین کو خیال آیا کہ بلاشبہ آرٹ زندگی کا مقصد ہوتا ہے اس کے ذہن میں خواہش بیدار ہوئی کہ وہ آرٹ اور زندگی کے اس رشتے کا ثبوت پیش کرے اور بتائے کہ آرٹ کا ایک پہلو اگر زندگی سے منسلک ہوتا تو دوسرا پہلو تقدس کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ وہ تاریخی موڑ آیا جسکی معنوی و تاریخی اہمیت ہی اسکی پہچان بنی یعنی وہ بڑی مرد عنی تصویریں جس میں اس نے ایسی قرآنی آیات کی جو عربی خطاطی میں لکھی گئی تھیں حسن و تاثر کو سمو دیا۔ ان تصویروں میں الفاظ اور خطوط کو اس طرح برتا گیا کہ اشیا کی شکلیں بنیں۔ ان کو مختلف صورتوں کے تلنے بلنے میں سمونا بھی آرٹ کا ایک پہلو تھا۔

خطاطی کو آرٹ کا روپ دینے کے بعد صادقین کے یہاں ایک وقفہ آیا یہ وقفہ ناظرین کے لئے تھا نہ کہ خود اسکے لئے اس وقفے میں اس نے بڑے

کینوس پر غالب کے اشعار کو ایک نئے اسلوب میں ڈھالا صادقین کی فنکارانہ زندگی کے ایک سال کا یہ پس منظر تھا۔ اس دور کی اوّلین نمائشوں کے
سلسلوں میں اس نے جو تصویری خاکے بنائے ان کی جسامت ۴ × ۲۸ فٹ تھی جو کہ ان دیو ہیکر تصویروں کی چھوٹی (MINIATURES) پیش کش
تھیں جو اس نے منگلا ڈیم پر قیام کے دوران ۲۲ × ۷۰ فٹ پر بنائی تھیں۔ اس طرح وہ ایسی تصویریں بنا سکا جنہیں عوام زیادہ سہولت کے ساتھ
دیکھ سکیں۔

دوسرے انتیس کینواس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول وہ سلسلے جس میں انسان کی شہادت کے المیے کو ابھارا گیا ہے۔ ان تصویروں
میں انسان کے اس مقدس جذبے کی ترجمانی ہوئی ہے جو وہ کسی انتہا کو پا لینے کے لئے ظاہر کرتا ہے یا کسی مقدس مقصد کے لئے جاں سپردگی کی شدید خواہش۔ ادھر
کئی سالوں سے وہ اس خیال کو رنگ و روپ دے رہا ہے جس سے ان فاصلوں کے احساسات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو فنکار کے اندر پیدا ہو گئے ہوں جہاں تک
میری یادداشت کام دیتی ہے اس نے ایسی کرب انگیز مصوری اس دور ہی میں شروع کر دی تھی جب وہ ۱۹۶۰ء میں پیرس جانے کو تھا۔ شاید چھ ماہ تک
پیرس میں بھی وہ اسی کام میں منہمک رہا۔ اس نے حضرت عیسیٰ کی شہادت کے ساتھ مسلم تاریخ کے اکثر شہداء کو رنگ و خطوط میں گرفت کیا جن میں منصور
اور سرمد جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں جو عشق الٰہی میں ادراک و عرفان کی اس منزل تک پہنچیں جہاں انا الحق (میں حق ہوں میں خدا ہوں) کی صدا شروع
ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب منصور کو تشنہ العفید اورنگ زیب کے حکم سے جامع مسجد دہلی میں سر قلم کرنے کے لئے لایا گیا تو اس نے اپنے سر کو ہاتھوں میں
لے کر مسجد کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے اور نعرہ لگانا چاہا مگر اس عہد کے دوسرے معروف صوفی بزرگوں نے اس سے استدعا کی کہ وہ ایسا نہ کرے اور اپنی
پراسرار روحانی قوت کا اظہار نہ کرے ورنہ دنیا اسکی ہیبت و طاقت سے الٹ جائے گی۔ اس سلسلے کی ایک تصویر میں صادقین اسکے قلم ہوئے سر کو اسکے اپنے
ہاتھ کی ہتھیلی پر ظاہر کرتا ہے اس تصویر میں خود فنکار نے اپنے برش کو خون میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے اور خون ٹپکتا ہوا دکھائی دیتا ہے ایک تصویر میں
اردو و فارسی اشعار کے ان معنوں کو سمویا گیا ہے جن میں شاعروں نے اپنے قلم کو اپنے خون میں ڈبو کر لکھنے کا تصور پیش کیا ہے۔

مصوری کا ایک اور سلسلہ جس میں صادقین نے مہارت حاصل کی کاب ویب (COBWEB) ہے۔ کاب ویب دراصل ایک علامت
ہے ان مردہ کہنہ رسموں کی جو روایات۔ اداروں اور رسوم و رواج میں در آتی ہیں تین یا چار سال پہلے کی بات ہے جب ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی ایک
نمائش میں صرف روشنائی اور قلم کی مدد سے اس نے سوسائٹی میں قوت کے دائروں کو ظاہر کیا تھا ان تصویروں میں مصور نے ان رجحانات پر طنز و تنقید کی
تھی جس کو وہ سوسائٹی کے لئے بے معنی تصور کرتا تھا ایک تصویر میں آدم و حوا کے بیٹے مکڑی کے جالے میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جبکہ دوسری میں
ایک شخص کو مکڑی نے پکڑ رکھا ہے اس کے سر پر ایک چوہا بیٹھا ہوا ہے جبکہ بازو پر چھپکلی ہے یہ اشارے سڑنے گلنے کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصوری کے
ایک اور سلسلے میں جن کی نمائش ہوئی تھی ایسے انسان دکھائی دیتے ہیں جن کی آنکھوں کے نیچے گہرے سائے ہیں ان کی صورتوں میں سے ایسا تاثر ابھرتا
ہے جو پاگل پن کا احساس ابھارتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے مصائب سے بے قابو ہو چکے ہیں۔ المیوں نے ان کے ذہنوں اور اعصاب کو معطل کر دیا
ہے۔ یہ تصویریں انسان کی ہیبتناک شکلیں پیش کرتی ہیں۔

تاش کے پتوں کا سلسلہ اگرچہ نیا ہے تاہم اس کے ابتدائی دور ہی سے مربوط ہے ان تصویروں میں تاش کے پتوں کی شکلوں کو حقیقی زندگی میں
پائے جانے والے انسانوں سے ملا دیا گیا ہے جن کا مقصد اس غیر حقیقی انسانی کردار کو ظاہر کرنا ہے جو اس دور کے لوگوں میں عام ہو گیا ہے۔ ایسی شخصیات
جن میں سطحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان تصویروں سے احساس ہوتا ہے کہ ہماری سوسائٹی تاش کے پتوں جیسی ہو گئی ہے جو اپنی جڑوں اور ٹھوس بنیادوں
سے محروم ہو چکی ہے۔ بعد کے دور میں غالب کے شعر

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسس کی ہیں — جس کے شانے پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں

کو تاش کے پتوں کی ٹیکنک میں پیش کیا۔

اگست میں صادقین اس نمائش کے لئے کام کرتے رہے جو ستمبر کے مہینے میں منعقد ہوئی اس ماہ میں ہندوستان سے جنگ کی سالگرہ منائی جاتی

ہے ان تصویروں کے دونوں کینوس بہت وسیع ہیں۔ ایک کینوس ان جارحانہ اصولوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے خلاف جنگ شروع کی گئی تھی۔ ان تصویروں میں مصور نے جو خیال پیش کیا ہے اس کی رو سے دشمن اسی طرح جنگ کے لئے جواز تلاش کرتا ہے۔ صادقین نے تصویروں کے ذریعے اپنے اس نقطۂ نظر کو آفاقی معنی پہنائے ہیں۔ دوسرے کینوس پر فتح کی نشاندہی ہوتی ہے ان میں مصور نے شہادت کی علامتوں کو شامل کیا ہے اور قوم کے ان عظیم ہیروؤں کو پیش کیا ہے جو صرف اس لئے جانیں دیتے ہیں کہ دوسرے زندہ رہیں سچائی زندہ رہے۔ ستمبر کے مہینے میں جس قدر تصویریں بنائی گئیں اور جن کی نمائش اکتوبر میں ہوئی "انعکاس" (REFLECTION) کے خیال کو پیش کرتی ہیں۔ آئینے کی مصوری کو جو تاش کے پتوں کا جزو کے ڈیزائن بناتی ہیں، صادقین نے تھوڑا سا تبدیل کیا ان میں سے انسانی شکلوں کو منہا کر کے ان میں صرف ایسے ڈیزائن شامل کئے گئے جو امیج اور انعکاس سے عبارت ہیں۔ سورج کا امیج اس کا اپنا پسندیدہ موضوع ہے۔

اس کا اہم کام جو اکتوبر میں مکمل ہوا اور نومبر میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ بہت نادر تھا۔ ان بارہ تصویروں میں صادقین نے غالب کے اشعار کی معنوی سمت کو نمایاں کیا ہے۔ جن لوگوں کو اندازہ ہے کہ غالب کی شاعری کس حد تک عوام کے ذہنوں پر حاوی ہے۔ ان کے لئے یہ نمائش بڑی تاریخی تھی۔ اس سے بہت پہلے ۱۹۲۴ء میں چھوٹی جسامت کی واٹر کلر تصویریں غالب کے شعروں کا خوبصورت تناظر پیش کر چکی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں یہ تصویریں کتابی صورت میں شائع ہوئیں جو کہ دنیائے فن و ثقافت کا ایک اہم واقعہ تھا۔ اب کوئی چالیس سال بعد ایک اور ماہر مصور پیدا ہوا جس نے اپنے فنی زاویہ نگاہ سے غالب جیسے بڑے شاعر کو مطالعے کا موضوع بنایا۔ ان دونوں مشہور زمانہ مصوروں کے درمیان فرق ہے چغتائی کا آرٹ ایک سنار کا آرٹ ہے جس میں کاریگری کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ اس کا مزاج رومانی۔ رنگین اور شاعرانہ تھا۔ صادقین کی سطح بھی دوسری تھی اور ٹیکنک بھی ان کا انداز لوہار جیسا تھا۔ وہ ایسے بھاری بھرکم موٹے سیاہ خطوط کھینچتے ہیں جو لوہے کی سلاخ معلوم ہوتے ہیں۔

صفحہ ۱۷۵ کا باقی

انہوں نے جو بھی اسلوب اپنایا وہ ان کا اپنا تھا نہ مصوری میں نہ شاعری میں اور نہ خطاطی میں۔ انہوں نے کسی سے اصلاح لی کسی کا شاگرد ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

صادقین معاشرے میں افراد کو ایک زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے منسلک سمجھتے تھے جس میں ہر کڑی اپنی انفرادیت بھی قائم رکھتی ہے۔ اور اگر وہ الگ الگ ہو جائیں تو ان کی حیثیت لوہے کے ایک چھلے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اس طرح فرد کا بھی اس معاشرتی زنجیر سے اس طرح منسلک رہنا کہ اس کی آزادی انفرادیت اور اس کے وہ تمام حقوق جو بحیثیت انسان کے اُسے قدرت نے عطا کئے ہیں محفوظ رہیں۔ تصاویر اور رباعیات میں تو انہیں اس خیال کا اظہار انہوں نے جابجا کیا ہے۔ خطاطی میں بھی انہوں نے جو انداز اختیار کیا وہ بھی ان کے تصور کی ترجمانی کرتا ہے جس میں الفاظ آپس میں اس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہر حرف اپنی انفرادی شکل پر مکمل طور پر قائم رہتا ہے اور اگلے حرف کو اپنے اندر سموتے ہوئے الفاظ کی شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور قاری کو ان الفاظ کو پڑھنے میں بھی مشکل درپیش نہیں آتی گویا جس طرح ایک مہذب معاشرے میں انسان اپنی انفرادی شخصیت کو بغیر قربان کئے دوسرے افراد کے لئے جگہ پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور معاشرے کی زنجیر طویل سے طویل تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر حرف اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے الفاظ کی سطور کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔

ابرار کرت پوری
بھارت

صادقین

عالمی شہرت یافتہ خطاط اور مصور

صادقین صاحب فطری آرٹسٹ ہیں۔ وہ اپنی تصاویر کے ذریعہ مقصد اور موضوع کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں ان کے مزاج میں جدت پسندی ہے مصوری ہو یا خطاطی ان کے آرٹ میں مقصدیت نظر آتی ہے۔ وہ تجریدی آرٹ کو پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ فن بامقصد ہونا چاہئیے۔ ان کے بقول ان کی زندگی مسلسل جدوجہد میں گزری ہے اور ناسازگار حالات سے بھی دوچار رہی ہے اس لئے ان کی تصاویر میں CACTUS ناگ پھنی بہت نظر آتا ہے اس پودے کو وہ جدوجہد اور کامرانی کی علامت سمجھتے ہیں چونکہ یہ پودا بھی عجیب وغریب حالات میں پرورش پاتا ہے۔ انہوں نے اب تک بے شمار تصاویر بنائی ہیں۔ جن میں اپنے مشاہدات اور تجربات زندگی سے متعلق تصاویر حصول آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے جانباز مجاہدین کے کرب وحشت، اذیت اور تکالیف کی عکاسی کرنے والی تصاویر غالب صدی، علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت اور فیض احمد فیض کی ۷۰ویں سالگرہ پر ان تینوں ممتاز شعراء کے اشعار پر مبنی تصاویر شامل ہیں۔ صادقین صاحب مصور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں اور ماہر خطاط بھی۔ غالب سے انہیں بے پناہ عقیدت ہے ان کا رجحان طبع شاعری کی طرف ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف سخن میں سے انہوں نے رباعی کو انتخاب کیا۔ پندرہ سو رباعیات کہنے کے بعد ان میں سے سو رباعیات منتخب کر کے ہر رباعی سے متعلق ایک تصویر بنائی جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ تین ایڈیشن چھپنے کے بعد بھی کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے۔ اسی سے ان کی رباعیات کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں جس طرح مصوری میں کمال حاصل ہے شاعری پر بھی ان کو پورا عبور حاصل ہے۔ وہ رباعی کہتے ہیں اور فی البدیہہ کہتے ہیں۔

رباعی کو مشکل ترین صنف سخن قرار دیا گیا ہے۔ مصوری اور شاعری سے ان کا تعلق اس نوعیت کا ہے کہ وہ کبھی مصوری میں شاعری کرتے ہیں کبھی شاعری میں مصوری۔ صادقین صاحب کبھی بے حد برجستہ رباعی کہتے ہیں۔ دہلی ٹی وی کے لئے ارماو اسدیو نے انٹرویو لیتے وقت ان سے پوچھا آپ کے کتنے بچے ہیں تو انہوں نے برجستہ فرمایا ؎

وہ مطلع ہستی پہ ہویدا نہ ہوئی
میں اس پہ فدا مجھ پہ وہ شیدا نہ ہوئی
میں صاحبِ اولاد بھی ہو سکتا تھا
اولاد کی والدہ ہی پیدا نہ ہوئی

غالب صدی کے موقع پر انہوں نے پچاس تصاویر غالب کے اشعار پر مبنی تیار کیں جب کاتب سے اشعار لکھوانے کا سوال آیا تو انہوں نے سوچا کیوں نہ یہ کوشش خود کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے خود وہ اشعار لکھے جو دیکھنے والوں نے بے حد پسند کئے۔ چنانچہ انہوں نے خطاطی میں بھی کمال حاصل کیا۔ سنا ہے کہ خواب میں انہیں آیات قرآنی کا کاتب بننے کی بشارت دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے آیات کی کتابت شروع کی اور اس فن میں بھی بام عظمت تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے سورۂ یٰسین شریف کی ہر آیت کو مختلف انداز سے تحریر کیا جو

خطاطی کے فن کا بہترین شاہکار ہیں۔ ۲۲ سال کے طویل عرصے کے بعد نومبر ۱۹۸۱ء میں صادقین دلی آئے وہ حکومت ہند کے مہمان ہیں ان کا قیام دلی کے امپیریل ہوٹل میں اس کمرہ میں تھا جس میں محمد علی جناح ٹھہرا کرتے تھے۔ دلی آکر وہ سرمد شہیدؒ کے مزار پر گئے اور پھر غالب کے مزار پر حاضری دی۔ بستی حضرت نظام الدین نئی دلی میں غالب اکیڈمی کو دیکھ کر جو غالب کے مزار سے ملحق ہے بہت خوش ہوئے وہ غالب سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اسی عقیدت کے سبب وہ مزار غالب اور غالب اکیڈمی میں حاضری دینا سعادت سمجھتے ہیں۔ دلی میں ان کی تصاویر کی نمائش غالب اکیڈمی للت کلا اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوئی ہر جگہ لوگوں نے ان کی تصویروں کو بہت پسند کیا۔ لوگ جوق در جوق ان سے ملاقات کے لئے آتے ہیں۔ وہ کسی ملاقاتی کو مایوس نہیں کرتے۔ جہاں جاتے ہیں۔ آٹوگراف لینے والوں کی کثیر تعداد موجود رہتی ہے۔ صادقین صاحب ایک تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندان کے فرد ہیں۔ آداب مجلس اور جملہ اخلاقیات سے آراستہ صادقین صاحب کو عزت، دولت، عظمت اور شہرت سب کچھ حاصل ہے۔ ان سب چیزوں کے حاصل ہونے کے باوجود وہ ایک انتہائی سادہ مزاج قلندرانہ شان والے فقیر صفت خوش مزاج و خوش طبع انسان ہیں وہ اگرچہ پاکستانی شہری ہیں تاہم وہ بر دیش بر زمین کو اپنا دیش اپنی زمین مانتے ہیں یہی چیز ان کی شخصیت کو آفاقی بناتی ہے وہ ایک قلندرانہ شان رکھتے ہیں اور منکسر المزاج ہیں وہ انسانیت کو بڑا مانتے ہیں مسلم، سکھ، ہندو ان کے سب دوست ہیں ان کی تصاویر کی پہلی نمائش ۱۹۵۴ء میں پاکستان میں ہوئی۔ اس نمائش میں ان کی تصاویر کو بہت پسند کیا گیا اور اس طرح ان کی تصویریں پبلک اور سرکاری عمارتوں کی زینت بنیں۔ ان کے فن کا اعتراف ۱۹۷۰ء میں کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء ان کے لئے نہایت مبارک سال تھا۔ اسی سال ماہ مارچ میں انہیں صدر پاکستان کی طرف سے تمغۂ امتیاز ملا جولائی ۱۹۷۰ء میں انہوں نے ایک نمائش آل پاکستان نیشنل اگزیبیشن آف پینٹنگز میں اول انعام حاصل کیا۔ اسی سال دسمبر میں فرانس کی انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف پلاسٹک آرٹ کی دعوت پر فرانس گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ستمبر ۱۹۷۱ء میں پیرس میں وہ ایک مقابلہ میں شریک ہوئے اس مقابلہ میں آرٹ کے نقادوں کی بین الاقوامی جیوری نے انہیں "بشنالے انعام" سے نوازا اس کے بعد پاکستان میں ان کے فن کے اعتراف میں انہیں صدر پاکستان کی جانب سے تمغۂ کارکردگی دیا گیا۔ اتنا کچھ اعتراف ہونے کے باوجود بھی ان کے فن کو انعامات کی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ملک کے اہل نظر اور آرٹ سے جان کاری رکھنے والوں میں وہ کس قدر مقبول ہیں اس سلسلہ میں نہ تو الفاظ مقرر کئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی پیمانہ وضع کیا جا سکتا ہے۔ صادقین صاحب فرماتے ہیں کہ میں میرا اپنا شاگرد ہوں۔ ہاں تربیت نقاشِ ازل نے کی ہے۔ وہ اپنے فن کی انفرادیت پر نازاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ استاد کی تربیت پرانے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور اس طرح فن محدود ہو جاتا ہے اور اس میں نیا پن نہیں ہوتا وہ اپنی ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

فن ہے تخلیق و اختراع و ایجاد
نقل و تقلید سے میں ہوں یوں آزاد
خطاطی میں شاعری میں نقاشی میں
آپ اپنا ہوں شاگرد خود اپنا استاد

علی گڑھ کے قیام کے دوران کبھی صادقین تین ساڑھے تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکے چونکہ ان کے مداح اور ملاقاتیوں کا ہجوم ان کی قیام گاہ پر رہتا تھا۔ آٹوگراف لینے والوں کی بھیڑ موجود رہتی تھی اسی صورت میں وہ کسی نہ کسی طرح جاگ جاتے تھے صادقین نے کسی کو مایوس نہیں کیا۔ ۱۴ دن تک ان کا دست مصوری چلتا رہا یا وہ لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ علی گڑھ میں جو یادگار چیزیں چھوڑی ہیں ان میں "علم الانسان معلم تعلیم" قابل ذکر ہیں۔ یہ آیت علی گڑھ یونیورسٹی میں علامتی طور پر کندہ ہے صادقین صاحب نے اس کی خطاطی بڑے خوبصورت انداز میں کی۔

فاروق جمال
دلی

صادقین کے ساتھ ایک شام

نئی دہلی ۔ پاکستان کے شہرۂ آفاق مصور، نامور خطاط و شاعر جناب صادقین احمد کا ۲۳ نومبر ۱۹۸۱ء کی شام غالب اکیڈمی نئی دہلی میں غالب کی ایک شام کے عنوان سے ایک یادگار خیر مقدمی جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر ان کے فن مصوری و خطاطی کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت ممتاز ماہر غالبیات جناب مالک رام نے کی اور جناب ایم۔ ایف۔ حسین آرٹسٹ، ہز ایکسی لینسی جناب عبدالستار سفیر مملکت پاکستان بطور مہمانان خصوصی مدعو تھے۔ غالب کے اشعار پر مشتمل صادقین کی قیمتی تصاویر کی شاندار نمائش کا افتتاح جو اکیڈمی کی بیسمنٹ (آرٹ گیلری) میں منعقد کی گئی تھی، دنیا کے مایہ ناز آرٹسٹ جناب ایم۔ ایف۔ حسین کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نمائش میں غالب کے شعری پیکروں پر مبنی صادقین کے معنی خیز مرقعوں کے علاوہ کلام پاک کی مختلف آیات کی بصیرت افروز و روح پرور خطاطی کے نمونے بھی سجائے گئے۔ اس استقبالیہ جلسے میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ معزز شہری بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

جناب کرنل بشیر حسین زیدی، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی اور جناب حکیم عبدالحمید صدر غالب اکیڈمی نے مہمانان کی گل پوشی کی۔ اس جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے سفیر پاکستان جناب عبدالستار نے فرمایا کہ پاکستان چاہتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے ثقافتی اور تہذیبی تعلقات کو فروغ ملے۔ اس سلسلہ میں ثقافتی سطح پر جو کام ہو رہا ہے وہ قابل قدر ہے اور صادقین کے اعزاز میں منعقدہ یہ شام اس بات کی بخوبی عکاسی کر رہی ہے۔

جناب متین صدیقی امروہوی نے اس موقع پر منظوم خراج تحسین و آفریں پیش کئے۔ مولانا سید محمد عبادت کلیم امروہوی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ صادقین نے مرزا غالب کے اشعار کو اپنے بلیغ تجریدی آرٹ کے ذریعہ ساری دنیا میں جس فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے وہ خود فن کا ایک معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔

جناب صادقین نے غالب سے اپنے والہانہ عشق کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حکیم عبدالحمید نے اتنی خوبصورت غالب اکیڈمی بنا کر اتنی عظیم خدمت انجام دی ہے کہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ پھر اپنے رویۂ حیات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خود کو کرۂ ارض کا باشندہ سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو قومی و ملکی حدود سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ کلام پاک کی خطاطی، مصوری اور غالب کے فن سے اپنی گہری وابستگی اور ارادت مندی کو واضح کرتے ہوئے جناب صادقین نے مزید فرمایا کہ وہ اشعار غالب کی کتابت کے ذریعے آیات قرآنی کی خطاطی کے مدینہ میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کے بعد صادقین نے اشارتاً بتایا کہ انہوں نے کتابت، خطاطی اور مصوری کی طرح شاعری کو بھی اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے تاکہ اپنے احساسات و جذبات اور مسلک و مشرب کو مخفی یا پوشیدہ رکھنے کے بجائے ایمانداری، جرأت اور بیباکی سے دنیا تک پہنچا سکیں۔ پھر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی بہت سی رباعیات سنائیں جنہیں سامعین نے بیحد پسند کیا۔

آخر میں جناب ایم۔ ایف۔ حسین نے صادقین کے فن کو آرٹ کی دنیا کا ایک سمندر قرار دیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں جناب مالک رام نے صادقین کے آرٹ کی عالمانہ انداز میں داد تحسین دی۔ جناب ذہین نقوی، سکریٹری غالب اکیڈمی کے شکریہ پر یہ یادگار تقریب کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

نقدِ شعر

سبطِ حسن، مالک رام، ڈاکٹر فرمان فتحپوری،

خاطر غزنوی عظیم امروہوی

اور

ڈاکٹر شکیل نواز رضا

سبطِ حسن

صادقین نقّاش کی رُباعیاں

(یہ مضمون ہفت روزہ "لیل و نہار" کراچی کے ۷ جون ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ مدیر)

صادقین نقاش اپنے جمالیاتی ذوق اور حسّی تجربوں کا اظہار عموماً رنگوں اور لکیروں کے ذریعہ کرتے ہیں لیکن انہیں اردو ادب اور مشرق کی تہذیبی قدروں سے بھی گہرا لگاؤ ہے چنانچہ گذشتہ سال مئی میں غالب کی صد سالہ برسی پر انہوں نے غالب کے پچاس ساٹھ اشعار کو نقش ہائے رنگ رنگ کی صورت میں پیش کیا تھا۔ غالب کے پرستاروں نے یہ تصویریں دیکھیں تو انہیں شاعر کے کلام میں نیا بعد اور نئے معنی نظر آئے۔

مگر غالب کا طلسم معنی ایسا نہ تھا جو چند تصویروں سے ٹوٹ جاتا۔ اب صادقین تھے اور دیوان غالب۔ آخر کار انہوں نے غالب سے مستقل رشتہ قائم کرنے کی غرض سے دیوان غالب کی خطاطی شروع کر دی اور تین چار مہینے کی لگاتار ریاضت سے آدھا دیوان لکھ ڈالا۔ ع

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

لیکن وہ فنکار ہی کیا جسے تخلیق کی بے قراریاں نہ ستائیں۔ چنانچہ انہوں نے خطاطی کو خیرباد کہا مگر کوئے نقش گراں میں واپس جانے کے بجائے۔ کوچۂ خیام و سرمد کا رخ کیا اور رباعیاں کہنے لگے۔

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

چھ مہینے تک وہ دن رات اسی کوچے کا طواف کرتے رہے۔ رنگوں کی پیالیاں سوکھ گئیں۔ مُوقلموں پر گرد و غبار کی تہیں جم گئیں۔ تصویر دان پر مکڑیوں نے جالے بُن لئے۔ مصور کا گوشہ ویران ہو گیا مگر صادقین اپنی دھن میں لگے رہے اور بالآخر ۱۱۱۱ رباعیاں لکھ کر دم لیا۔ لیکن صادقین کے اندر ان کا ہمزاد نقاش کہہ رہا تھا کہ تخلیق ہنوز ناتمام ہے۔ پس انہوں نے پہلے تو رباعیوں کی خطاطی کی پھر ان کو خط و رنگ کے قالب میں ڈھالنے لگے۔

کیں لغزشیں شاعری میں، واپس آیا
پھر کوچۂ بت گری میں واپس آیا
تصویروں نے سینے سے لگایا مجھ کو
جب شہر مصوری میں واپس آیا

آرٹس کونسل کے جس ہال میں پورے ایک سال پہلے صادقین نے غالب کے حوالے سے ایک نمائش کی تھی وہیں ان دنوں

صادقین کی دوسری نمائش ہورہی ہے۔ شاعر کی نمائش ظاہر ہے ایک مہمل سی بات ہے لیکن اس کو کیا کہیے کہ ہال کی دیواروں پر تصویروں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی سیکڑوں تختیاں آویزاں ہیں جن پر صادقین نے اپنی رباعیاں رقم کردی ہیں۔

آرٹس کونسل کے پشت باں سے گزرتا ہوا جب میں پہلی منزل پر پہنچا تو ہال کے دروازے پر مجھے ایک جانی پہچانی تصویر نظر آئی۔ یہ تصویر غالب کے مشہور شعر کی ہے۔

نامہ کب تلک لکھوں جاؤں ان کو دکھلادوں

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

اس تصویر کے چاروں طرف بھی رباعیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ نمائش گاہ میں داخل ہونے کے لیے خیامی دروازے سے گزرنا پڑتا ہے یہ نام صادقین کو بہت عزیز ہے۔ اول اس وجہ سے کہ عمر خیام کی شہرت کا باعث اس کی رباعیاں تھیں۔ دوم ان رباعیوں کا موضوع صادقین کے فلسفہ زیست سے بڑی قربت رکھتا ہے۔ میں پہنچا تو صادقین ایک گوشے میں شیدائیوں کے ہجوم میں کھڑے تھے اور لوگ رباعیوں کے مجموعے پر ان سے دستخط کروا رہے تھے۔ مگر صادقین دستخط پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ فرمائش کرنے والے کی قیافہ شناسی سے کام لیتے ہوئے ہر کتاب پر خطوط نگاری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک خوش شکل اور خوش خو خاتون آگے بڑھیں۔ صادقین نے ان کو ایک بار غور سے دیکھا پھر کتاب کے سادہ صفحے پر بڑی تیزی سے ان کے رخِ زیبا کا خاکہ کھینچ دیا۔ خاتون نے حیرت آمیز لہجے میں شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگئیں۔ پھر ایک نوجوان کی باری آئی۔ اس کی کتاب پر صادقین نے سقراط کی تصویر بنائی اور کہنے لگے ۔ "میں ارسطو کی تصویر بنا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں سقراط صاحب نازل ہوگئے۔" یہ باتیں ہورہی تھیں کہ چند غیر ملکی سیاح آگئے۔ وہ تصویروں کی تشریح کے آرزومند تھے۔ صادقین مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئیے۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے صادقین نے کہا کہ دیکھیئے اس کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی جانب ہے آپ جانتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ سوویت روس کا شہر سمولنسک مشرق میں ہے اور برلن مغرب میں ہے۔ یہ تصویر سرخ فوج کی یلغار اور فاشزم کی شکست کا مرقع ہے قلم جو انسانیت کی علامت ہے فاشستی بہیمیت کے خاردار تاروں میں پیوست ہوگیا ہے اور محنت کشوں کا ہجوم سرخ پرچم لیے (جس پر امن لکھا ہے) آگے بڑھ رہا ہے۔ اس ہجوم نے فاشستی درندے کا سر کچل دیا ہے اور سواستیکا کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے ہیں۔ اس مرقع کا عنوان تھا۔ "فسطائیت کی شکست کی ۲۵ ویں سالگرہ پر"۔ سنتے ہیں کہ صادقین نے یہ مرقع لینن گراڈ کے مشہور میوزم ہرمیٹاج کی نذر کردیا ہے۔

زندگی اور موت کی جنگ صادقین کا محبوب موضوع ہے چنانچہ انہوں نے اپنی رباعیوں میں بھی جابجا اس خیال کو نظم کیا ہے۔

وعدہ جو کیا نورِ سحر سے میں نے

مقتل میں وہ ایفا کیا سر سے میں نے

جلاد کا کرنے کے لیے استقبال

چھڑکاؤ کیا خونِ جگر سے میں نے

جہاں یہ رباعی آویزاں ہے وہیں اسکی تصویر بنی ہے۔ ایک سر کٹا نوجوان ہے جس نے سر کو ڈھال بنالیا ہے۔ تیروں کی بوچھار ہورہی ہے لیکن نوجوان نے حاملہ عورت کو جو نئی زندگی کی بشارت کی علامت ہے، تیروں سے بچا رکھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تخریبی طاقتوں کی تمام کوششوں کے باوجود نسلِ انسانی کا مستقبل روشن ہے۔

صادقین مشرق کی تہذیبی روایتوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ان روایتوں کو اقدار کی کسوٹی پر پرکھنے سے گریز

نہیں کرتے۔ چنانچہ روایت و اقدار کا یہ حسین امتزاج ہال کے ایک گوشے میں بہت نمایاں ہے وہاں ایک چوکی بچھی ہے اس پر گول تکیہ اور موٹی موٹی کتابیں دھری ہیں۔ چوکی کے نیچے ایک اگالدان رکھا ہوا ہے۔ پشت کی دیوار پر رباعیاں آویزاں ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عالم و فاضل بزرگ ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گئے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو چوکی پر جو قالین بچھا ہے اس کے نیچے سے "چند تصویر بتاں" جھانک رہی ہیں بمقصد اس فرق کو بے نقاب کرنا ہے جو زہد و تقویٰ کے دعویداروں کے ظاہر و باطن میں ہوتا ہے۔ صادقین مکر اور منافقت کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔

یوں تو صادقین کا ہر نقش فنکار کے "کرب وجود" اور "اضطرابِ تخلیق" کا آئینہ دار ہے۔ لیکن قتل گاہ سرمد کے منظر میں انہوں نے اپنی زخمی روح کو تصویر کے پردے میں عریاں کر دیا ہے۔ ایک سمت خار دار تاروں کا حلقہ ہے جس پر ایک خون آلودہ خنجر لٹکا ہوا ہے۔ اور بیسویں صدی کا سرمد (جو صادقین خود ہے) پھانسی کے کھمبوں کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہیں۔ اس کی رگیں کھنچی ہوئی ہیں اور بدن کا تشنج جسمانی اور روحانی اذیتوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ پھانسی کے پھندوں کی جانب نگراں ہے۔ کیونکہ ان حلقوں میں سے چاند نظر آ رہا ہے۔

یہ تصویر ان لوگوں کو دعوتِ فکر دے رہی ہے جن کا خیال ہے کہ روشن مستقبل کی راہیں دار و رسن کے بغیر ہنستے کھیلتے طے کی جا سکتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس راہ میں قدم قدم پر بڑے سخت مقام آتے ہیں تخریب کی طاقتیں ہر موڑ پر گھات میں رہتی ہیں۔ ہر گام پر آرام و آسایش اور ذاتی خواہشوں اور آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔ تب بڑی جاں فشانیوں اور قربانیوں کے بعد منزلِ مراد کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔

صادقین کی اس نمایش کا محور ان کی رباعیاں ہیں۔ مگر ان تصویروں کی بھی اپنی ایک مجموعی فضا ہے جو نہایت مربوط ہے۔ یہ فضا ساکن و صامت نہیں ہے۔ بلکہ بڑی طوفانی اور ہیجانی ہے۔ یہ جدل و پیکار کی فضا ہے۔ یہ حق و باطل، صداقت اور منافقت کی جنگ کی فضا ہے یہ تعمیر و تخریب کی قوتوں کی کشاکشِ پیہم کی فضا ہے۔ یہ زندگی اور موت کے لرزہ خیز تصادم کی فضا ہے۔ اس فضا میں تلواروں اور زنجیروں کی جھنکاریں ہیں۔ دولت کی بے شرمیوں اور ہوس کی بے حیائیوں کے قہقہے ہیں، مظلوموں اور مجبوروں کی کراہیں ہیں، موجِ خوں کے تھپیڑے اور ان سب پر حاوی روحِ عصر کے حوصلہ افزا نعرے ہیں۔ جن سے رہ نوردانِ شوق کے حوصلے بڑھتے ہیں۔

صادقین کی تصویروں کو سطحی نظر سے دیکھو تو بڑی بھیانک اور "اذیت پسند" دکھائی دیں گی۔ لیکن وہ لوگ جو ان تصویروں کے معنی و منشا پر غور کرتے ہیں، مغموم اور مایوس نہیں ہوتے بلکہ بڑی فتحمندی اور شادمانی محسوس کرتے ہیں۔

صادقین بڑے صاحبِ ضمیر فن کار ہیں اور قدرت نے انہیں ایک دردمند دل عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ، بے انصافی اور زرگری اور ان معاشرتی لعنتوں کے بطن سے پیدا ہونے والی تمام اخلاقی اور سماجی برائیاں انہیں سخت ناپسند ہیں۔ چنانچہ دانشوروں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لئے انہوں نے اب سے پانچ چھ سال پیشتر چند علامتیں وضع کی تھیں اور ان کو بتایا تھا کہ دیکھو تم نے الوٹی آمریت کے ڈر سے سچ بولنا، سچ سوچنا اور سچ دیکھنا ترک کر دیا ہے تو تمہارے منھ اور کان پر مکڑیوں نے جالے بن لیے ہیں اور تمہارے سروں پر چیل کوؤں نے گھونسلے بنائے ہیں اور انڈے بچے دے رہے ہیں۔ حالانکہ تمہیں تو یحییٰ اور مسیح کے مانند سر ہتھیلی پر رکھ کر چلنا اور پوری قوم کا صلیب اٹھا کر دار پر چڑھ جانا چاہئے تھا۔ سرفروشی کا یہ شوق ان کی تصویروں میں آج بھی نمایاں ہے۔ کیونکہ ہر دور کی اپنی سچائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں جو فن کار کے جذبات و احساسات کے تاروں کو چھیڑتی رہتی ہیں۔ اور مبارک ہیں وہ فن کار جو ان سچائیوں کو اپناتے ہیں اور برائیوں کی زرہ تار نقابوں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ... ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مالک رام

نئی دہلی

صادقین خطاطی اور غالب

یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ مہینہ نومبر کا تھا۔ ایک صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے چونگا اٹھایا تو دوسری طرف سے غالب اکیڈمی کے سکتر جناب ذہین نقوی کی آواز سنی:

"کراچی سے صادقین صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ کب انہیں ساتھ لے کر حاضر ہو جاؤں"؟

"کارِ خیر میں استخارے کی کیا حاجت ہے! آج ہی سہ پہر کی چائے میرے ساتھ پیجیے"۔

اگرچہ میں اس سے پہلے صادقین سے کبھی ملا نہیں تھا، لیکن میں ان کے نام اور کام سے ناواقف نہیں تھا۔ میں جس زمانے میں بکار سرکار بلجیم میں مقیم تھا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک۔ تو وہاں کے بین الاقوامی کسٹم ادارے میں پاکستان کے نمایندے جناب عبدالقادر عیدروس تھے۔ میں ہندوستان کی طرف سے اس ادارے کے جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہاں عیدروس صاحب سے ملاقات ہونے لگی اور رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بہت دوستانہ اور بے تکلفی کے ہو گئے۔ دید و وا دید اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ ہمارے مذاق مشترک اور پسند و ناپسند کے موضوع یکساں تھے۔ ۱۹۶۴ء میں میرے ہندوستان واپس آ جانے کے بعد بھی ہماری خط و کتابت قائم رہی۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ بھی کراچی چلے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے وہاں سے مجھے صادقین کی لکھی ہوئی سورۂ رحمٰن کا مطبوعہ نسخہ بھیجا۔ اس پر صادقین کے دستخط ہیں اور انہوں نے نسخے کے پہلے ورق پر یہ عبارت لکھی:

بسم اللہ

جناب مالک رام مدظلہٗ

عبدالقادر عیدروس صاحب کی طرف سے

بقلم عاصی صادقین عفی عنہ

۱۸، نومبر ۷۰ء۔

اس سورت میں (۷۸) آیتیں ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں گنوائی گئی ہیں۔ اور ہر ایک کے بعد پوچھا گیا ہے کہ آخر تم خدا کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝) اس طرح (۳۱) مرتبہ اس آیت کی تکرار ہوئی ہے۔ صادقین نے یہ آیت ہر بار نئے انداز سے لکھی ہے۔ صادقین سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

اس کے بعد مرزا ظفر حسن مرحوم نے تصویروں کا وہ مجموعہ تحفتہً بھیجا، جو صادقین نے غالب کے شعروں پر بنائی ہیں۔ بہت دن بعد ایک اور ہم مشرب دوست شمشاد حسین رضوی نے جو کراچی کے یونائیٹڈ بنک میں ملازم تھے۔ بنک کا ۱۹۸۱ء کا کیلنڈر بھیجا، جس میں اقبال کے چند اشعار صادقین کی مصوری اور خطاطی کے آیئنے میں" کے عنوان سے شامل کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے ان کی بنائی ہوئی تصویریں اور خطاطی کے نمونے جمع کرنے شروع کیے۔ غالب کے اشعار والی تصویروں میں سے

میں نے یہ دو تصویریں چوکھٹے میں لگوا کر اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھی ہیں :

۱۔ دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

۲۔ کنج میں بیٹھا رہوں یوں پَر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

سہ پہر میں ذہین صاحب انہیں ساتھ لیے تشریف لے آئے میں نے دیکھا ایک دبلا پتلا اکہرے جسم کا آدمی، نکلتا ہوا قد، گندمی رنگ، نیم وا روشن آنکھیں، ننگے سر، سر کے بال بکھرے ہوئے۔ کچھ کھویا کھویا سا سامنے کھڑا ہے۔ حسن اتفاق سے مجھے لاہور کے زمانۂ قیام میں وہاں کے کئی معروف مصوروں سے ملنے کی مسرت حاصل رہی ہے۔ استاد اللہ بخش سے کیٹلی سے تو اچھے خاصے مراسم تھے۔ چغتائی صاحب کو ۱۹۲۶ء یعنی "نیرنگِ خیال" کے زمانے سے بہت قریب سے جانتا تھا۔ اور یہ تعلقات ان کی وفات (جنوری ۱۹۷۵ء) تک قائم رہے۔ یہ سب پنجابی تھے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ پنجابی تن و توش کے اعتبار سے کیسے ہوتے ہیں۔ صادقین کی بھی کچھ ایسی ہی شکل اپنے تصور اور ذہن میں تھی۔ اب جو انہیں گوشت پوست میں متشکل دیکھا تو واقعی کچھ مایوسی سی ہوئی۔ میں انہیں اس سے کہیں زیادہ صحت ور دیکھنا چاہتا تھا۔

خاصی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے جب کمرے میں اپنی بنائی ہوئی تصویریں لٹکی دیکھیں، تو بہت خوش ہوئے۔ خدا معلوم، یہ محض میرے خوش کرنے کو تھا یا حقیقت! فرمایا: میرا ہندوستان آنے کا ایک مقصد آپ سے ملاقات بھی تھی کہ ہم دونوں غالب کے پرستار ہیں۔ میں نے آپ کی غالب سے متعلق تمام تحریریں پڑھی ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔

ان کا نام صادقین احمد نقوی تھا۔ وہ جون ۱۹۳۰ء میں مغربی یوپی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان بھر میں شیعی برادری کا مرکز ہے۔ ضمناً یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر "امروہا" الف مقصورہ سے لکھا جائے تو اس کے عدد "کربلا" کے برابر ہیں (۲۵۲) صادقین تین بھائی تھے: سب سے بڑے کاظمین احمد، دوسرے حسنین احمد اور سب سے چھوٹے یہ خود۔ ان کے جدِ اعلیٰ حضرت شاہ شرف الدین (شاہ ولایت) دسویں پشت میں امام علی نقی کی اولاد میں سے تھے۔ اسی لیے یہ لوگ نقوی کہلاتے ہیں۔ ہمارے زمانے کی بعض مشہور ادبی شخصیتیں اسی خاندان کی نام لیوا ہیں۔ مشہور شاعر رئیس امروہوی جو چالیس سال تک کراچی کے روزنامہ "جنگ" میں روزانہ قطعہ لکھتے رہے نقوی تھے۔ نیز اسی "جنگ" کے سابق ایڈیٹر سید محمد تقی بھی نقوی تھے۔ (معروف اداکارہ مینا کماری والے) کمال امروہوی بھی اسی خاندان سے ہیں۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں۔

صادقین کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی۔ انہوں نے ڈرائنگ اور آرٹ سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ بالآخر بی۔ اے کی سند آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد شروع میں چند دے امروہہ کے امام المدارس ہائی اسکول میں ڈرائنگ کے استاد رہے۔ یہ اسکول اب ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا ہے۔

۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ جہاں ان کے بڑے بھائی کاظمین احمد پہلے سے جا چکے تھے۔ وہاں ابتدائی زمانہ ان پر بہت سخت گزرا۔ تلاشِ معاش میں کہاں کہاں کے پاپڑ نہیں بیلے۔ کچھ دن ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ آخرکار بالو توڑ کے کراچی میں رختِ سفر کھول دیا۔

بنیادی طور پر ان کا گھرانا زمینداروں کا تھا۔ کچھ زمین ان کی ملکیت میں تھی، جس سے سالانہ ضرورت بھر کی فصل پیدا ہو جاتی تھی۔ سستا سماں تھا، ضرورتیں محدود تھیں اور وقت اور روپیہ ضائع کرنے کے لیے لغویات محدود تر۔ لہٰذا گھر کے اُجلے خرچ کی طرف سے اطمینان تھا۔ لوگوں میں علم حاصل کرنے اور اپنی اولاد کی تربیت اور تہذیب کا جذبہ تھا۔ مدارس میں طلبہ کو

خوشخطی کی باقاعدہ مشق کرائی جاتی تھی۔ خوشخطی منشی کا زیور تصور ہوتی تھی۔ صادقین کے خاندان میں بھی خوشنویسی نسلاً بعد نسل چلی آرہی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے بتایا تھا کہ میرے پاس اپنے مختلف بزرگوں کے لکھے ہوئے سات قرآن مجید موجود ہیں۔ ان کے والد سید سبطین احمد بھی اچھے خوشنویس تھے۔ اگرچہ انھوں نے اسے کبھی اپنا ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

غرض اس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی انھیں بچپن سے اپنے اردگرد کتابیں۔ خوشخط لکھی ہوئی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا تو لامحالہ اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس پیشہ اختیار کیا، تو آرٹ بھی کا۔ چنانچہ ابتداً تصویرکشی سے ہوئی۔ جو بعد کو خطاطی میں تبدیل ہوگئی لیکن ان کی خطاطی بھی دراصل مصوری ہی کی دوسری شکل ہے۔

اسلام میں، بوجوہ تصویرکشی کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ لہٰذا وہ لوگ جنہیں اس سے دلچسپی تھی انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لئے خطاطی پر توجہ کی۔

میرا خیال ہے، اور یہ میں کہیں لکھ بھی چکا ہوں کہ بابل کی پرانی زبان موجودہ عربی ہی کی اولین شکل ہے اور عربی خط کوفی بھی بابل کے قدیم میخی یا مسماری رسم الخط کی ارتقائی شکل ہے۔ صدرِ اسلام میں عرب میں یہی خط کوفی رائج تھا۔ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خطوط اور فرامین دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئے اور مختلف کتاب خانوں یا نجی ذخیروں میں ملتے ہیں اسی خط میں ہیں قرآن کریم کے تمام قدیم قلمی نسخے بھی خطِ کوفی میں ہیں۔

یہ خطِ کوفی چوتھی صدی ہجری کی ابتداء (یعنی دسویں صدی عیسوی) تک رائج رہا۔ ابن مقلہ نے اسی سے چھ خط نکالے۔ جن کے نام اس طرح لکھے گئے ہیں:

نگارمن خط خوش می نویسد
بغایت خوب دلکش می نویسد
مناثیر و محقق، نسخ و ریحان
رقاع و ثلث بر شش می نویسد

چوتھی صدی ہجری میں پہلے رقاع اور توقیع کی آمیزش سے تعلیق بنا اور پھر خواجہ میر علی تبریزی نے تعلیق اور نسخ کو ملا کر نستعلیق ایجاد کیا جو آج تک فارسی اور اردو کا مقبول عام خط ہے۔

اسلامی خطاطوں نے نستعلیق سے متعدد خط پیدا کیے۔ خطِ گلزار، خطِ طاؤس، خطِ ماہی، خطِ گوہر، خطِ زلفِ عروس، خطِ طغریٰ اور دیگر اور۔ جیسا کہ ان ناموں ہی سے ظاہر ہے۔ دراصل ان کا مقصد تزئین و آرایش اور تصویرکشی کی جبلّی خواہش کو عملی جامہ پہنانا تھا اور اس میں وہ لوگ بدرجۂ اتم کامیاب رہے۔ آپ ان خطاطوں میں کوئی تحریر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صفحۂ نقش تصویر بنا ہوا ہے اور اسی لیے عام آدمی کیلئے اس میں مرموز عبارت کا پڑھنا آسان نہیں، اور اس کے لئے خاص تعلیم اور مشق کی ضرورت ہے۔

صادقین نے خطاطی میں ایک نئی روش نکالی۔ اگرچہ ان کا خط بنیادی طور پر نستعلیق ہی رہا لیکن انھوں نے اس میں بعض تخصی تبدیلیاں کرلی تھیں۔ مثلاً وہ لفظ کے شروع کا یا کوئی درمیانہ حرف پورا لکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی لفظ کو توڑ کر اس کے اجزا کو پورا لکھ دیتے تھے لیکن پوری تحریر میں تصویری کیفیت پیدا ہو جاتی۔

تصویرکشی میں بھی ان کا مخصوص انداز ہے۔ انھوں نے بعض اشخاص کی جو تصویریں بنائی ہیں ان میں تو البتہ اعضا مکمل اور قدرتی ہیں۔ ورنہ خیالی تصویروں میں کوئی تناسب نہیں۔ اعضا اکھڑے اکھڑے، الگ الگ، چھوٹے بڑے اور بعض اوقات بڑے بھیانک ہیں لیکن ان کی بنائی ہوئی تصویر کسی شعر کی تعبیر ہو یا خیالی۔ اس سے قوت اور جلال کا اظہار ہوتا ہے۔

بہرحال ان کے فن میں انفرادیت ہے۔ تحریر ہو یا تصویر، اگر آپ کو ان کے فن سے مزاولت رہی ہے تو آپ کو پہلی نظر میں معلوم ہو جائیگا

کہ یہ صادقین کی تخلیق ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا کوئی مکتب پیدا ہو تاہے یا وہ اپنے انداز کے خود ہی خالق ثابت ہوتے ہیں اور خود ہی خاتم۔

جب اُنھوں نے اپنے نئے انداز کی تصویریں اور تحریریں پیش کیں، تو قدرتاً لوگ اس پر بہت بھڑکے۔ کیوں کہ یہ کسی مسلّمہ اصول پر پوری نہیں اُترتی تھیں، لیکن وہ بھی اپنی دُھن کے پکّے تھے، استقلال سے اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ رفتہ رفتہ لوگ ان کے کام سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ آرٹ کی دنیا میں ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ آپ اسے پسند یا ناپسند تو کر سکتے ہیں، لیکن اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال جیسا کہ اُنھوں نے ایک شعر میں کہا ہے: اُنھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ ہر میدان میں اپنی راہ خود نکالی اور اس پر چل پڑے، اس کی پروا کیے بغیر کہ کوئی اسے پسند کرتا ہے یا نہیں۔ لکھتے ہیں:

خطّاطی میں، شاعری میں، نقاشی میں
آپ اپنا ہوں شاگرد، خود اپنا اُستاد

لیکن رئیس امروہوی نے کہا ہے کہ وہ ان کے شاگرد تھے، یہ صحیح ہوگا۔ شاید آغاز میں ان سے مشورہ کیا ہو!

۱۹۶۰ء میں حکومتِ پاکستان نے اُنھیں فن کی خدمت کے صلہ میں "تمغۂ امتیاز" عطا کیا اور پھر ۱۹۶۵ء میں "تمغۂ حسن کارکردگی" (PRIDE OF PERFORMANCE) سے نوازا۔

۱۹۶۱ء میں FRENCH COMMITTEE OF INTERNATIONAL ASSOCIATION OF PLASTIC ARTS نے جو حکومتِ فرانس کی وزارتِ ثقافت کا ایک شعبہ ہے، اُنھیں (۸۰۰) فرانک ماہانہ وظیفہ پر فرانس آنے کی دعوت دی، جسے اُنھوں نے قبول کر لیا، وہ صرف پانچ مہینے کے لئے وہاں گئے تھے۔ لیکن تقریباً ۶ برس کے بعد واپس آئے۔ یہ اُن کا معمول تھا جہاں گئے، اگر وہاں کا ماحول پسند آگیا، اور دل لگ گیا، تو پھر واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

فرانس کے قیام کے دوران میں ان کی تصاویر کی کئی نمائشیں منعقد ہوئیں۔

سب سے پہلی نمائش حکومتِ فرانس کے زیرِ اہتمام، فرانس کی مشہور بندرگاہ ہاور (LE HAWRE) کے عجائب گھر میں ۳۰ جون سے ۲۵ جولائی ۱۹۶۲ء تک ہوئی۔ یہ دونوں باتیں باعثِ فخر ہیں۔ یعنی نمائش کا اہتمام حکومت نے کیا اور یہ کسی گیلری کی بجائے عجائب گھر میں منعقد ہوئی۔ ہاور سے واپس آئے تو دوسری نمائش اسی سال ۱۲ اکتوبر سے ۲۵ اکتوبر تک گیلری لیمبرٹ پیرس میں ہوئی۔ یہ نمائش مشہور بین الاقوامی ادارے CONGRESS FOR CULTURAL FREEDOM کے زیرِ اہتمام ہوئی تھی۔ اسی کے بعد پیرس کے معتبر اور باوقار روزنامہ "فگارو" (LA FIGARO) کے ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے ہفتہ واری آرٹ ضمیمہ میں فرانس کے شہرۂ آفاق نقاد موسیو ریمان کونیا (RAYMOND COGNIAT) نے صادقین سے متعلق ایک مضمون شائع کیا، جس میں ان کے فن کی جدت اور غیر تقلیدی روش کی دل کھول کر تعریف کی۔ غالباً اسی کے بعد پیرس کے ماڈرن آرٹ کے عجائب گھر نے ان کی دو تصویریں ایک ہزار فرینک میں خریدیں۔ یہ آج بھی اس عجائب گھر میں موجود ہیں۔

اسی سال کے آخر میں (۱۴ دسمبر ۱۹۶۲ء - ۵ جنوری ۱۹۶۴ء) پیرس کے اسی ماڈرن آرٹ کے عجائب گھر کی بڑی نمائش میں بھی ان کی تصویریں رکھی گئیں، جو بہت بڑا اعزاز تھا کیوں کہ اس نمائش میں صرف مسلّمہ اساتذہ اور فنکاروں کی تصویریں رکھی جاتی ہیں۔

قیامِ فرانس کے دوران کا ایک بہت بڑا کارنامہ ان کا مشہور نوبل انعام یافتہ مصنف البرکامیو (ALBERT CAMUS) کی کتاب اجنبی (L'ETRANGERE) کا مصوّر ایڈیشن تیار کرنا تھا۔ کامیو کا بہت کم عمری یعنی صرف ۴۷ برس کی عمر میں ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ کتاب L'AUTOMOBILE BOOK SOCIETY OF FRANCE نے اس کی وفات کے بعد مصوّر شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو تصویروں کی تیاری کا کام صادقین کے سپرد ہوا۔ اُنھوں نے یہ تصویریں ۱۹۶۴ء میں مکمل کیں۔ کتاب اگلے برس ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کا اجرا کونکورڈ کے مشہور میدان (PLACE DE LE CONCORDE)

میں ایک بہت بڑے اجتماع میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ہوا تھا۔ اس کتاب میں (۲۸) رنگین تصویریں ہیں۔ نیز گیارہ ابواب کے آخر میں جہاں جگہ بچ گئی ہے، وہاں سپید و سیاہ تصویریں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ اسی کے بعد ان کا نام "دنیا کے نامور مصور" نامی کتاب میں شامل ہوا۔ کامیو کی کتاب کی تصویروں کے لیے انھیں ستر ہزار فرانک دیے گئے تھے۔

اب انھوں نے تفریح کی خاطر سوئزرلینڈ کا سفر کیا اور وہاں کے شہر لوزان میں ڈیرے ڈال دیے۔ لیکن ان کی شہرت ان سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ یہاں انھوں نے پاولین کے لیے ۲۶ فٹ لمبی اور ۹ فٹ چوڑی دیواری تصویر (MURAL) تیار کی۔ جب پیرس واپس آئے تو پاکستان ہوائی کمپنی کے دفتر میں ایسی ہی سات گز لمبی دیواری تصویر تیار کرنے کا کام ان کے سپرد ہوا۔ یہ دفتر پیرس کی مشہور مرکزی شاہراہ (CHAMPS ELYSEE) شانزے لیزے پر ہے۔

ان کی تین دیواری تصویریں پاکستان میں بھی ہیں: (۱) تربیلا ڈیم، (۲) دولت پاکستان بنک، (۳) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ممکن ہے اور بھی ہوں، جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

پیرس سے وہ نومبر کے اواخر میں امریکا گئے۔ یہاں واشنگٹن میں پہلے ہی ان کی کامیاب نمائش ۲۵ جولائی سے ۲۵ اگست ۱۹۶۳ء تک ہو چکی تھی، اور لوگ ان سے اور ان کے فن سے واقف تھے۔ واپسی پر لندن پہنچے، جہاں اسی سال ۳۱ اکتوبر سے ۲۴ نومبر تک نمائش ہوئی۔ اس میں انھوں نے اپنی (۵۵) تصویریں رکھی تھیں۔

جیسا کہ شروع میں کہہ چکا ہوں وہ نومبر ۱۹۸۱ء میں اپنے اعزہ سے ملنے کو ہفتے عشرے کے لیے یہاں آئے لیکن یہاں دلی میں چاہنے والوں نے انھیں ایسا گھیرا کہ ان کے لیے راہِ فرار بند ہو گئی۔ بالآخر یہاں انھوں نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور اس میں فرش پر ایک چٹائی ڈال دی۔ کمرے میں ایک کنارے پلنگ پڑا تھا، جس پر وہ دن رات میں چند منٹ کے لئے کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ جاتے تھے، ورنہ سارا وقت اسی چٹائی پر بیٹھے رہتے اور چائے کا دور چلتا رہتا۔ جو آتا اسی چٹائی پر بیٹھتا اور یہ بوریا نشین قلندر حسبِ توفیق سب کی خاطر مدارت کرتا۔

دلی میں انھوں نے ہمدرد نگر میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے گنبد کو اسمائے حسنیٰ عطا کیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام آئے ہیں۔ صادقین نے دو ڈھائی مہینے میں یہ پینل تیار کیے تھے۔ اور اس کام کے لئے کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ دیکھنے کی چیز ہے جن اصحاب کو خطاطی سے دلچسپی ہے۔ انہیں صرف ان کے دیکھنے کے لئے شدِ رحال کرنا چاہیے۔

یہاں سے وہ علی گڑھ گئے۔ وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اپنے فن کے نمونے چھوڑے۔ وہاں سے بنارس کا رخ کیا۔ بنارس میں انھوں نے کلا بھون کے مرکزی ہال میں ایک طویل و عریض تصویر بنائی۔ اس کا افتتاح مہاراجہ بنارس نے کیا تھا۔

ایک رباعی میں انھوں نے بنارس کے قیام کے زمانے کا ایک تاثر بیان کیا ہے:

میخانے میں گہری جو وہاں رات ہوئی
پھر شہرِ بنارس میں عجب بات ہوئی
نکلا جو خرابات سے، غالب سے مری
اِک کوُئے ملامت میں ملاقات ہوئی

جیسا کہ معلوم ہے، غالب کلکتے جاتے ہوئے کچھ دن بنارس میں رکے تھے۔ اُن کی لاجواب فارسی مثنوی "چراغِ دیر" اسی قیام کا ثمرہ ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے جس والہانہ انداز میں بنارس کے "قیامت قامتوں" اور "مژگاں درازوں" کا ذکر کیا ہے، وہ قابلِ دید ہے۔

اس کے بعد وہ میر عابد علی خان مدیر و مالکِ روزنامہ سیاست کی دعوت پر حیدر آباد گئے۔ وہاں انھوں نے اردو گھر، مغل پورہ میں ایک دیواری تصویر بنائی، جو اردو گھر کے لئے باعثِ افتخار ہے اور رہے گی۔ یہاں سے انھوں نے سرنگاپٹم میں ٹیپو سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی۔ وہی سلطان شہید جن کا یہ قول اقبال نے جاوید نامہ میں نقل کیا ہے:

زندگی راچیست رسم و دین و کیش
یک دمِ شیرے، بہ از صد سالِ میش

دلّی واپسی کے بعد اُنھوں نے پاکستان مراجعت کی ٹھان لی۔ اور آخر تقریباً تیرہ مہینے کے قیام کے بعد ہندوستان سے ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو اپنے احباب اور مدّاحین سے رخصت ہوئے۔ ان کا دوبارہ یہاں آنے کا ارادہ تھا۔ وہ اپنی رُباعیوں کا دوسرا مجموعہ یہاں سے شائع کرنا چاہتے تھے (پہلا "رباعیات صادقین نقاش" کے عنوان سے ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں لاہور سے شائع ہوا تھا) لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ منظور نہیں تھا اور وہ نہ آسکے۔

ان کی زندگی بے حد غیر منظّم اور غیر معتدل تھی۔ اسی سے صحت بھی خراب رہتی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں دو تین بر اعظموں کے بڑے بڑے بے پروا اور جغم قسم کے قلندر دیکھے ہیں، لیکن سچ مانیے کہ صادقین ان میں بھی صفِ اوّل میں جگہ پانے کے مستحق تھے۔ وہ عمر بھر مجرّد رہے، "تاہل کا کھڑاگ" کبھی پالا ہی نہیں اور غالباً یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ دراصل وہ خانہ داری کی ذمہ داریوں کی گوں کے آدمی تھے بھی نہیں۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ جو کسی ذمہ داری کے سر پر آپڑنے سے فرض شناسی کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے، اُنہیں اس کا موقع نہ ملا اور یہ خفیف سا امکان کہ شاید گھر بار والا ہو جانے پر وہ کچھ محتاط ہو جاتے، اس کا تجربہ ہی نہ ہو سکا۔

دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی شخص ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہ رہا۔ اور جب انسان کسی ڈھلوان پر پھسلنے لگتا ہے اگر رستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، تو پھر وہ تہ سے اِدھر دم نہیں لے سکتا۔ بہر حال اب ان سب باتوں کی بعد از جنگ سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

جنوری ۱۹۸۷ء کے آخری ہفتے میں ان پر کراچی میں نمونیہ کا حملہ ہوا۔ فوراً جناح اسپتال پہنچائے گئے۔ چند دن بعد وہاں سے ایک پرائیویٹ سرجن ڈاکٹر رحیم کے کلینک (ORTHOPAEDIC MEDICAL INSTITUTE) میں منتقل کر دیئے گئے وہیں منگل ۱۰ر فروری ۱۹۸۷ء علی الصبح تین بجے اپنے خالق کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان سے فضل و کرم کا سلوک فرمائے۔۔ آمین!

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

(۲)

صادقین نے تین شاعروں کا کلام مصوّر کیا: غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ۔ فیض کے کلام کی تصویروں کا عجیب قصہ ہوا۔ اُنھوں نے یہ تصویریں حفاظت کی خاطر ایک نوجوان دوست کی تحویل میں دے دی تھیں۔ ان صاحب نے یہ بیچ ڈالیں اور اطلاع دیے بغیر ملک سے باہر چلا گیا۔ جب واپسی پر آکے اس نے صادقین سے اس کا ذکر کیا، تو کہا:

"بیچارہ لڑکا ضرورت مند ہوگا، اسے شادی کرنی تھی۔

چلو، اچھا ہوا۔ میری پینٹنگز (PAINTINGS) سے اسکی ضرورت پوری ہوگئی۔"

بہر حال فیضؔ والے کلام کی کوئی تصویر میری نظر سے نہیں گزری۔ خدا معلوم، اب یہ ہیں کس کے پاس!

وہ غالباً غالبؔ کا مصوّر دیوان شائع کرنا چاہتے تھے۔ کسی باعث یہ دیوان شائع کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے، اس پر بہت خرچ اُٹھ جاتا۔ اس پر اُنھوں نے ۲۳ رنگین تصویریں پُرتکلف کاغذ پر چھپوا کر اور اُنھیں گتّے کے ڈبے میں بند کروا کے شائع کر دیں۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ آخر ہمارے قدیم کلاسیکی شعرا کو کیوں مصوّر نہیں کیا گیا! پہلی مرتبہ یہ کام غالبؔ ہی سے کیوں شروع ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ غالبؔ سے پہلے کی ہماری شاعری میں جو یکسانیت اور عدمِ توازن ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ولیؔ سے لے کر، بلکہ ولیؔ سے بھی کیوں، اس سے بھی پہلے محمد قلی قطب شاہ سے لے کر مومنؔ اور ذوقؔ تک سب کے کلام کو آپ مصوّر کرنا چاہیں، تو ایک تصویر کافی ہوگی۔ اس میں کسی حسینہ کے گرد چند پروانے اُڑتے ہوئے دکھا دیجیے، آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

یہ غالبؔ تھا، جس نے سب سے پہلے حُسن وعشق کے علاوہ زندگی کے اور مسائل کو بھی موضوعِ کلام بنایا۔ اُنھوں نے کائنات میں انسان اور انسانیت کی مرکزی اہمیت پر خاص طور پر توجہ مبذول کرائی۔ انفس و آفاق کے جن مسئلوں کو انہوں نے بار بار مختلف انداز سے پیش کیا، ان سے پہلے کسی شاعر نے اُنھیں درخورِ اعتنا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ غالبؔ مصوّروں کی دلچسپی کا مرکز بنے۔

سب سے پہلے چغتائی نے اس پر توجہ کی۔ اُنھوں نے ۱۹۲۸ء میں "مُرقّعِ چغتائی" شائع کیا۔ یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ آج کہ اس تاریخی واقعے پر (۶۴) برس گزر چکے ہیں۔ ہم اس گرم جوشی اور ذوق وشوق اور فخر ومسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس کا مظاہرہ اردو دنیا کی طرف سے "مرقع" کی اشاعت پر کیا گیا تھا۔ اس کے چند سال بعد انھوں نے کچھ مزید تصویریں "نقشِ چغتائی" کے عنوان سے شائع کیں۔

چغتائی کے بعد صادقین نے غالبؔ کو اپنی مصوری کا موضوع بنایا۔ غالبؔ اور صادقین میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ دونوں پیدائشی باغی ہیں۔ دونوں نے اپنی راہ آپ نکالی، اور کسی مسلّمہ اصول کی پیروی نہیں کی۔

نمی رویم براہے کہ کاروان رفت

دونوں بے اُستادے تھے۔ نہ غالبؔ نے کسی سے اصلاح لی، نہ صادقین نے خطاطی کے لئے کسی کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا۔ دونوں کو وقت کے جغادریوں کی مخالفت اور نکتہ چینی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ غالبؔ کو سرِ مشاعرہ سننا پڑا۔

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

صادقین کے نکتہ چینیوں نے کہا:

"ان کے فن میں تکرار ہے۔ تصویریں بے رنگ ہیں جن میں نومیدی و بدصورتی ہے۔"

یہ اعتراض ظاہر ہے، خالقِ کائنات کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کام اور کلام دیکھیے ہر طرف تکرار کی بھرمار ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان پیدا ہوتا آرہا ہے، جو سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ سب کا ایک سا ناک نقشا لیکن آپ کو کبھی یکسانیت کی اُکتاہٹ یا اس پر کبھی اعتراض کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پھر اس نے جتنا کلام اپنے بندوں پر نازل فرمایا، اس میں بے حد تکرار ہے۔ سب کتابوں میں ایک ہی تعلیم مختلف لفظوں میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ قرآن ہی کو لے لیجیے۔ صرف اس کی ایک آیت (فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ) کو (۳۱) مرتبہ دہرایا ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ ان کی تصویریں بے رنگ ہیں یا ان میں ناامیدی اور بدصورتی ہے تو یہ بھی قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ پسند اپنی اپنی۔ ضرور نہیں کہ جو چیز آپ کو پسند ہے، دوسرے بھی اس میں آپ سے متفق ہو جائیں۔ اور نہ آپ کی ناپسندی کو سب مردود قرار دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن اصولی بات یہ ہے کہ فنکار کا اپنا ماحول ہے، اس کا اسکی تخلیق پر لازماً اثر ہوگا۔ یہ لازمۂ حیات ہے، اس سے مفر نہیں۔ اگر مصوّر ایسے وقت اور حالات میں تصویر بنا رہا ہے، جب وہ کشمکش کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے یا وہ اپنے سماجی اور ملکی حالات سے متاثر ہو رہا ہے یا قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں، جنہیں اسکی حساس طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ اور وہ انھیں بنی نوعِ انسان کے لیے مضر اور خلافِ انسانیت خیال کرتا ہے تو لازماً اسکی نفسیاتی کیفیت کا اثر تصویر میں ظاہر ہوگا۔ آپ اسے "نومیدی" یا "بدصورتی" سے کیوں کر تعبیر کرسکتے ہیں!

چغتائی اور صادقین کے فن میں ایک واضح تفاوت ہے۔ چغتائی تصویرکشی (یعنی پورٹریٹ PORTRAIT) میں ماہر ہے۔ خطوں اور لکیروں کی مدد سے تصویر بنانے میں اس کا جواب نہیں۔ اس نے متعدد تصویروں میں کوئی رنگ استعمال نہیں کیا۔ بس چند خط ہیں، لیکن ان سے جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے، وہ اتنی جاندار ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے، ابھی بات کرنے لگے گی۔

صادقین اس کے مقابلے میں فضا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ پوری تصویر دیکھنے والے کے سامنے ایک اکائی کے طور پر پیش کرکے اُسے متاثر کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر تصویروں کو ٹکڑوں میں نہیں بحیثیت مجموعی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ

اُنھوں نے نئی دنیا پیدا کر دی ہے۔ ان کی ایمائیت اور رمزیت کو پورے طور پر سمجھنے، اور اسکی اہمیت کا اندازہ لگانے، اور اس سے لُطف اندوز ہونے کے لیے، ان کی تصویروں کو بار بار دیکھنے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

خیر، یہ دوسرا موضوع ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ مناسب موقع و محل بھی نہیں ہے۔ میں نے اوپر اس مجموعے کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے غالبؔ کے اشعار کی تصویریں یکجا کر دی ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل اشعار کو مصوّر کیا گیا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

کی، مرے قتل کے بعد، اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، اُن کو دکھلا دوں — اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھُلا — کاش کے ہوتا قفس کا در کھُلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے، راہ کو پُرخار دیکھ کر

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار — نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار

تو، اور آرائشِ خمِ کاکل — میں، اور اندیشہ ہائے دور دراز

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں، کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں!

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

تماشا کر، اے محوِ آئینہ داری! — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

قفس میں، مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم! — گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو!

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری — تقریب کچھ تو بہرِ مِلاقات چاہیے

سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی — رُو سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

حُسن بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے — آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں، مجھ سے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی، مجھے

بھرم کھل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

صفحہ ۷۹ پر

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

صادقین اردو رباعی کا خیّام

یوں تو اردو فارسی شاعری اور ادبیات کی تاریخ میں کئی نام ایسے ہیں جو کسی خاص شعبہ فکر و فن میں غیر معمولی صلاحیت و مہارت رکھنے کے سبب منفرد حیثیت کے مالک ہیں اور اپنے زمانے کے نابغہ کہلانے کے مستحق ہیں لیکن ان صفاتی کلمات کا صحیح اطلاق اردو میں صادقین اور فارسی میں خیام کی شخصیتوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں بلانوشوں نے فکر و فن کی جس بلند سطح سے دو مختلف متضاد جہتوں سے اپنی اپنی ایجادی و اختراعی قوتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنی اپنی بڑائی کا لوہا منوایا ہے اس تک بہت کم لوگ پہنچ سکے ہیں۔ عمر خیام نے اول اول ممتاز ریاضی داں کی حیثیت سے دنیا کو متحیر کیا پھر شعر کے حوالے سے بحرِ ہزج کے گردابی اوزان میں طبع آزمائی کی اور بحیثیت رباعی نگار ایسا بلند مقام حاصل کر لیا کہ اُن کی رباعیات کے ترجمے کے طفیل انگریزی زبان کا ایک غیر معروف شاعر فٹز جیرالڈ بھی مشاہیرِ عالم میں شمار کیا جانے لگا۔

صادقین کی فنی و تخلیقی شخصیت بھی عمر خیام سے بہت مشابہ ہے۔ صادقین نے پہلے برش اور رنگ کی مدد سے مصوری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور عالمی سطح پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا، پھر رنگ اور برش سے آگے بڑھ کر حرف و صوت سے رجوع کیا اور رباعی نگار شاعر کی حیثیت میں ایسی بحر کی تہہ سے آبدار موتی نکالے جس میں خود خیام نے غواصی کی تھی۔ گویا خیام اور صادقین فکری و تخلیقی اعتبار سے ایک ہی بحر کے ہم دست و ہم رنگ شناور ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انگریزی میں ترجمے کی بدولت خیام کی شہرت اپنی زبان کے دائرے سے نکل کر عالمی سطح تک پہنچ گئی اور صادقین کی شہرت ابھی صرف اردو کے حلقۂ اثر تک محدود ہے۔

اس میں دو رائیں نہیں کہ صادقین، عالمی شہرت کے مصور و خطاط ہیں۔ بات یہیں تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ اس لئے کہ عالمی شہرت کے مصور و خطاط اور بھی ہیں۔ صادقین کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے مسلم ثقافت کی زمین میں مصوری کی مدد سے خطاطی کے فن کا ایک ایسا قلم لگایا ہے جس کی بوقلمونی پوری دنیا میں بے مثال اور عرب و عجم دونوں کی ترجمان ہے بقول صادقین ؎

نستعلیق کے اور نسخ کے خم دونوں کو لوحوں پہ ملایا ہے بہم دونوں کو
خطاطی میں یوں ایک کیا ہے میں نے اے دوست عرب اور عجم دونوں کو

صادقین کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ وہ مصور و خطاط ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور شاعر بھی ایک ایسی صنفِ سخن کے جس میں کمال حاصل کرنا تو درکنار ہاتھ لگانا بھی آسان نہیں ہے۔ میری مراد صرف رباعی سے ہے جس میں فارسی اور اردو کے گنے چنے شاعروں ہی نے شہرت پائی ہے۔ کیا عجب کہ صادقین اگر تھوڑی عمر اور پاتے تو ان کی تخلیقی قوت، فنِ لطیف کے مزید شعبوں میں اپنا جلوہ دکھاتی۔ اس لئے کہ انہوں نے ایک رباعی میں اپنی صلاحیت فطری کا ذکر اس طور پر کیا ہے۔

میں حسن کی جس انجمنِ ناز میں ہوں جو کچھ بھی ہوں خود اپنے ہی انداز میں ہوں
خطاط کے، شاعر کے، مصور کے سوا میں اور بہت کچھ ہوں مگر راز میں ہوں

اپنی ذات میں وہ کیا کچھ تھے؟ یہ راز اُن کی خطاطی و مصوری سے بھی مترشح ہے لیکن رباعی میں چونکہ انہیں براہ راست زبان و بیان سے کام لینا پڑتا ہے اس لئے علامات و کنایات کے باوجود یہ راز بہت کچھ فاش ہو گیا ہے، چنانچہ رباعیات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اہلِ دل میں

ہیں اور اُسی جادۂ عشق کے مسافر ہیں جس پر چل کر فارسی میں ابو سعید ابوالخیر، عمر خیام اور سرمد نے بحیثیت رباعی نگار شہرت پائی اور اردو میں امجد حیدرآبادی، جوش ملیح آبادی اور فراق کی بدولت فن رباعی کا بھرم قائم ہوا فارسی اور اردو کے بعض دوسرے شعرا نے بھی رباعی کی صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن یہ طبع آزمائی نہ تو شاعر کی شناخت کا سبب بن سکی ہے اور نہ ہی رباعی کا فن، کوئی ارتقائی نشان چھوڑ سکا ہے۔ اس کا خاص سبب ہے۔ رباعی صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور خاص اوزان میں کہی جاتی ہے۔ یہ اوزان ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں لیکن سب کے سب بہت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ عروضی حرکات و سکنات کی سخت زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آسانی کے لئے لوگوں نے "لاحول ولا قوت اِلّا باللہ" ہی کو رباعی کے وزن کے طور پر ذہن نشین کر رکھا ہے جیسا کہ امجد حیدرآبادی کی اس رباعی سے ظاہر ہے ؎

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لاحول ولا قوت اِلّا باللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

یقیناً یہ بھی ایک وزن ہے لیکن خفیف محذوفات و ترمیمات کے ساتھ دوسرے اوزان بھی ہیں۔ ان سب پر قابو پانا آسان نہیں ہے اس کا فن طویل ریاضت چاہتا ہے۔ خود صادقین نے اپنی بیاض میں لکھا ہے کہ "اگرچہ خاص ماحول کے سبب صنف رباعی سے میرا ذہن لڑکپن ہی سے مانوس رہا اور گاہے گاہے اس میں کچھ کہتا بھی تھا لیکن اسے باقاعدہ ہاتھ لگانے اور بحیثیت رباعی نگار سامنے آنے کی ہمت برسوں کی ریاضت کے بعد چالیس سال کی عمر میں ہوئی ہے"۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کسی اور صنف کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ صرف رباعی کے ہو کر رہ گئے۔ اس یکسوئی نے ان کے لئے فن رباعی میں بھی یکتائی و بے ہمتائی کے آثار پیدا کر دیئے اور وہ مصور و خطاط کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب رباعی نگار کی حیثیت سے بھی پہچانے جانے لگے۔

صادقین کی رباعیوں اور اُن کے دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح وہ خطاطی و مصوری کے رموزِ فن اور اُسکی علمی و فنی تاریخ سے واقفیت رکھتے تھے، اُسی طرح رباعی کے وزن کی مشکلات اور نامور رباعی نگاروں کے کمالات سے پوری طرح بہرہ مند تھے۔ انہوں نے رباعی کی ایجاد و ارتقا کی پوری تاریخ پڑھ رکھی تھی۔ اُنہیں معلوم تھا کہ اس فن میں بہت بڑے بڑے شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ رباعی گوئی کے سلسلے میں اپنی کوششوں کو بطور انکسار بہت معمولی ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ کہا کہ

یہ بحرِ رباعی کی ہے ایسی ٹیڑھی
غالب سے بھی ہوگئی تھی لغزش اس میں

تو بے سبب نہیں کہا۔ غالب عظیم المرتبت شاعر تھے اور عروض پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ لیکن جب رباعی کہنے بیٹھے تو ماہرِ فن ہونے کے باوجود ایک رباعی وزن سے خارج کہہ گئے۔ یہ رباعی ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور اُن کے کلام میں شامل ہے۔ رباعی یہ ہے ؎

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

اس کے دوسرے مصرع میں ایک "رک" زائد ہے یار لوگوں نے رباعی کو غلطی سے پاک کرنے کے لئے مصرعے کو یوں لکھ دیا ہے ؎
دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب لیکن ایسا کرنے سے مصرعہ معنوی اعتبار سے بے مصرف ہو گیا ہے۔

ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں بعض اوقات خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی قطعہ و رباعی میں فرق نہیں کر پاتے چنانچہ بڑے بڑوں کے یہاں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جو رباعی کو قطعہ اور قطعہ کو رباعی درج کر گئے ہیں صادقین اس قسم کے ناواقفوں میں نہ تھے وہ قطعہ و رباعی کے فرق کو خوب سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اقبال کے اس نوع کے اشعار

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

رباعی نہیں، دوبیتی کے ذیل میں آتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ رباعی کے برعکس قطعہ کی صنفِ اشعار کی تعداد یا کسی وزن و بحر کی پابند نہیں ہے لیکن رباعی کا وزن مخصوص و متعین ہے اور اس میں صرف دو شعر ہوتے ہیں۔ علامہ سلیمان ندوی کی مشہور کتاب عمر خیام میں دو ایک جگہ یہ چوک ہوگئی ہے کہ انہوں نے رباعی کے فن پر بحث کرتے ہوئے مثال میں قطعات درج کر دیئے ہیں۔
صادقین کی نگاہ سے علامہ کی یہ فروگذاشت گزری ہے اور انہوں نے اپنی ایک رباعی میں اس خامی کو موضوعِ سخن بنایا ہے کہتے ہیں کہ

ہم اُن کی طرف سے اپنے دل میں شرمائیں   وہ اس طرح اس صنفِ سخن کو برمائیں
جب حضرتِ علامہ سلیمان ندوی   دو شعروں کے قطعہ کو رباعی فرمائیں

صادقین نے علامہ سید سلیمان ندوی کے جن دو شعروں کا حوالہ دیا ہے اور جنہیں علامہ نے قطعہ کی جگہ رباعی کے ذیل میں درج کیا ہے وہ فارسی کے ہیں اور اُن کی گراں قدر تصنیف "عمر خیام" میں دیکھے جاسکتے ہیں لیکن صرف علامہ ندوی پر موقوف نہیں رباعی اور قطعہ کی شناخت اور اندراج میں اردو کے متعدد نامور ادیبوں اور ناقدوں نے دھوکہ کھایا ہے۔ دکن میں اردو کے مصنف نصیر الدین ہاشمی نے ولی کے ذکر میں مندرجہ ذیل دو شعروں کو رباعی کا نام دیا ہے۔

مہربانی و لطفِ دلبر یا   سابقہ تھا سو اب نہیں دستا
یا مگر خواب وہ زمانہ تھا   کہ مجھے خواب میں نہیں دستا

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دیوانِ اثر کے مقدمے میں ذیل کے قطعہ کو رباعی لکھا ہے۔

فلک دل کو کب تک جلاتا رہے گا   عجب رنگ یاں کے دکھاتا رہے گا
اگر جانتے ہم تجھے دل نہ دیتے   کہ دل لے کے تو، یوں ستاتا رہے گا

دیوانِ ظفر، جلد چہارم مطبوعہ نول کشور میں ذیل کا قطعہ رباعی کے نام سے مرقوم ہے ؎

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعثِ غم، گن گن کے   شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم، گن گن کے
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں   ہم ظفر اس لئے رکھتے ہیں قدم گن گن کے

مطبع نول کشور کے مطبوعہ دیوانِ ذوق میں بھی اس طرح کی فروگذاشتیں موجود ہیں چنانچہ ذوق کے یہ اشعار ؎

قدم سنبھال کے رکھ راہِ عشق میں اے ذوق   گزرنا اس رہِ دشوار سے نہ آساں ہے
جو کوئی آبلہ پائے جنوں بھی ہے یہاں   ترے ڈبونے کو وہ بھی تنورِ طوفاں ہے

قطعہ کے نام سے درج ہیں، اس طرح کی کمزوریاں قدما سے لے کر آج تک کے شاعروں کے مجموعہ ہائے کلام میں مل جاتی ہیں اور بعض ایسے حضرات کے یہاں بھی مل جاتی ہیں جنہوں نے تخصیص کے ساتھ رباعیاں بھی کہی ہیں، قطعات بھی اور رباعی و قطعہ کے اوزان کے فرق پر مقالات بھی لکھے ہیں۔ مثال میں ممتاز شاعر اور ادیب عبدالمتین عارف کا شعری مجموعہ "آتشِ سیال" مطبوعہ میری لائبریری لاہور ۱۹۶۲ء پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ عارف صاحب کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے جیسا کہ اس کے مقدمے میں خود مصنف نے اسکی وضاحت کر دی ہے (صفحہ ۱۰۷ تا صفحہ ۱۶۸)، "شعلۂ فروزاں" اور "وادی رنگ و بو" کے عنوان کے تحت رباعیاں درج کی گئی ہیں لیکن رباعیات کے ذیل میں سہواً یہ قطعہ بھی درج ہے۔

خوابیدہ رہے درد کا احساس کہاں تک   بہلائے مرے دل کو مری آس کہاں تک
آجاؤ مرے غمکدۂ شوق میں اب تو   کر پاؤں گا، اس وضع کا میں پاس کہاں تک

جاننے والے جانتے ہیں کہ اس قسم کے غلط اندراجات سے قطعات کو رباعیات کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ رباعی کی بحر میں نہیں ہیں،

ان کا اندراج کہیں سہواً اور کہیں عدم واقفیت کی بنا پر رباعی کے تحت کر دیا گیا ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو اس سے انکار ممکن نہیں کہ رباعی کا فن ایک مشکل فن ہے اور اس کے اوزان و بحر کی نزاکت و پیچیدگی کے سبب بڑے بڑوں نے اس کے برتنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب رباعی کا فن اتنا مشکل ہے تو صادقین نے اسے کیوں اپنایا۔ اس کا جواب خود صادقین نے اپنی بیاض کے دیباچے میں دے دیا ہے ان کے نزدیک رباعی کی صنف حقیقتاً یکسر ذاتی واردات کے اظہار کی صنف ہے۔ اس لئے فارسی میں عموماً اہلِ حکمت و اہلِ تصوف ہی نے اسے اپنایا ہے، بعض دوسرے شعرا نے اسے بالعموم مرثیہ گوئی اور برجستہ اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا ہے۔ خود اپنی رباعیوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"میں اپنی رباعی گوئی کو شاعری کب کہتا ہوں۔ یہ تو میرے ذاتی محسوسات، ذاتی نظریات اور اعلانات ہیں جو میں نے ویسے ہی کہنے کی بجائے ہزج اور اخرب کے اوزان میں لکھ دیئے ہیں" (دیباچہ بیاض)

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ

"مضمون کی نفاست، الفاظ کی لطافت اور خیال کی رعنائی۔ اس میں کہاں ہے جو کہ شاعری کی بنیادی شرطیں ہیں۔ اس میں تو زندگی کے متعلق معاشرے کی طرف سیدھے سادے رویے کی بات کی گئی ہے اور اگر یہ منظوم ہو گئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ شاعری ہے" (دیباچہ بیاض)

ان بیانات سے بظاہر یوں لگتا ہے جیسے صادقین نہ تو فنِ شاعری سے واقف ہیں نہ فنِ رباعی نگاری سے۔ لیکن بباطن ایک ایک لفظ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ صادقین شاعری اور فنِ رباعی، دونوں کے رموز و نکات سے واقفیت رکھتے ہیں، یہی واقفیت انہیں ایک کامیاب رباعی نگار بناتی ہے۔ صادقین نے رباعی نگاری سے اپنے لگاؤ کے اور بھی اسباب بیان کئے ہیں ان کے بقول رباعی اور خوشخطی ہمارے ثقافتی پس منظر کی علامات میں ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خطاطی کی ہوئی رباعیاں، آرائشِ در و دیوار کے لئے لگائی جاتی تھیں۔ زیرِ تربیت خوش نویسوں کو ابتدائی مدارج میں، رباعیاں ہی لوح پر خوشخط لکھوائی جاتی تھیں اور بڑے بڑے خطاطوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رباعیاں وصلیوں کی صورت میں گھر گھر نظر آتی تھیں۔ مشاعرے، بڑے بڑے جلسوں اور مجلسوں میں بھی رباعیاں پڑھنے کا رواج تھا۔ شعرا و واعظین بھی اپنے کلام و تقریر کا آغاز عموماً رباعی ہی سے کرتے تھے کسی خاص واقعہ یا حادثہ کو بھی رباعی کی صورت میں اکثر شعرا محفوظ کر لیا کرتے تھے اور اپنی بیاض کی زینت بناتے تھے۔ رباعیات کے موضوعات بھی فرضی و خیالی یا طول طویل نہیں بلکہ واقعی اور مختصر ہوتے تھے اس لئے رباعی کی صورت میں دل کو لبھاتے تھے اور ذہن میں آسانی سے محفوظ ہو جاتے تھے خصوصاً عجم جیسناں میں وہ اپنے جذبات کو الفاظ کا پیکر دینے پر خود کو مجبور پاتے تھے، گویا ان کی شاعری، اپنے سے زیادہ دوسروں کی دلجوئی کے لئے تھی خود کہتے ہیں۔

قدرت نے بنایا ہے مصور اے دوست　　اور ساتھ میں خوشخطی کا ماہر اے دوست
میں محفلِ مہ وشاں میں لیکن اکثر　　کچھ دیر کو ہو جاتا ہوں شاعر اے دوست

یہ تھا وہ ثقافتی پس منظر جس میں صادقین نے آنکھ کھولی اور تربیت پائی تھی۔ اس ماحول اور ماحول سے گہری مانوسیت کے زیرِ اثر صادقین بلا کسی کاوش کے رباعی کہہ لیتے تھے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ خود کہتے نہ تھے رباعیاں خود کو ان سے کہلواتی تھیں اور صادقین انہیں کاغذ پر محفوظ کر لینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔ خود لکھتے ہیں۔

"رباعی گوئی کا سلسلہ جاری ہے، کس لئے جاری ہے؟ مجھے پتہ نہیں لیکن جاری ہے، رباعی گوئی ہونی چاہیئے یا نہیں یہ سوال تو اس وقت پیدا ہو گا جب کرنے نہ کرنے پر اختیار ہو، جب کوئی خیال ناگاناً ذہن میں چمکتا ہے تو رباعیاں لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ گویا بندے کے پاس ایک امانت آسمانی ہوتی ہے۔ اس کو بروئے کار نہ لانا امانت میں خیانت کرنا ہے اور بروئے کار لانا اپنے نزدیک عبادت ہے۔ (بیاض)

صادقین کے قول کی تصدیق ان کی مندرجہ ذیل رباعی سے بھی ہوتی ہے ؎

عاشق کے لئے رنج والم رکھے ھیں شاہوں کے لئے تاج وعلم رکھے ہیں
میرے لئے کیا چیز ہے میں نے پوچھا آئی یہ صدا لوح و قلم رکھے ہیں

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صادقین نے تفریحاً یا رسماً رباعیاں نہیں کہیں بلکہ دُرونِ خانہ کے ہنگاموں سے مجبور ہو کر کہی ہیں یعنی ان کی رباعیاں دراصل ان کی واردات قلبی اور امورِ ذہنی کی فطری تصویریں ہیں۔ انہوں نے شہرت کے لئے رباعیاں نہیں لکھیں شہرت کے لئے تو ان کی مصوری وخطاطی ہی بہت کافی تھی بلکہ کافی سے بھی زیادہ تھی۔ البتہ جو باتیں مصوری اور خطاطی کے ہاتھوں اُن کے فن کا حصہ بننے سے رہ گئی تھیں اور جو مصوری میں راہ نہیں پا رہی تھیں، اُنہیں رباعی کا روپ دیا گیا ہے۔ رباعی ان کے نزدیک مختلف فنون کے ملاپ سے ایک اور تخلیقی وحدت' تیار کرنے کی کوشش ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ اُن کی رباعیاں جو کہ عام طور پر کسی واقعہ یا موضوع کے سلسلے میں بدیہہ گوئی یا برجستہ گوئی کا نمونہ ہیں اس لئے حد درجہ سادہ ہیں لیکن یہ سادگی۔ حسن وتاثیر سے خالی نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ فنونِ لطیفہ میں صنعت گری کے نہیں فنکاری کے قائل ہیں۔ الفاظ سے زیادہ خیال اور جذبے کو اور اس کے برجستہ اظہار کو اہمیت دیتے ہیں، بیاض میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ "میں شراب میں مینائے زرنگار، طشتِ طلائی اور جامِ بلوریں کے اہتمام کا قائل نہیں ہوں' اچھی ہونی چاہئیے خالص اور سچی ہونی چاہئیے بیشک مٹی کے پیالے میں ہو" یہی روش انہوں نے رباعی گوئی میں بھی اختیار کی ہے۔ سیدھے سادے اور صاف ستھرے لفظوں میں بڑی اچھی اور خوبصورت باتیں کہہ دی ہیں۔

صادقین کی رباعیوں کی شانِ نزول میں وہ محرکات بھی شامل ہیں جن کا تعلق صادقین کی صوفی منشی اور رندِ مشرب کے مشاغل وذاتی تجربات سے ہے۔ بعض رباعیوں میں معاشرے اور معاشرے کے مختلف طبقات ورجحانات کے بارے میں ان کے اپنے نظریوں کا اعلان بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کی رباعیوں کا لب ولہجہ رومانی ہے اور موضوع و مواد بھی رومان پرور ہیں چنانچہ ان کے یہاں بیشتر رباعیاں ایسی ہیں جو ماہ وشوں اور زہرہ جبینوں کے جھرمٹ میں کسی کے معصوم تقاضوں اور کسی کے بامعنی اشاروں پر کہی گئی ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان کی یہی رباعیاں شعری محاسن کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہیں۔ چند رباعیاں بطور مثال نقل کی جاتی ہیں ؎

ہر حرف میں مہ پاروں کے قد بنتے ہیں لوحوں پہ وہ اک حُسن کی حد بنتے ہیں
کاکل کے خیال ہی میں لکھتا ہوں میں لام ابرو کے تصور ہی میں مد بنتے ہیں

کب ہئیتِ دوجہاں پہ لکھتے ہم ھیں کب صورتِ لامکاں پہ لکھتے ہم ھیں
یہ جو ہیں، رباعیاں ہماری اے دوست فرمائشِ مہوشاں پہ لکھتے ہم ھیں

جب ہم پہ کرم ماہ وشاں کرتے ھیں اور دل کی ہر اک بات پہ ہاں کرتے ہیں
بس ایسے ہی لمحات میں دل کس شہ سے ہم شکرِ خدائے دوجہاں کرتے ھیں

آتے ہیں حسیں، ہاتھ میں پھول ہوتا ہے روزانہ کوئی تحفہ وصول ہوتا ہے
صورت میں حسینوں کے کرم کی، ہم پر اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

معمورۂ فن کی کھڑکیاں ہیں روشن اس شوخ کی دل میں انگوٹھیاں ہیں روشن
رُخ اُس کا چھوا ہے جب سے میں نے شمعوں کی طرح سے انگلیاں ہیں روشن

مندرجہ بالا رباعیات کی رومانی فضا سے صاف ظاہر ہے کہ صادقین سے رباعی کہلوانے میں ان کی مصوری اور مصوری کے

مروش شیدائیوں کا خاصا دخل رہا ہے۔ ماہ وشوں کی طرف سے تصویر بنوانے کی فرمائش اگر خشک اور بے جان لفظوں میں ہوتی تو ممکن ہے صادقین اُسے نظرانداز کر جاتے، لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ اصل صورت یہ تھی کہ ماہ وشوں کی جانب سے یہ فرمائش التفات ارزانی کے ساتھ ہوتی تھی۔ اور جب صادقین اُن کی فرمائش کی تکمیل کر دیا کرتے تھے تو صنفِ نازک کے خوب رو مداحین جذبہ سپاس گزاری کے تحت اپنی ساری جلوہ سامانیوں کو صادقین کی نذر کر دیا کرتے تھے یہ نوازش اُن کے لئے رباعی گوئی کے لئے ایک طاقتور محرک بن جاتا تھا لیکن صادقین کو یہ دل آویز ماحول یک بیک بے سبب میسر نہیں آیا۔ اس کے حصول میں صادقین کو اذیت ناک طویل راستوں سے گزرنا پڑا ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

ہر چند کہ نازوں کا پلا ہوں اے دوست	میں آبلہ پا، دل جلا ہوں اے دوست
کھلتے ہوئے اک پھول کا جلوہ کرنے	کانٹوں پہ کئی کوس چلا ہوں اے دوست

گویا برسوں کی آبلہ پائی اور دشت پیمائی کے بعد صادقین کی صوفی منشی اس بلند و معتبر مقام پر پہنچی ہے جہاں دوست ہی نہیں دشمن بھی، دل نوازی و لطف ارزانی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بندگانِ خدا کے حق میں اس کے وجود کو رحمتِ یزدانی خیال کرنے لگتے ہیں۔ اس کے قرب کو طمانیتِ قلب و روح کا وسیلہ سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے فراق کو دل و جان کے لئے عذاب گردانے لگتے ہیں۔ ایسے میں اگر صادقین جیسا راہِ عشق کا مسافر اور رندِ صوفی صافی علیہ اپنے عقیدت مند ماہ وشوں کے جھرمٹ میں گھر جائے اور خوب رویان جہاں اس کے گوشۂ تنہائی کو انجمن اور اس کی کٹیا کو رشکِ ارم بنا دیں تو چنداں تعجب نہ کرنا چاہیئے بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ صادقین نے اس بزم آرائی کو تصویر میں نہیں لفظ کے صوتی آہنگوں میں اس طرح ڈھال دیا کہ وہ اردو رباعی کی تاریخ کا حصہ بن گئی۔ صرف چند رباعیاں دیکھیے ؎

کل اس نے فقیروں کی مدارات جو کی	کٹیا میں یہیں، ساتھ بسر، رات جو کی
اس رات کی واردات، اللہ اللہ	سو باتوں کی اک بات تھی وہ بات جو کی

وہ حسن نمایاں ہے بدن سے تیرے	ہر چیز درخشاں ہے بدن سے تیرے
اک تو جو نہ ہوتی، تو اندھیرا ہوتا	خلوت میں چراغاں ہے بدن سے تیرے

کس ناز سے نازوں کی پلی آتی ہے	بن کر وہ یہاں نقشِ جلی آتی ہے
شاید کوئی تصویر ہے، زندہ ہو کر	غاروں سے اجنتا کے چلی آتی ہے

اک عالمِ گل فشاں ہے جس میں، میں ہوں	اک حلقۂ مہ وشاں ہے جس میں، میں ہوں
ہاں چاند ستاروں کی نہیں ہے، اے دوست	مکھڑوں کی یہ کہکشاں ہے جس میں، میں ہوں

یہ فضائے خوشگوار جس کا ذکر اوپر آیا ہے اور جس میں صادقین نے رباعیاں کہی ہیں، ان پر کس طرح اثرانداز ہوتی ہے۔ اسے انہوں نے کس طرح برتا ہے، اس کی کیا غرض و غایت رکھی ہے اور آخر آخر ان کی خلاقی و فنکاری نے ان کو کس نوع کا سرمایۂ حیات فراہم کیا ہے اور یہ سرمایہ انہیں کتنا عزیز رہا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات بھی کہیں اور نہیں بلکہ صادقین کی رباعیات ہی میں ملیں گے۔ صرف دو رباعیاں دیکھیے ان میں صادقین کے فن کی غایت و حاصل دونوں کی جھلک نظر آ جائے گی۔ ؎

ہم حسن پرستی کے قرینوں کے لئے	ہو جاتے ہیں معتکف مہینوں کے لئے
تصویر بناتے ہیں خود اپنی خاطر	اور شاعری کرتے ہیں حسینوں کے لئے

کاغذ کے وہ پُرزوں پہ لکھے نکلیں گے   کونوں پہ وہ تھوڑے سے مُڑے نکلیں گے
تم میری اگر جامہ تلاشی لوگے   دو چار حسینوں کے پتے نکلیں گے

جیسا کہ عرض کیا گیا صادقین کے یہاں، اس نوع کی رومانی رباعیات بکثرت ہیں اور بعض بہت خوبصورت ہیں ہر چیز کے موضوع اور تاثر کی تکرار بعض جگہ گراں گزرتی ہے۔ لیکن طبیعت کو مکدّر کرنے والی بے رنگ یک رنگی کہیں نہیں ہے۔ انہوں نے، میر انیس کی طرح، ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس لئے موضوع کا تنوع نہ سہی بیان کا تنوع بہرحال لطف دیتا ہے۔ صادقین کا خیال ہے کہ "کسی شے کا جمالیاتی مشاہدہ ہر زاویے اور ہر پہلو سے کرنا چاہیئے اور رخ و نیم رخ کے درمیان جتنی بھی صورتیں ہیں وہ بھی مشاہدے میں آنی ضروری ہیں۔ ایک ہی بنیادی خیال یا دوشیزۂ خوبرو کو، امکان بھر مختلف طریقوں سے بال بنا کر، مختلف رنگوں کے مختلف النوع لباس پہنا پہنا کر، مختلف زاویوں سے دیکھنا چاہیئے۔ یہ وہ تکرار ہے جو قوالی میں ہوتی ہے جو قوالی کے آداب و حسن سے ناواقف ہیں وہ اِس تکرار سے لطف نہیں اٹھا سکتے۔ یہ تکرار عیب نہیں حسن ہے۔" (بیانی)

صادقین کا خیال صحیح ہے، تکرار اُسی وقت عیب قرار پاتی ہے جب وہ بھونڈی، ناحق بے موقع اور تقلید محض ہو۔ ایسی تکرار جو کلام کے "الگ روپ" اور اُس کے حسن و تاثیر میں اضافے کا باعث ہو، ہنر کہلاتی ہے۔ صادقین کے یہاں تکرار کی یہی صورت ہے۔ وہ ایک موضوع کو سو طرح سے نظم کرتے ہیں اور ہر ایک میں سو رنگ بھر دیتے ہیں۔ اُن کی قوت متخیلہ اور قوتِ تخلیق، ایسی غیر معمولی کہ مصوری ہو یا خطاطی، نقاشی ہو یا شاعری وہ جس ذرّے یا قطرے کو ہاتھ لگاتے ہیں صحرا و دریا جیسی وسعت و حیرت زائی پیدا کر دیتے ہیں۔ موت نے قبل از وقت صادقین کو ہم سے چھین لیا ورنہ اگر کچھ دنوں اور رہتے تو ان کا خلاق ذہن، فنونِ لطیفہ کی اور نہ جانے کتنی چوٹیوں کو چھونا اور حسن کے نہ جانے کتنے پیکروں کو جنم دے کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

مجھ میں ہی نہ تھی اِک خوئے قناعت ورنہ   مولیٰ نے تو بندے کو دیا تھا کیا کیا

کاش ایسا ہوتا کہ خیام کی طرح صادقین کو بھی کوئی فٹز جیرالڈ مل جاتا، اور انگریزی زبان میں اُن کی رباعیات کا فٹز جیرالڈ کے طرز کا منظوم ترجمہ ہو جاتا۔ ساری رباعیوں کا نہ سہی منتخب رباعیوں کا سہی۔ مجھے یقین ہے کہ صادقین کا مترجم گھاٹے میں نہ رہے گا ترجمہ اگر بھرپور ہوا تو صادقین کے ساتھ مترجم بھی زندۂ جاوید ہوگا۔

نمبرا فارسی کا مشہور شعر ہے۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی   صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامی

حالات کی گردش سے بڑی ہے تشویش   دل رکھنے کی کوشش سے بڑی ہے تشویش
کل جس کے تغافل نے کیا تھا بے چین   آج اُس کی نوازش سے بڑی ہے تشویش

صفحہ ۱۸۵ کا باقی

ج:۔ میں ان سے اتفاق نہیں رکھتا میرا اصلی فن تصویریں بنانا ہے ضمنی فن میں خطاطی شامل ہے۔

س:۔ بعض حلقے آپ پہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ عظیم خطاط ہونے کے باوجود عملی طور پہ اسلامی شعائر کے مطابق زندگی نہیں گزارتے۔؟

ج:۔ اگر شرافت سے زندہ رہنا اسلام ہے تو پھر مجھ سے بڑا مسلمان کون ہوگا؟ اہلِ دنیا اگر مفاد پرستی کے لئے اپنے حجروں میں بیٹھ کر الزام لگائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں ان چیزوں سے ماورا ہوں۔

خاطر غزنوی

صادقین کی شاعری

صادقین پاکستان کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک کا نام ہے، جو عالمی سطح پر پاکستان کی پہچان اور اس کی عزت و حرمت کا ایک جزو لازمی ہے،
وہ بین الاقوامی برادری میں خطوط کی نزاکت، حسن، دلآویزی اور قوت کی وجہ سے ان کی آنکھوں کا نور اور اسلامی دُنیا میں اپنی خطاطی کی پاکیزگی، رفعت، تنویر اور قرآنی آیات کے مبلّغ کے طور پر دلوں کا سرور ہے۔
اُن کی تیسری خصوصیت اور اہمیت شاعری ہے، اور شاعری بھی ایک ایسی صنف جو خیام سے بابا طاہر، سرمد اور انیس سے جوش اور فراق تک فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں چند شعراء تک محدود ہے کہ اس کا فن جانکاہی، مہارت، خداداد صلاحیت کا طالب ہے، کہنے کو تو کئی شعراء نے رباعی کہی لیکن حقیقی رباعی کہنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔
رُباعی چار مصرعوں کی ایک مختصر ترین نظم ہے لیکن اس میں عقل و دانش، پند و اخلاق، جذبات و تاثرات، رنگ و نور اور جذب و مستی کا ایک عالم پنہاں ہوتا ہے، خیام کی رباعی خمریات کا لازوال تحفہ ہے جو اس وقت تک تازہ و زندہ رہے گا جب تک فارسی زبان زندہ ہے یا فٹنز جیرالڈ کی ترجمے والی زبان دُنیا میں بولی اور سمجھی جاتی رہے گی۔
انیس کی رباعی عقیدت و اخلاق کے حسن کی مدح سرائی کرتی ہے، جوش کی رباعی میں حقیقت کی شان و شوکت و جلالت کارفرما ہے، فراق نے رباعی میں گیتوں کا ترنم اور محبوب کے روپ کی رنگینیاں اور جنس کے رنگوں کی پھواریں تخلیق کی ہیں۔ امجد نے تصوفانہ اور عارفانہ رنگ کی رباعی کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔
ضیا جعفری کے ہاں جذب و مستی اور والہانہ پن کی لذت ملتی ہے، رباعی کے ان گوناگوں رنگوں اور مختلف اور منفرد گوشوں کے محدود انداز میں سامنے آنے کے بعد محسوس ہوتا تھا کہ رباعی جدید ترد ور میں دم توڑ دے گی۔
لیکن صادقین کی رباعیات کا ۱۳۹۰ ہجری کا "کائنات کی جلد" کا پہلا مجموعہ، پھر ستمبر ۱۹۷۱ کا دوسرا مصور مجموعہ، تیسرا ۱۳۹۸ ہجری کا "ایک رات میں تخلیق، ترتیب اور طباعت کے مراحل طے پانے والا مجموعہ" اور آخر آخر چوتھا "ذبلیس" مجموعہ جدید رباعی کی دنیا میں ایک خوشگوار انقلاب کی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے۔
صادقین کو بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم مصور اور عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم کے بعد دوسرا عظیم پاکستانی مصور تسلیم کیا، جنہوں نے خطوط کی دنیا میں اپنا سکہ منوایا۔ صادقین کی خطاطی اور مصوری کے رنگ فضاؤں میں اس طرح پھیل گئے کہ کم تر لوگوں کی توجہ اس کی رباعی کی طرف مبذول ہوسکی، آپ کو حیرت ہوگی کہ ہزاروں کی تعداد میں اس کی رباعیوں کے مجموعوں کی فروخت کے بعد بھی پاکستان میں ادب سے دلچسپی لینے والوں کو تو چھوڑیئے بعض شعراء کو بھی ان کی رباعی گوئی کا علم

نہیں، ایسے لوگ صادقین کو صرف اس کے برشوں اور مارکروں کے کمال کی بدولت جانتے ہیں۔ گویا صادقین کی مصوری ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئی ہے، شاید یہی سبب تھا کہ اس نے رباعیات کا دوسرا اور چوتھا مجموعہ مصور کر کے چھپایا، لیکن بدقسمتی سے شعرا اور ادب سے دلچسپی لینے والے مصوری کی کتابوں کی قیمت کی تاب نہیں لا سکتے اور اسی لئے شاعری کی اس قدیم صنف میں جدید ترین رجحانات اور جدید ترین دور کی تنقید کی حامل نئے انداز، نئی ڈکشن اور نئے لہجے کی رباعی کے مطالعے سے محروم ہو گئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رباعی گو صادقین بالکل ہی پردۂ فراموشی کی نذر ہو گیا وہ اکثر ادبی حلقوں میں نہ صرف متعارف ہو چکا ہے بلکہ اپنی انفرادیت، بیباکی، کلمۂ حق کہنے کی جرأت کے سبب مقبول و محبوب ہے، اور شعرا ایک عظیم مصور کو اپنے علاقے میں چہل قدمی کرتے دیکھ کر فخر محسوس کرنے لگے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصور صادقین جو اپنے خطوط کی سیڑھیوں سے آسمان پر جا پہنچا جس نے اپنے رنگوں سے ایک فضائے بسیط اور دنیائے رنگین تخلیق کی، خطاط صادقین جس نے حروفِ ابجد کو جو کڑیوں میں گرفتار ہو کر زبان و مفہوم بنتے تھے، آزادی کی فضا بخشی۔ وہ شاعری اور پھر شاعری میں رباعی جیسے مشکل فن کے کوچے میں کس طرح آن پہنچا؟ یہ انکشاف بڑا دلچسپ اور بڑا حیران کن ہے اور اس میں اس عظیم مصور، خطاط اور شاعر کے اعترافات کی آمیزش اس کو تخلیقی صداقت اور صداقتِ تخلیق کا درجہ دیتی ہے۔

منحنی جسم، لانبے قد، سوچتی آنکھوں والا یہ عجیب لطرفین سید امروہہ میں پیدا ہوا جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں دوسری تہذیبی علامات کے علاوہ رباعی سے بھی مڈبھیڑ ہوئی۔ اس معاشرے میں آرائش در و دیوار وصلیوں سے ہوتی تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی صادقین حرف آشنا بھی نہ ہوا تھا لیکن ان آرائشی قطعات میں ان چار مصرعوں کی ماہیت، ساخت اور پیکر اپنے مختصر لیکن متوازن حسن سے نظر نواز ہوتا تھا، صادقین پر خوشنویسی کے یہ نمونے اثر انداز ہوئے، ان رباعیات کی مستطیل اور ترچھے انداز میں نشست و برخواست کچھ تصویری پیکر تراشی کا کردار ادا کرتی تھی بچپن کے ذہن نے خطاطی کے حسن اور پیکر کی لذتیں حاصل کیں۔ باوجود اس حقیقت کے کہ ابھی اس نے لکھنا پڑھنا شروع ہی نہ کیا تھا، اس نے ان رباعیات کا عکس کاغذ پر اتارنا شروع کیا، وہ بچہ جو ابھی ابجد شناس بھی نہ ہوا تھا۔ پڑھنا نہ جانتا تھا۔ لکھنا جان گیا، لفظوں کی نقل رباعی نویسی کی صورت میں اس عظیم مصور کی زندگی میں سب سے پہلے داخل ہوئی، اور یہ سب کچھ اس کے گھر کے ماحول کی دین تھی یہ اس سن و سال کا دور تھا جب حافظے کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ صادقین کا مشغلہ تختی پر رباعی لکھنا، پھر تختی دھونا، پھر رباعی لکھنا معمولاتِ شب و روز میں شامل ہو گیا۔ بزرگ بھی شعر و شاعری، خوش نویسی اور موسیقی کے دلدادہ تھے، یہی سبب تھا کہ گھر کی زینت دوز الماریوں میں قلمی کتابیں اور شعرا کے قلمی دیوان ہوتے تھے، اور یہ دواوین بزرگوں کی خوش خطی کے نمونے تھے، اس ماحول میں عام طور پر رباعیاں رٹوانے کا قاعدہ بھی تھا اہل تشیع میں انیس و دبیر کی رباعیات بچوں کو بھی یاد کرائی جاتی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ادب کی کسی صنف کا وہ نام تک نہ جانتا تھا لیکن رباعی سے واقف تھا۔

اس صنف پہ عاشق تھا گواہی دو نجوم
تختی پہ لکھا کرتا تھا جب تھا معصوم
طفلی میں رباعیاں کئی تھیں مجھے یاد
کیا لفظ غزل ہے یہ نہیں تھا معلوم

بچپن میں تجھے یاد کیا تھا میں نے
جب شعر کا کب لفظ سُنا تھا میں نے
اس پر نہیں موقوف رُباعی!! تجھ کو
ہر روز ہی تختی پہ لکھا تھا میں نے

گویا تین سال کی عمر ہی میں خوش خطی کا ذوق اس کے خمیر کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہوگیا، وہ حروف ابجد کو تحریر نہیں بلکہ تصویر سمجھ کر نقل کرتا رہا پھر وقت آگے بڑھا اور ایک ایسا موڑ آیا کہ وہ رباعیوں کے مصرعے خود ہی موزوں کرنے لگا سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ رباعی کے وزن پر اس قدر حاوی ہوگیا کہ کوئی مصرعہ وزن سے خارج نہ ہوتا،

شب میری تھی، شام میری دن تھا میرا ، آیا ہوا خود مجھ پہ ہی جن تھا میرا
کتنی ہی رباعیاں تھیں لکھ کر پھاڑیں ، اٹھارہ برس کا جبکہ سن تھا میرا

اس عمر میں صادقین رباعی کا صاحب دیوان شاعر بن چکا تھا، اس زمانے کا اس کی رباعیات کا قلمی نسخہ اب بھی محفوظ ہے، یہ اس کی زندگی کا وہ دور تھا جبکہ اس نے مختلف فنی مشاغل یعنی خاکہ کشی، نقشہ نویسی، کتاب سازی، تصویر کشی اختیار کر رکھے تھے اس سے محبت کرنے والوں کے لئے یہ ایک دلچسپ انکشاف ہوگا کہ اس دور میں صادقین نے اسکول کی مختلف کتب خود اپنے ہاتھ سے لکھیں اور ان پر دلچسپ تصاویر بھی بنائیں وہی خود نوشتہ کتب اس کے پڑھنے اور مطالعے میں رہتیں، اس کے ہم جماعت اس کی ان فنی خصوصیات کے قائل اور ان سے مرعوب تھے اور خود بھی کتابیں نقل کرنے کی فرمائشیں کرتے رہتے۔ یہ صرف اردو، فارسی اور عربی تک محدود نہیں تھا وہ انگریزی جیومیٹری کی کتاب اور اٹلس تک خود اپنے لئے تیار کرتا اس کے اس دور کے کئی تخلیقی کلام کے مجموعے ضائع ہوگئے لیکن رباعیات بقول اُن کے "فقیر صادقین کی انیس سال تک کی عمر کی باقیات جو ضائع ہونے سے رہ گئیں اور حادثاتی طور پر دستیاب ہوئیں" اس نے ان بوسیدہ اجزا کو ترتیب دے کر چھپوا ڈالا،

دوسری اصناف کے مقابلہ میں رباعی سے محبت اور عشق کے پیچھے جناب صادقین کا ایک نظریہ کارفرما ہے۔

اک میرا خیال ہے، یہ ممکن ہے ہو خام
یہ میری نظر میں ہے رباعی کا مقام
اصنافِ سخن میں، یہ تو یوں ہے جیسے
پانی کے گھڑوں کے آگے مے کا اک جام

ہاں کھینچ کے اک اور ہی فن میں لائی
جو میرا نہیں، ایسے چمن میں لائی
ایسی صنفِ رباعی سے محبت مجھ کو
کل شام مدینۂ سخن میں لائی

رباعی کی تخلیق فن سے پہلے اور بعد میں وہ رباعی کی تحریر خطاطی کا فن اپنائے رہا، اس راستے سے وہ مصوری کی جانب آیا، اور اس نے اپنے آپ کو تلاش کرنا شروع کیا، اپنے آپ کو وہ لکیروں کی زبان دینے لگا لیکن درمیان میں معاملہ بندی اور محفل آرائی کے ذوق کے نتیجے میں بیچ بیچ میں رباعی بھی نازل ہوتی رہی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات عروج پر تھیں۔ غالب کے دیوان کی خوش نویسی "ر" کی ردیف تک پہنچی تھی، کہ نہ جانے "یار سے چھیڑ چلی جائے" کے طور پر یا غالب کی ۲۳ رباعیوں کی خالص ذاتی نوعیت سے شہہ پاکر انہوں نے کئی رباعیاں کہہ ڈالیں، یہ ستمبر ۱۹۶۹ کی بات ہے۔

پھر ایک خوشگوار سال محفل عرفانی و روحانی میں بیٹھے بیٹھے فی البدیہہ رباعیوں پر رباعیاں ہونے لگیں، پھر رباعی کا تخلیقی بہاؤ اور ریلہ مسلسل پانچ ماہ تک چلتا رہا گویا یہ پانچ ماہ کی ایک نشست تھی، جس میں بارہ سو رباعیاں تخلیق ہوئیں۔

صادقین کا کہنا ہے کہ اسے اپنی ابتدائی رباعی گوئی کے زمانے کے بزرگوں کا قول یاد آرہا تھا کہ شاعر کو چالیس برس سے پیشتر رباعی نہیں کہنی چاہیئے، چنانچہ چالیس برس کی عمر میں رباعی کہہ کر اس نے اپنی سالگرہ منائی۔

رُت تھا جو جمال ہے منایا میں نے
اک جشنِ وصال ہے منایا میں نے
اس عمرِ عزیز کا، رباعی کہہ کر
چالیسواں سال ہے منایا میں نے

جاگا ہوا رہ کے سو چکا ہوں اس سال ، اک عمر تھی جس کو کھو چکا ہوں اس سال
اب کیوں نہ رُباعیاں بھی کہہ کر دیکھوں ، چالیس برس کا ہو چکا ہوں اس سال

لیکن چالیس سال کی بلوغت کے ساتھ ایک اور جذبہ بھی کارفرما تھا جس نے اسے رباعی کی طرف متوجہ کیا، اور اس کا اظہار صادقین نے اس رباعی میں کیا ہے۔

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

تجربات کا خام مال تو اس کے پاس تھا ہی، تخلیقی عمل کے لئے ذہن آزمایا جا چکا تھا تخیلات کا ذخیرہ وافر تھا یہ جنوں کی سی کیفیت اور پانچ ماہ کا ارتکاب مل رہا تھا فروری ۱۹۷۰ء میں رات دن ان رباعیات کی خوش خطی اور ترتیب جاری رہی، اور پھر ستمبر ۱۹۶۹ سے جنوری ۱۹۷۰ء تک کی یہ تخلیقات قرطاس پر مستقل طور پر مرتسم ہوگئیں۔ ان کا خیال ہے کہ

"الوان و خطوط پر چاہے کتنا ہی قابو کیوں نہ ہو، پھر بھی الوان و خطوط کی زبان محدود ہے، بہت سے جمالیاتی، کائناتی یا اخلاقی تجربے اس کے ظرف میں پوری طرح نہیں سما سکتے، لہٰذا

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

کے چکر میں رباعی گوئی کی دنیا میں بغیر سوچے سمجھے داخل ہوگیا لیکن پھر اس کوچہ میں شعوری طور پر اور سوچ سمجھ کر طبع آزمائیاں شروع کردیں"

رباعیات کا یہ پہلا مجموعہ ثبات کی جلد کا تھا، گویا صادقین کی درویشی کا خرقہ اس کی کتاب نے بھی پہنا، پھر دوسرا مجموعہ ان رباعیوں کی صوری تشریح لکیروں کی زبان میں کر رہا تھا، یہ مجموعہ اُن غیر ملکیوں نے بھی خریدا جو اردو زبان اور ادب سے ناآشنا تھے۔ بقول صادقین کے یہ کتاب "حسن معنی نہیں، حسن صورت کے زور پر بکی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن معنی بھی صادقین کا تھا اور حسن صورت بھی اسی کے موقلم کا فیض ۔۔۔

اس نے اپنے نظریہ فن کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی" مصوری ہو یا خطاطی یہ انسانیت کو آگے بڑھانے کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے"۔ چنانچہ آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کی راہ میں جو طاقتیں مزاحم ہوئیں، ان کے خلاف اس نے اعلان جنگ کیا۔ یہ نظریہ مصوری اور خطاطی دونوں پر یکساں حاوی ہے، چنانچہ اس کا جہاد منافقین کے خلاف بھی تھا اس نے منافقین کی اقسام وضع کیں، اور تین قسمیں بتائیں۔ اوّل دین و ایمان کا منافق، دوم سماجی اور معاشرتی منافق۔ تیسرا علم و دانش کا منافق ـــــــ

پہلی کتاب کے اس حصے میں جہاں اس نے دین و ایمان کے منافق کو بے نقاب کیا ہے، اس کا عنوان رکھا ہے۔ ـــــ "بیچ چوراہے پر ننگا ناچے"

اس عنوان کی رباعی یوں ہے

اس شان سے میں جو سربکف ہوں ننگا
ہاں ڈھیٹ ہوں اے اہل شرف ہوں ننگا
اے بزم سادہ پوش! تجھ میں اک میں
بالکل ہی برہنہ ہوں، الف ہوں ننگا

پھر اس حصے میں برہنگی کے حوالے سے منافقوں کے جو لتے لئے ہیں وہ ہماری رباعی کی صنف میں بیباکی، جرأت مندی اور انفرادیت کا شہکار ہے۔

ننگا ہوں، نمائشی اُتاری پوشاک ، تم ڈالے ہوئے تن پہ ہو بھاری پوشاک
لیکن میں ہوں اندرونِ ہستی ملبوس ، بیرونِ وجود ہے تمہاری پوشاک

معاشرتی منافق اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جماعت کا زیاں کرتا ہے، اور معاشرے میں کامیاب فرد کہلاتا ہے وہ قوم کی خاطر قربانی نہیں دیتا، اپنے مفاد کے لئے قوم کے مفاد کو قربان کرتا ہے، صادقین نے اس نوع کی رباعیات میں خود کلامی، MONOLOGY سے کام لیا ہے

اس خلوتِ سنجاب میں جو کچھ میں ہوں ، ہاں، مخمل و کمخواب میں جو کچھ میں ہوں
خود سے بھی چھپا رہا ہوں تم تو کیا ہو ، اس پردۂ آداب میں جو کچھ میں ہوں

ہاں دین تو کیا چیز ہے، کیا ہے ایمان
کیا چیز اُصول ہیں تو کیا ہے بُرہان
میں اپنے ذرا سے فائدے کی خاطر
ساری ہی برادری کو کر دوں قرباں

قدموں میں ہوں، جب جام نکل جائے گا ، فہرست سے، یہ نام نکل جائے گا
بُرسوں اِسے پہچانوں تو میں ہوں کافر ، کل اس سے مرا کام نکل جائے گا

ایسا منافق معاشرے کا کامیاب آدمی کہلاتا ہے، ایسی شخصیت کی خود کلامی میں چند ایسے اور چہرے دیکھئے، جنہیں ہم "ضد شخصیت" یا ANTI HERO کہہ سکتے ہیں۔

کیوں اُتری ہوئی، کون ہے؛ میں نے پوچھا ، موسیٰ ہے کہ فرعون ہے! میں نے پوچھا
آئینے میں کل عکس جو دیکھا اپنا ، آئینے میں یہ کون ہے؟ میں نے پوچھا

ANTI HERO کے برعکس حقیقی ہیرو کی جھلک بھی رباعیوں میں ملتی ہے ایسی رباعیات مقتل نامہ کی زینت ہیں۔ یہ وہ رباعیاں ہیں جو منصور کی روایت کی عکاسی کرتی ہیں۔

خود رکھ کے ہتھیلی پہ جو سر لایا ہوں ، نصرت کا پھریرا ہوں کہ لہرایا ہوں
محبوب کے تخلیئے میں جیسے پہونچا ، اس شان سے مقتل کی طرف آیا ہوں

معیار پہ دل اپنا پرکھ کر لائے ، جو عشق کی لذّت ہے وہ چکھ کر لائے
مقتل میں وہ جلّاد نے بغلیں جھانکیں ، ہم سر کو ہتھیلی پہ جو رکھ کر لائے

گردن تو اُڑا دے گی ہوائے خنجر ، ہاں خون بہا دے گی ہوائے خنجر
لیکن جو چراغ دل ہے روشن اُس کو ، کس طرح بجھا دے گی ہوائے خنجر

اب آئیے منافقوں کی تیسری قسم کی جانب، علم و دانش کا منافق۔ اس موضوع کی رباعیات کا عنوان

رباعیاتِ صادقین مست ملنگ
رباعیاتِ صادقین ننگ دھڑنگ

ہے۔ پہلی کتاب میں علم و دانش کے منافق کا بیان اور اس کا ردعمل قابل غور ہے، جب وہ بڑے عالموں کا ذکر کرتا ہے تو دوسروں کو مرعوب کرتا ہے لیکن صاحب ایمان سوچتا ہے کہ اگر وہ کسی بہت بڑے فلسفی کی بات سنے گا تو وہ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی اس سے تو کسی محبوبہ کے دو بول میری سمجھ، میرے خیالات اور میری ذہنی سطح کو دلکشی بخشیں گے، یہ صاحب ایمان ہے کہ جو محسوس کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ یہ منافق نہیں۔ لیکن منافق وہ ہے جو چباتے ہوئے جملے اور تراکیب یعنی CLICHE رٹ کر اپنی منافقت کا بھرم رکھتا ہے۔

صادقین نے ایسی کیفیات کا مطالعہ بھی بغور کیا۔ اور بڑی بڑی نامور ہستیوں میں سُقم نکال کر لایا، مثلاً علّامہ سلیمان ندوی جیسے جید عالم نے کسی کا قطعہ لکھا اور اسے رباعی کا نام دیا حالانکہ بحر کے لحاظ سے بھی وہ رباعی

کے ذیل میں نہ آتا تھا اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ سہو کاتب کا نہیں :

ہم اُن کی طرف سے اپنے دل میں شرمائیں — وہ اس طرح اس صنف کے دل کو بڑھائیں
جب حضرتِ علامہ سلیمان ندوی — دو شعروں کے قطعے کو رباعی فرمائیں

علامہ نے یہ لکھا کہ اردو غزل کا فائدہ ہی کیا ہے کہ اس میں حسن و عشق کے مضامین کے سوا کچھ ہے ہی نہیں
یعنی مراد معاملہ بندی تھی۔ صادقین نے کہا کہ مینائے غزل میں غزالوں اور غزالی آنکھوں کا ہی ذکر ہو جبکہ علامہ یہ چاہتے
تھے کہ غزل میں بقراط کی باتیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز کا اپنا ظرف ہے، شیشے میں پتھر ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے
وہ اپنی زیر طبع کتاب رباعیات صادقین مست ملنگ کے صفحہ ۴۴ پر اسی بات کا تذکرہ کرتا ہے، اور علم و دانش کی
منافقت کی واشگاف الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔

اس میں تو ہیں موسیقیِ ناہید کے بول — تو اس میں نہ افکارِ فلاطوں کو ٹٹول
گر حسن پرستی سے شغف تجھ کو نہیں — تو میری کتاب کو اب آگے نہ کھول

علامہ سلیمان سے یوں مخاطب ہوتا ہے

گر حسن و عشق کی یہ باتیں ہیں جنوں — تو پوچھتا ہوں بعد سلام مسنوں
اے حضرت علامہ سلیمان ندوی — فرمائیے پھر غزل میں کیا ہوں مضموں

اور اس رباعی میں تلمیح کا لطف اٹھائیے۔

یہ تو نہیں فلسفے کی گھاتوں کے لئے — یہ تو ہے خطبہ جیسی ذاتوں کے لئے
شبلی کے یہ شاگرد سے کہہ دو کہ غزل — ہے حسن اور عشق ہی کی باتوں کے لئے

کیوں ان میں فلاطوں کے مقالوں کی ہو بات — کیوں ان میں ارسطو کے رسالوں کی ہو بات
کل حافظ و بہزاد نے مجھ سے یہ کہا — غزلوں میں مناسب ہے غزالوں کی ہو بات

صادقین چینی روایات کا آدمی ہے، جہاں مصور بھی برش کا استعمال کرتے ہیں اور لکھنے والا بھی
برش ہی سے لکھتا ہے، صادقین کے ہاں غالب کی رباعیات کے ذاتی تجربات کے برعکس مصوری اور خطاطی کے تجربات
ہیں اور ان دونوں کے تجربات کا نچوڑ وہ شاعری میں لاتا ہے، گویا مصوری خطاطی اور رباعی نویسی تینوں کے
لیے برش استعمال کرتا ہے۔

تخلیق میں معتکف یہ ہونا میرا — اب تک شبِ ہستی میں نہ سونا میرا
خطاطی اِدھر ہے تو اُدھر نقاشی — وہ اوڑھنا میرا یہ بچھونا میرا

مکھڑے کی تو تنویر سے باتیں کی تھیں — اور زلف کی زنجیر سے باتیں کی تھیں
کل اک تری تصویر بنا کر میں نے — پھر کچھ تری تصویر سے باتیں کی تھیں

صادقین نے مصوری میں جس طرح انسان، اس کے جسمانی کرب اور لذتوں، اس کی روحانی محسوسات و کیفیات
اور اس کے ظاہر اور باطن کو لکیروں اور رنگوں میں ڈھالا ہے۔

صادقین جس نے قلم سے ابجد کے نورِ عرفاں کی ضیا پاشیوں کے مناظر بنائے ہیں۔
صادقین جس نے خالقِ حقیقی کے کلام مطاہر و زندہ و پائندہ کو قرطاس پر پھیلا کر تبلیغ پیغامِ الٰہی کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔ اُس نے رباعی کے چار مصرعوں میں بھی انسان، اس کے جذبات، اس کی مثبت اور منفی ذہنیت کو بحر ہزج کے چوبیس اوزان کے ایک مزاج کے رنگوں میں پابند کر کے اپنے فنکارانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔

دُبلا پتلا اور کمزور جسم کا انسان اپنے اندر بسیط سمندروں کے طوفان عظیم صحراؤں کی وسعتیں۔ درخشاں سورج کی گرمیاں حسین چاند کی ٹھنڈک کو نیلے آسمانوں کی بلندیاں چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے خیالات و موضوعات کا شمار عظیم صحراؤں کی ریگ کے ذرّوں کے شمار سے بھی مشکل ہے لیکن اتنا گہرا آدمی، سادگی کی آبرو، لباس، رہن سہن اور اپنے کلام میں اسے صرف ایک مارکر کی ضرورت تھی۔ مارکر نہ ہوتا تو کوئلے کا ذرا سا ٹکڑا بھی اس کے اظہار کے در باز کر دیتا۔ صادقین کے پاس کوئلے کا ٹکڑا بھی نہ ہوتا تو اس کا ذہن اور اس کا حافظہ اس کی رباعیات کی کتاب بنا رہتا۔

صفحہ ۱۰۲ کا باقی

پھر یہ کیا رنگوں کا جھمیلا میں نے
اُس تیل سے فن کا کھیل کھیلا میں نے
اس اپنے بدن کی ہڈیوں کو دن رات
تخلیق کے کولہو میں ہے پیلا میں نے

اشعار کی فکر ہے بدن ہے نیلا
اور چہرہ معاش کی طلب میں پیلا
اے ابرِ خیالات مسلسل نہ برس
ہو جاتے نہ مفلسی میں آٹا گیلا

ان نرگسی آنکھوں کی چمک تو دیکھو
لٹ بالوں کی گالوں کی دمک تو دیکھو
صورت کے ہے سونے پہ سہاگا گویا
اس سانولے مکھڑے کا نمک تو دیکھو

جنت کی بہاروں کا نکھارا مکھڑا
بیلے کی کلی، صبح کا تارا مکھڑا
کوثر کی مصدّق ہے تمہاری آواز
حوروں کا ثبوت ہے تمہارا مکھڑا

اس طرح کی بہت سی رباعیاں صادقین اور جوش کے کلام سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ صادقین اور جوش کے موضوعات میں ایک مماثلت ضرور نظر آتی ہے لیکن دونوں میں جو فرق ہے اس کی نشاندہی نہ بھی کی جائے تب بھی قاری یہ سمجھ جائے گا کہ جوش کے یہاں جو بلند آہنگی گھن گرج، بانکپن، مردانگی، الفاظ کا جادو، خیالات کی فراوانی اور منفرد دلکشی ہے اُس کا صادقین کے یہاں دُور دُور تک پتہ نہیں ہے۔ صادقین کے یہاں تو ایک دھیما پن ہے۔ لہجہ کی صداقت ہے۔ اُن کی رباعیات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصوّر بہت دھیرے دھیرے اپنے موئے قلم سے تصویر میں رنگ آمیزی کر رہا ہے۔ پہلے یہ رنگ ہلکے ہوتے ہیں اور پھر وہ شوخ ہو جاتے ہیں اور اُن میں ایک تابندگی اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول صادقین رباعی کہنے کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں ہے، اور اتفاق سے جوش ایک عظیم المرتبت شاعر بھی تھے لہٰذا اُن سے صادقین کا موازنہ درست نہیں ہے۔

بہر حال آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ صادقین اگر بین الاقوامی شہرت کے مصوّر نہ ہوتے اور انہوں نے صرف یہ رباعیاں ہی تخلیق کی ہوتیں تو عمر خیام کی طرح اُن کا نام شعر و ادب کی دنیا میں بقائے دوام حاصل کرتا۔

عظیم امروہوی

صادقین بحیثیت مرثیہ نگار

ایک شاعر کا دل۔ ایک مصور کی نظر۔ ایک مفکر کا ذہن اور ایک خطاط کا ہاتھ دیکھ کر قدرت نے نسلِ شاہ ولایت میں جس ذات کو سرزمینِ امروہہ پر ۲۵ رجون ۱۹۳۰ء کو اتارا اسے ہم صادقین کہتے ہیں۔ امروہہ کی تاریخ کا واقعی وہ ایک سعد و نیک دن تھا۔ درحقیقت آفتاب کی ہزاروں گردشوں کے بعد کسی خطۂ زمین کی قسمت میں کوئی ایسا دن آتا ہے۔ جب ہم صادقین کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور بے گناہی کے آثار ملیں گے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی نظر آئے گی۔ لہجے میں کلیوں جیسی مہک اور شیر و شکر سے دُھلی ہوئی زبان میں مصری کی ڈلی جیسی مٹھاس محسوس کریں گے۔ اس کا اعتراف وہ خود بھی ایک جگہ کرتے ہیں۔

ع منہ میں لئے مصری کی ڈلی لکھتا ہوں

صادقین اب تک وہ سب کچھ حاصل کر چکے ہیں جو اتنی عمر میں شاید کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوا ہوگا لیکن اس مقام تک پہنچنے میں وہ کبھی بھی تکبر کے قریب سے نہیں گزرے اور غرور سے بالکل ناآشنا ہیں۔ انسان شہرت کے پیچھے بھاگتا ہے لیکن صادقین کا دل شہرت سے سیر ہے اور اب وہ ایسی منزل پر ہیں کہ شہرت ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ وہ اب تک پوری دنیا سے اپنے فن کا اعتراف کرا کے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ دنیا کے بے شمار ممالک میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے بلائے جا چکے ہیں اور اُن کے فن کی نمائش ہو چکی ہے۔ عالمی پریس اُن کے فن کو سراہ چکا ہے۔

آج سے ۱۰ سال قبل یعنی جب اُن کی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو وہ پاکستان کا سب سے بڑا انعام پرائڈ آف پرفارمینس (PRID OF PERFORMANCE) حاصل کر چکے تھے۔ بقول ایچ۔ اے اینڈریوز "صادقین نے ساری دنیا میں پاکستان کو متعارف جس طرح کرایا ہے وہ پاکستانی سفیروں کے بھی بس کی بات نہیں ہے"۔ ۲ نومبر ۱۹۶۳ء کو "لندن ٹائمز" نے لکھا "صادقین کا آرٹ موثر طاقت سے بھرپور ہے"۔ ۸ جولائی ۱۹۶۳ء کو واشنگٹن پوسٹ نے لکھا کہ "آرٹ کی مخصوص علامت کیکٹس کی تخلیق ہیں۔ صادقین زندگی کی کامرانیوں کی منزل نظر آتے ہیں"۔ ۲۳ جولائی ۱۹۶۳ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ نے صادقین کے فن کو بہت پُرزور الفاظ میں سراہا۔ اس کے علاوہ فرانسیسی ناقد یارنیٹ کولات۔ برطانوی ناقد ایرچ نیوٹن اور امریکن ناقد ٹامس ڈاؤننگ نے صادقین کے فن کی بے حد تعریف کی ہے۔ امریکہ۔ انگلینڈ۔ آسٹریلیا۔ فرانس۔ رومانیہ۔ سوویت روس۔ عراق۔ ایران۔ سعودی عرب۔ بحرین اور بہت سے دیگر ممالک کی حکومتیں صادقین کو بڑے بڑے اعزازات سے نواز چکی ہیں۔ درحقیقت صادقین کے بارے میں پوری دنیا کے اخبارات۔ رسائل۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اتنا کہا اور لکھا ہے کہ اگر اس کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

صادقین کی زندگی کا سفر کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ سادات امروہہ کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں گزشتہ ایک صدی سے سید سجاد علی۔ سید یاد علی۔ سید داد علی اور سید سبطین احمد کی مصحف نگار انگلیوں میں جو فن کار محفوظ تھا وہ صادقین کی شکل میں ایک دن نمودار ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں امام المدارس انٹر کالج امروہہ سے جو اس وقت ہائی اسکول تھا میٹرک اور ۱۹۴۸ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت

ی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ہی امام المدارس امروہہ میں آرٹ ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا۔ سنہ ۱۹۴۸ء سے سنہ ۱۹۵۱ء تک ایگریکلچرل کالج سکرنڈ میں آرٹسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۲ء تک ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ کے فرائض انجام دئیے۔ سنہ ۱۹۵۲ء سے اب تک ایک فن کار کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں جس میں زیادہ تر خدمات اعزازی طور پر انجام دیں۔

صادقین نے اب تک اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مصوری اور خطاطی کی شکل میں زیادہ ڈھالا ہے۔ لیکن جب یہ تخلیقی کرب زیادہ بڑھ جاتا ہے یا یوں کہئے کہ مصوری اور خطاطی سے جب ذہن تھک جاتا ہے تو وہ تھکی ہوئی انگلیاں شعروں کے موتی پرونے لگتی ہیں اور یہ جذبۂ تخلیق صادقین کو تیسری شکل دے کر شاعر بنا دیتا ہے اور صادقین کی یہ تینوں صورتیں یعنی بحیثیت مصور، بحیثیت خطاط اور بحیثیت شاعر اہلِ نظر کو ایک کش مکش میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ آخر کون سی حیثیت زیادہ تابناک ہے۔ کیونکہ خزانۂ قدرت کے اس انمول ہیرے کے جس رُخ پر بھی نظر پڑتی ہے وہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور اس چکاچوند کے عالم میں کوئی بھی اہلِ نظر کسی فیصلے پر آسانی سے نہیں پہنچ پاتا۔ صادقین نے شاعری کی ابتدا میں اپنا تخلص حسرتی رکھا اور ابتدائی شاعری میں اسی تخلص کا استعمال کیا جو "جزو بوسیدہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی تصنیفات کی تفصیل اس طرح ہے۔

رقعاتِ صادقین (مکتوبات لاہور)

رباعیاتِ صادقین (لاہور)

رباعیاتِ صادقین نقاش کراچی سنہ ۱۹۷۰ء

رباعیاتِ صادقین مصور کراچی سنہ ۱۹۷۱ء

بیاضِ صادقین کراچی

جزو بوسیدہ لاہور سنہ ۱۳۹۹ھ

جزو بوسیدہ نظمیں۔ رباعیات۔ مثنوی اور شخصی مرثیے کا مجموعہ ہے۔ شہر کے موضوع پر کہتے ہیں ؎

خونِ شبیرؑ شعریت کا امیں
ذاتِ شبیرؑ پہ ہزار درود

ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو ؎

ہیں عقل کے انکار کو ٹھکراتا ہوں | اور قلب کا اقرار بجا لاتا ہوں
اے ابنِ علیؑ تیری بدولت واللہ | اللہ پہ ایمان لئے آتا ہوں

صادقین کے بارے میں ایک موقع پر خواجہ احمد عباس نے کہا تھا کہ "ایسا ہرا تنے کمزور انسان کا اتنا مضبوط فن دیکھ کر بے حد تعجب ہوتا ہے"۔

شاعر صادقین، مصور اور خطاط صادقین سے عمر میں کم ہے کیونکہ مصور اور خطاط پہلے ہی جنم لے چکے تھے اس کے باوجود بھی شاعر کا قد چھوٹا نہیں ہے کیوں کہ جس تیزی سے بلندیوں کی جانب بڑھے وہ یقیناً محیر العقول ہے اگست سنہ ۱۹۶۹ء سے جنوری سنہ ۱۹۷۰ء تک تقریباً ۱۱۱۱ رباعیات کو جنم دیا۔ اور اب تک ۵ ہزار سے بھی زیادہ رباعیات کہہ چکے ہیں۔ یہ پُرگوئی اور قلم کی یہ رفتار یقیناً ایسی تھی کہ جس سے ان کے ہاں تکرارِ مضامین پیدا ہو جاتے لیکن صادقین کی رباعیات کے تمام مجموعے دیکھنے کے بعد اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ صادقین کی ہر رباعی فکر و تخیل کے اعتبار سے ہر دوسری رباعی سے مختلف ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اتنے کم وقت میں شاید کسی دوسرے شاعر نے اتنی رباعیاں لکھی ہوں گی جس کی وجہ یہ ہے کہ صادقین شاعری رباعی کے

لئے بنے تھے۔ یا قدرت کے ذریعے ہی ان کو یہ فریضہ سونپا گیا تھا۔ وہ رباعی کا مزاج لے کر پیدا ہوئے ہیں اور رُباعی اُن کے خمیر میں رچی بسی ہوئی ہے وہ خود اپنے ایک مجموعے میں اس بات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ

"صنفِ رُباعی سے اپنی محبت بچپن سے ہے نہ جانے کیوں اس میں ایک خاص حسن وجمال ایک خاص متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے اور پھر یہ کہ اگر لکھی جاتی ہے تو خطاطی کے نقطۂ نظر سے "

صادقین کو واقعی رباعی نے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے اور وہ اس کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نکلنا چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے۔ اس بات کا ثبوت ان کا مرثیہ ہے جو اپنی بحر کے اعتبار سے اردو مرثیہ میں ایک نیا تجربہ اور اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مرثیہ رباعی کی ہی ایک بحر میں ہے۔ راقم کی نظر سے آج تک اس بحر میں کوئی مرثیہ نہیں گزرا۔ (جب کہ راقم کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً دس ہزار مراثی موجود ہیں۔)

صادقین کے لئے مرثیہ کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ان کا تعلق جس سرزمین سے ہے وہ مرثیہ نگاری کے لئے ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ جس خانوادے کے چشم وچراغ ہیں وہاں بھی اسلاف میں علم وادب کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے ان کے والد سید سبطین احمد سبطین نہ صرف اپنے وقت کے مایۂ ناز مرثیہ خوان تھے بلکہ شاعر بھی اور مرثیہ نگار بھی تھے لیکن صادقین کی فکری نہج نہ صرف مرثیہ نگاران امروہہ سے مختلف ہے بلکہ انیس ودبیر سے بھی بہت مختلف ہے۔ وہ تقلید پسند نہیں ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی صادقین کا مرثیہ نہ صرف قابل توجہ ہے بلکہ اردو مرثیے میں ایک فکری موڑ بھی ہے اور صحت مند تجربہ بھی ہے۔ رہا سوال مرثیے کی زبان اور اسلوب کا تو صادقین کی رباعیات کے سہارے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ صادقین کی زبان امروہہ اور دہلی کا مرکب ہے۔ لاہور کی معطر فضاؤں کی بسی ہوئی ہے جس میں مٹی کے پھولوں کی طرح بھینی بھینی خوشبو ہے لیکن صادقین کے اسلوب میں نہ امروہہ اور دہلی کا امتزاج ہے نہ امروہہ اور لکھنؤ کا اور نہ امروہہ اور لاہور کا۔ وہ اپنے اسلوب کے موجود وہ خالق خود ہیں۔ ان کا اسلوب فطری ہے اور ان کے جو احساسات ہیں انہیں وہ بے ساختہ برجستہ اور غیر ارادی طور پر اپنی زبان پر لے آتے ہیں کسی بات کو کہنے کے لئے وہ کسی مخصوص انداز اور مخصوص رنگ کے اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنے انداز میں ادا کر دیتے ہیں اور یہی ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ مصور ہونے کے ناطے چونکہ ان کا مشاہدہ عمیق ہے اس لئے وہ جزئیات اور تہ در تہ دیکھ لیتے ہیں اور یہاں ان کا فنِ مصوری ان کی پوری مدد کرتا ہے اور اس طرح خالص اپنے احساسات کو بغیر کسی سے متاثر ہوئے پیش کر دیتے ہیں۔ صادقین اپنی رباعیات کے ایک مجموعے کے دیباچے میں اپنے نظریۂ فن کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ

"فقیر روایت پرست ہونے کے ساتھ ساتھ زمانوں کے بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی انداز کے ساتھ ہی ساتھ ان کے پس منظر میں جمالیاتی اقدار بھی متغیر ہوتی ہیں لہٰذا روایت میں تخلیق و اختراع وایجاد کا قائل ہے کہ بغیر اس کے روایت جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور روایت میں بغیر نئی اختراعات وایجادات کے مستقبل کی طرف حرکت پیدا نہیں ہوتی"

اردو شاعری میں ایک اہم ترین حصہ حب الوطنی پر بھی مشتمل ہے۔ شاعر نے اپنے آبائی وطن اور جائے ولادت کے لئے طرح طرح سے اظہار عقیدت کیا ہے وطن کی شان میں قصیدہ نگاری کی ہے۔

اس برِ صغیر میں کچھ شہر تاریخی۔ سیاسی۔ ادبی۔ جغرافیائی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ اور حیدر آباد وغیرہ۔ ان شہروں کا ذکر اکثر شعراء نے اپنی شاعری میں کیا ہے اور لکھنؤ سے متعلق تو بیشتر نظمیں کہی گئی ہیں۔ امروہہ سے متعلق بھی امروہہ کے شعراء نے کافی نظمیں اور قطعات کہے ہیں۔ مثلاً اختر شاہ خاں اختر۔ آفاق ناظمی۔ شفیق حسین آکیا۔ یا عصرِ حاضر میں رئیس امروہوی اور تاباں نقوی کی نظمیں وغیرہ وغیرہ۔

صادقین نے امروہہ پر نظم کہنے کے بجائے امروہہ کو اپنے مرثیہ کا چہرہ بنایا ہے۔ شاعر ۴۲ سال کے بعد اپنے آبائی وطن کی طرف واپس آتا ہے۔ اس کے دل کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ وہ اپنے مولد کو دیکھ سکے۔ اس کا ذہن ۴۲ سال پہلے کی البم کو پلٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ سینکڑوں تصویریں نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں لیکن وطن پہنچ کر جب وہ حقیقت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو زمانہ نے کتنی تصویریں مٹی ہوئی ملتی ہیں۔ کتنی گم ہو چکی ہیں اور کتنی دھندلی دکھائی دیتی ہیں۔

مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ؂

لاریب کہ اللہ تعالیٰ ہے تو نے
بندے کو بڑے عیش سے پالا تو نے
لغزش ہوئی جب بھی تو سنبھالا تو نے
میرا ہر اک ارمان نکالا تو نے

شاعر کے دل کا جب یہ ارمان نکل جاتا ہے تو بارگاہِ خدائے دو جہاں میں اس طرح شکر گزار ہوتا ہے کہ؂

ان شکرِ خدائے دو جہاں ہے مجھے زیب
اس ذات سے جو ذات ہے قطعاً بے عیب
میری مدد ہو جاتی ہے من جانبِ غیب
صدقے میں حسینؑ ابنِ علیؑ کے لاریب

اور یہ مدد حسینؑ ابنِ علیؑ کے صدقے میں کس شکل میں ہوئی ہے؂

یاروں سے ملا دیا ہے مالک تو نے
امروہہ دکھا دیا ہے مالک تو نے

صادقین سے پہلے مرثیے کا چہرہ لکھنے میں شعراء نے مختلف موضوعات پر توجہ کی ہے لیکن کسی شہر یا بستی کو موضوع نہیں بنایا۔ صادقین نے مرثیے کے چہرے میں مرکزی طور پر یہ بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی ہر چیز تبدیلیٔ زماں و مکاں سے متاثر ہے۔ اور ۴۲ سال کے دوران جب زمانہ بہت تبدیل ہو گیا۔ صادقین کے اپنے شہر کے ذرّے ذرّے میں تغیر و تبدیلی آگئی۔ وقت کے خاموش انقلاب نے در و دیوار کو بدل دیا۔ کوچہ و بازار بدل دیئے۔ زمین و آسمان میں تبدیلی ہو گئی لیکن نواسۂ رسولؐ کا غم اور کربلا کے شہیدوں کی یادگار منانے کے کسی بھی انداز میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی یہ غم جاوداں اسی طرح برقرار ہے یہ ابدی غم اسی طرح قائم اور جاری ہے اسی بات کو صادقین نے بہت سلیس اور موثر انداز میں کافی تفصیل سے کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہتے ہیں کہ؂

ہر ساز اور سامان میں تبدیلی ہے
پالنے میں اور دالان میں تبدیلی ہے
کب لوگوں کے ایمان میں تبدیلی ہے
مولا کی کہاں شان میں تبدیلی ہے

مولا کی شان میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہونے کا وہ اس طرح ثبوت دیتے ہیں کہ؂

علموں کے جلوس کا تجمل ہے وہی
مجلس کے خلوص کا تجمل ہے وہی

عزاداریٔ امام حسینؑ کی یہی دو شکلیں اور دو طریقے ہوتے ہیں یعنی جلوسِ عزا اور مجلسِ شہداء۔ آگے چل کر وہ جلوس کے جزئیات

اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

اونٹوں کا وہی نظام اللہ اللہ
آرائش کا اہتمام اللہ اللہ
دُلدل کا وہ احترام اللہ اللہ
مولا پہ وہ بھیر سلام اللہ اللہ

ان مصرعوں کی ترتیب بھی وہی ہے جو امروہہ میں جلوسِ عزا کی ہوتی ہے یعنی سب کے آگے اونٹوں کی قطار۔ پھر مختلف تابوتوں اور علی اصغرؑ کے جھولے کی شبیہ ہے جسے امروہہ کی مخصوص اصطلاح میں آرائش کہتے ہیں۔ اس کے پیچھے امام حسینؑ کے اسپ وفادار کی یاد میں ایک گھوڑا (دُلدل) اور سب سے پیچھے عزاداران امام مظلوم صف بہ صف نوحہ پڑھتے ہوئے اور مولا پہ سلام بھیجتے ہوئے۔

یہ سب ذکر کرنے کے بعد شاعر اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ ہر چند وہ ۴۴ سال سے دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں وقت گزار رہا تھا اور وہاں کی شاہراہوں سے گزرتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی امروہہ کے گلی کوچوں کی یاد سے غافل نہیں تھا ؎

شہراہوں پہ بے حد ہی تو تڑ پاتی تھیں
امروہے کی گلیاں مجھے یاد آتی تھیں

اور جب ان گلیوں کو دیکھ لیتا ہے تو سیکڑوں شکر ادا کرتا ہے ؎

صد شکر امروہے کی گلیاں دیکھیں

ان گلیوں کو دیکھنے کے بعد صادقین نے جو کچھ دیکھا اس کا ذکر دل ہلا دینے والا ہے اور اس کیفیت کا صحیح اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی ایسا وقت گزرا ہو۔ پھر دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اعلیٰ ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے کا رنج و مسرت پڑھنے اور سننے والے پر بھی طاری کر دیتا ہے۔ صرف ایک بیت ہی پورا ایک مرثیہ ہے ؎

جو اپنے تھے، باہر سے وہ گھر بھی دیکھے
کچھ کاخ و قصور کے کھنڈر بھی دیکھے

۴۴ سال کی طویل مدت کے بعد اپنا گھر کوئی دیکھے اور وہ بھی صرف باہر سے تو کیا گزرے؟ یہ صادقین کا دل ہی جانتا ہے۔ اس مجبوری نے صادقین کو کس کرب میں مبتلا کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بیت سے کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ صادقین آفاقیت اور بین الاقوامیت کے قائل ہیں۔ کل کائنات کو اپنا گھر مانتے ہیں لیکن کچھ فطرت کے بھی تقاضے ہوتے ہیں ؎

البیرونی الوند کا باشندہ ہوں	دلی نہ سمرقند کا باشندہ ہوں
ہر خطۂ خورسند کا باشندہ ہوں	میں ارضِ خداوند کا باشندہ ہوں

رب کی ہے تو ہر طور ہے دنیا میری
دُنیا کا ہوں میں اور ہے دُنیا میری

صادقین اپنے آبائی وطن کی عظمت کا اظہار کرنے کے لئے پہلے اپنے مشاہدے اور خود آگہی کا اظہار کرتے ہیں اور جب اپنے آپ کو متعارف کرا دیتے ہیں تب امروہہ کی سرزمین سے اپنی عقیدت اور سلوک کا ذکر کرتے ہیں ؎

دیکھا ہوا اپنا ہے ہر اک شہر کا باب	صحرا کا بگولا اور بحر کا گرداب
سورج کا جلال اور جمالِ مہتاب	ہم جن کو فلک بھی کر رہا ہے آداب

امروہے کی سرزمیں کو کرتے ہیں سلام
جیسے کہ کسی حسیں کو کرتے ہیں سلام

اس کے بعد اس سرزمین کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل بھی پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ اولیائے کرام کا مسکن ہے اور صادقین کی طبیعت قلندرانہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان اولیائے کرام میں جو سرفہرست ہیں وہ صادقین کے مورثِ اعلیٰ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت ہیں جن کی درگاہ پہ آج بھی ہر مذہب وملت کے ماننے والے عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

یہ شاہِ ولایت کی زمیں ہے اے دوست　　دنیا میں جواب اس کا نہیں ہے اے دوست
درگاہ بھی حضرت کی یہیں ہے اے دوست　　جس جا ہے وہ آراضی حسیں اے دوست

کیسا ہے بتاؤں وہ زمیں کا ٹکڑا
دھرتی پہ ہے فردوسِ بریں کا ٹکڑا

رخسارۂ گیتی پہ سنبل امروہہ　　امروہے کے لوگوں کا ہے دل امروہہ
دلی ہے اگر آب تو گل امروہہ　　لکھنؤ جو بندری ہے تو بل امروہہ

امروہہ ہے دو شہر دل آرا بجنوں
بس ہو تو سمرقند و بخارا بخشوں

اب ان کو اپنا ماضی اور کم سنی یاد آجاتی ہے جس کو اسی دیارِ خوباں میں گزارا ہے۔ کہتے ہیں کہ ؎

طفلی میں قلم بھی میں بناتا تھا یہاں
ٹائل کے قلم بھی میں بناتا تھا یہاں

لیکن یہ شوق کیسے پیدا ہوا تھا اور کس طرح ان کو ورثے میں ملا اس کی وضاحت کر دیتے ہیں ؎

مالعبد طبیعات کو لکھنے کا یہ شوق　　واللیل کا لفظارات کو لکھنے کا یہ شوق
سچائی کی ہر بات کو لکھنے کا یہ شوق　　قرآن کی آیات کو لکھنے کا یہ شوق

اللہ کے اس ولی سے ورثے میں ملا
مجھ کو حضرت علیؑ سے ورثے میں ملا

اس کے بعد وہ مرثیے کے اصل موضوع کی طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں اور ٹائل کا قلم بنانے سے گریز کرتے ہیں کہ ؎

پھر نام ولی ابنِ ولی لکھتا ہوں　　کاغذ پہ حسینؑ ابنِ علیؑ لکھتا ہوں
یہ نام میں بڑھ بڑھ کے جلی لکھتا ہوں　　منہ میں لئے مصری کی ڈلی لکھتا ہوں

اس نام کو کب خانۂ یاقوت میں آج
لکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت میں آج

صادقین جو نام لکھتے ہیں اس ذات سے انہیں جو عقیدت ہے اس کا اظہار بھی اپنے منفرد انداز میں کرتے ہیں ؎

اس نام کو سنتے ہی چمکتے ہیں قلوب
مشرق، مغرب، شمال اور جنوب
یہ نام یہ شخصیت ہے ہم کو محبوب
لکھنے میں بھی پڑھنے میں بھی سننے میں بھی خوب

لیکن یہ نام یونہی نہیں لکھا جاتا بلکہ ؎

سر سے تو اُصول ہیں پیارے ہم کو
بیعت میں شکست ہے شہادت میں ظفر
کافر سے ملے حق کا ولی ناممکن
بیعت اور حسینؑ ابن علیؑ ناممکن

امام حسینؑ نے اصولوں پر کس قدر زور دیا اور ان کے تحفظ کے لئے کیا تیاری کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

حملہ وہ اصولوں پہ اگر کردیں گے
ہم جان کو اور دل کو سپر کردیں گے

ہے ظلم بھی اور ظلم کی شدّت منظور — مقصود تباہی ہے ہلاکت منظور
مطلوب اسیری ہے شہادت منظور — منظور ہے سب، پر نہیں بیعت منظور

کافر کا کبھی ساتھ نہیں دے سکتے
کٹوائیں گے سر، ہاتھ نہیں دے سکتے

پورے بند میں جو روانی اور زور ہے وہ اس بحر میں پیدا کرنا صادقین کے فن کا کمال ہے۔

کارزارِ کربلا میں دو طاقتوں کی جنگ تھی۔ نور کی ظلمت سے۔ حق کی باطل سے۔ انسانیت کی حیوانیت سے۔ صداقت کی جھوٹ سے اور شرافت کی ذلالت سے امام حسینؑ تمام انبیاء کی وراثتوں کے نمائندے اور رحمانی طاقتوں کے مالک تھے۔ یزید، نمرود، ہامان اور فرعون کا نمائندہ اور طاغوتی طاقتوں کا مالک تھا۔ صادقین نے دونوں کرداروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ امام حسینؑ کی زبانی کہتے ہیں ؎

تم لوگ رہِ گناہ چلنے والے — لے لے کے بہت سپاہ چلنے والے
ہم صبر و رضا کی راہ چلنے والے — ساتھ اپنے ہیں مہر و ماہ چلنے والے

تم کون ہو فرعون ہو موسیٰؑ ہم ہیں
تم تحت ثریٰ۔ عرشِ معلّیٰ ہم ہیں
اسفل سے کرے دوستی اعلیٰ کیسے
اس ہاتھ پہ رکھ دیں یدِ بیضا کیسے

امام حسینؑ کے بیعت سے انکار میں کس قدر شدّت تھی اس کا اندازہ ان مصرعوں سے ہوتا ہے ؎

فاسق کے تو ہیں ساتھ نہیں ملنے کا
سر کاٹ لو پہ ہاتھ نہیں ملنے کا

کچھ بھی کہو ہم سے یہ خرافات نہ ہو
ہر بات ہو بیعت کی مگر بات نہ ہو

اور اگر حکمرانِ وقت پھر بھی اپنی مسند پہ قائم رہے ؎

ہر طرح کی ایذا ہے گوارا ہم کو
بھاتا ہے یہ مقتل کا نظارا ہم کو

کربلا میں کون کس سے بیعت کا طلب گار تھا یہ صادقین کی زبانی سن لیجئے پورا فلسفۂ شہادت سمجھ میں آجائے گا ؎

بوجہل ہے عرفان سے بیعت مانگے
اور کفر ہے ایمان سے بیعت مانگے
کُندا ورقِ قرآن سے بیعت مانگے
شیطان ہے رحمٰن سے بیعت مانگے

تیسرا مصرع کہنے کے لیۓ واقعی صادقین جیسے ہی ذہن کی ضرورت تھی یہ استعارے اور تمثیلیں اچھوتی اور نادر ہیں۔
شبِ عاشور میں امام حسینؑ کے خیموں اور فوجِ یزیدی کی نہ جانے کتنے شعراء نے اپنے انداز میں منظر نگاری کی ہے۔
صادقین نے بھی دونوں تصویریں اپنے انداز میں پیش کی ہیں ؎

مالک کی عبادت کا دلوں میں ہے وفور
اور شوقِ شہادت میں ہراک ہے مسرور
خیموں میں ہے پھیلا ہوا ایمان کا نور
کرتی ہے جسے سلام، برقِ سرِ طور
فوجیں گھنے جنگل میں ہوں جیسے کہ درخت
کرتے ہیں خنجروں پہ صیقل بدبخت
فولاد کے خود ہیں تو آہن کے ہیں رخت
دریا پہ تو ہے فوج کا پہرا بڑا سخت

اردو مرثیے میں دریائے فرات کا بھی ذکر بہت ملتا ہے کیوں کہ دریا پہ پہرا لگا کر امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا پانی بند کر دیا گیا تھا۔ اس دریا کو جب صادقین نے اپنی مصورانہ نگاہ سے دیکھا تو کیا نظر آیا ؎

دریا نہ تھا۔ عاشور کی شب کی ہے یہ بات
چہرے پہ زمیں کے اک آنسو تھا فرات

انسان جب خود غم زدہ ہوتا ہے اس کا اپنا دل غمگین ہوتا ہے تو اسے کائنات کی ہر شے غمگین نظر آتی ہے۔ فطرت بھی افسردہ ہو جاتی ہے ؎

دریا میں پچھاڑیں کھا رہا تھا سیلاب
رہ رہ کے دہاڑیں مارتا تھا سب آب
ہاں ٹوٹ کے اور پھوٹ کے روتے تھے حباب
دامانِ خلا پہ جو وہ برسو تھے نجوم
افلاک کے ٹپکے ہوئے آنسو تھے نجوم
آنسو تھے نجوم اور تھے بادل رومال
اب عالمِ بالا کا کہوں کیا احوال
تھے چرخِ چہارم پہ مسیحا بے حال
روتے تھے کہ مشکل میں محمدؐ کا ہے لال

اردو مرثیے میں پانی کا تڑپنا اور حباب کا پھوٹ پھوٹ کے رونا تو شعراء کے لیۓ ایک روایت کی حیثیت رکھتا

ہے لیکن فرات کو زمین کے چہرے کا آنسو بتانا، نجوم کو افلاک کے چھلکے ہوئے آنسو کہنا اور بادل کو رومال بتانا یقیناً صادقین کا حصہ ہے۔

عاشور کی رات کی اہمیت شاعر کی نظر میں کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو سہ

اُٹھ گئے عالم کے طبق آج کی رات
یکجا ہوئے قرآں کے ورق آج کی رات
سمجھا گیا مضمونِ ادق آج کی رات
تھے حفظ شہادت کے سبق آج کی رات

دی عالمِ بالا سے محمدؐ نے ندا
راتوں میں عظیم ہے تو ہے آج کی رات
عاشور کی شب ہے تری معراج کی رات

آہستہ آہستہ یہاں سے صادقین عصرِ عاشور کے وقت تک پہنچتے ہیں یہاں تک کہ شہادت کی منزل آجاتی ہے سہ

جب شمرِ کریہہ نے چلایا خنجر
مقتول کی زباں پہ تھا سبحان ربی
سے اعلیٰ تک کٹ کے گئے الفاظِ ربی

مرثیہ کا بنیادی مقصد رثائیت ہے۔ صادقین کے اس اصول سے واقف ہیں

کہ مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

اس لئے وہ بھی اس کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں اور کئی بند ایسے ہیں ان کے مرثیہ میں رثائیت پائی جاتی ہے حالاں کہ اس میں بھی انہوں نے تخیل کی پرواز کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ اس وادی میں زیادہ اڑان کی گنجائش نہیں ہے۔ تاریخ کی سرحدوں سے قدم باہر نکالنے میں پیر جل جاتے ہیں ان کی زبانی دنیا پر حسینؑ کی شہادت کے اثرات ملاحظہ ہوں سہ

اس وقت عراق و عرب و شام ہلے   کسریٰ کے محل کے بھی درو بام ہلے
یونان میں یونان کے اصنام ہلے   اور مصر میں تھے جتنے کہ اہرام ہلے
ہیکلِ اسکندریہ بھی لرزا اس دم
دیوار تھی چین کی گریاں اس دم

دنیا کے اہم ترین ممالک کا ذکر کر کے صادقین نے یہ کہنا چاہا ہے کہ پوری دنیا حسینؑ کی شہادت سے متاثر ہوئی اور رثائی ادب میں اس انداز میں یہ بات ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کے نتائج کا ذکر بھی مختلف شعرا کے ہاں ملتا ہے لیکن صادقین نے شہادت کا نتیجہ حسینؑ کے حق میں جس مثبت انداز میں اور یزید کے لئے جس منفی انداز میں پیش کیا ہے وہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں کہ سہ

وہ خون تھا روشنائی اتنی متبرک
مقتل کی وہ گرم ریت کیا تھی، [illegible]
اس پر وہ رواں ہوا قلم تا بہ ابد
[illegible] ازل کا ہاتھ بالکل اوجھل
مثبت تھا لکھا ہوا انسانیت کا لفظ
انسان کا حشر ان کا ترک کا لفظ

ڈاکٹر شکیل نوازش رضا

صادقین کی رباعیات

فن شاعری کی جسے ذرا سی بھی معرفت حاصل ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ رباعی کا فن تلوار کی دھار پر سفر کرنے جیسا ہے کہ اس فن کو برتتے ہوئے ذرا سی لرزش شاعری کی دنیا میں بدنام کر دیتی ہے اگرچہ یہ ایک ایسی چار مصرعوں والی نظم ہے جس پر طبع آزمائی کرتے ہوئے بڑے نامی گرامی بھی ٹھوکر کھانے سے نہیں بچے ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعری کی دنیا میں اُستادی کا دعویٰ اُسی وقت مستند سمجھا جاتا ہے جب رباعی کے فن کو بخیر و خوبی برت لیا جائے۔

قدیم و جدید ہر دور کے شعراء نے رباعی میں طبع آزمائی کی ہے اور بڑی کامیابی سے اس راہ پُرخطر سے گزرے ہیں اور رباعی کی تمام پابندیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس فن میں اپنی اُستادی کا لوہا منوایا ہے۔

رباعی گو شعراء کا اگر محاسبہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ رباعی گو شعراء کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے مرثیہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے یا یوں کہئے کہ جو مسدس کہنے میں ماہر ہیں اور دوسرے وہ جو "حُسن پرست" ہیں۔ یہاں پر "حُسن پرست" کا لفظ بہت ہی خصوص معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

مرثیہ نگاروں میں رباعی گو وہ شعراء ہیں جو مسدس نگاری میں فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں خصوصی طور پر اُن مرثیہ نگاروں نے رباعی کے فن کو بڑے حُسن و انتظام کے ساتھ پیش کیا ہے جن کا تعلق منبر سے رہا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ، مونسؔ و اُنسؔ، خلیقؔ، عشقؔ، تعشقؔ، عروجؔ سے لے کر مہذبؔ تک اور پھر موجودہ دور کے مرثیہ نگاروں نے رباعی کی طرف اس لئے توجہ دی ہے کہ رباعی کہنا اُن کی ضرورت تھی۔

دراصل مسدس نگار کو منبر پر بیٹھ کر مرثیہ سامعین کی خدمت میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ اُس طویل مرثیہ کو پیش کرنے کے لئے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مکمل طور پر مبذول کروانے کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ سامع بغور اور دلچسپی کے ساتھ مرثیہ کو سُنے اور ثواب کے ساتھ لطف بھی حاصل کرے۔ یہ مراثی ایسی مجالس میں پڑھے جاتے تھے جہاں سخن فہم اور ماہرین فن دونوں موجود ہوتے تھے۔ لہٰذا شعراء مسدس سے پہلے اپنے کلام کا آغاز رباعیات سے کرتے تھے اور رباعیات پیش کر کے ایک طرف تو مجلس کے سامعین کو مسدس سننے کیلئے آمادہ کرتے تھے دوسری طرف اسکا اظہار بھی ملحوظِ خاطر ہوتا تھا کہ جو شاعر رباعی اس خوبصورتی سے پیش کر رہا ہے اُسکا تخلیق کردہ مسدس کس پلے کا ہوگا اور ماہرین فن کی خدمت میں بہ زبان رباعی اس کا اظہار بھی ہوتا تھا کہ ہم صرف مسدس کے ہی ماہر نہیں فن شعر میں ہمارا ثانی مشکل سے پیدا ہوگا کہ ہم رباعی جیسی مشکل صنف پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور "دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا۔"

رباعی گو شعراء کا دوسرا گروہ میرے نزدیک وہ ہے جسے حُسن پرست کہا جاسکتا ہے۔ اس کے سرخیل جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔ پھر فراقؔ گورکھپوری، راغبؔ مراد آبادی، ہاوا کرشن گوپال مغمومؔ اور شمس الرحمان فاروقی کی بہت سی رباعیات اِسی عنوان کے تحت شمار کی جائیں گی۔

اسی گروہ کے رباعی گو شعرا میں صادقین کا نام بھی لیا جانا مناسب ہے کہ صادقین نے بھی اپنی بہت سی رباعیات حُسن پرستی کے باعث تخلیق کی ہیں۔

رباعی کا ذکر کرتے ہوئے عمر خیام کا نام لینا ایک روایت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی صادقین کو بھی اردو کا عمر خیام قرار دے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ صادقین کی رباعیات کے موضوعات عمر خیام کی رباعیات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ شاید بادہ نوشی دونوں میں مماثل ہے اس کے علاوہ اور بس۔ اس کے برعکس اگر جوش اور فراق کی رباعیات کی طرف توجہ دی جائے تو اندازہ ہوگا کہ صادقین اپنی رباعی گوئی میں ان دونوں شعرا سے زیادہ قریب ہیں اور بہت سی باتوں میں ان تینوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔

جوش اور فراق کی طرح صادقین بھی بلانوش ہیں، فن کار ہیں۔ سحر انگیز شخصیت کے مالک رہے ہیں اور تینوں کی شخصیت میں ٹیڑھ پن، ایک بانکپن اور ایک سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تینوں کے یہاں ایک بے چینی و بے قراری کی کیفیت ہے۔ تینوں شعرا حُسن پرست ہیں اور حُسن کی جلوہ سامانیاں اُن کے خرمنِ دل کو جلا دیتی ہیں اور حشر برپا کر دیتی ہیں۔

صادقین مرثیہ نگار بھی ہیں یعنی انہوں نے مسدس کی طرف بھی توجہ دی ہے مگر انہوں نے مرثیہ نگاری ایک مخصوص جذبہ کے تحت کی ہے اور وہ باقاعدہ طور پر مرثیہ نگار نہیں ہیں اس لئے اُن کا شمار رباعی گو شعرا میں نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے مسدس نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں اور مذہب کی ضرورت کی خاطر رباعی نگاری کے فن کو عروج بخشا ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا گیا کہ رباعی کی صنف شاعری میں مشکل ترین صنف میں شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس کے لئے مخصوص بحر ہوتی ہے، چار مصرعوں میں بات کو مکمل کرنا ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع باقی پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع کی طرح نہیں ہوتا۔ تین مصرعے ایک ردیف و قافیہ میں ہوتے ہیں۔ چوتھا مصرع حاصلِ رباعی ہوتا ہے یعنی رباعی تخلیق کرنے کے لئے بڑے ریاض، بڑی کاوش، بڑی فنکاری، مہارت اور اُستادی کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے فارسی اور اردو کے تمام اساتذہ نے رباعی میں طبع آزمائی کر کے اپنی اُستادی کو ظاہر کیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر صادقین نے ایسی مشکل صنف کو اپنے اظہار کا ذریعہ کیوں بنایا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ رومانی نظمیں تخلیق کرتے اور بے حد کامیاب ہوتے۔ اس سوال کا جواب صادقین خود یہ دیتے ہیں۔

”جس گرد و پیش میں آنکھ کھولی اُس کی ثقافتی علامات کی تفصیل میں بغیر پڑے اتنا عرض کروں کہ منجملہ اور علامات کے رباعی بہ حیثیت ایک صنفِ سخن کے اپنے گرد و پیش کی ثقافتی علامت تھی اور ایامِ طفولیت میں حمدیہ، نعتیہ رباعیاں، اخلاقی اور رثائی نوعیت کی رباعیاں یاد کرائی جاتی تھیں، تصویریں نہیں بلکہ مخطوطات اور بالعموم اعلیٰ درجے کی خطاطی کی ہوئی رباعیاں آرائشِ دیوار کے لئے لگائی جاتی تھیں۔ یہ رباعیاں اکثر تختیوں پر بھی لکھی ہوتی تھیں۔ میں خود بھی ایامِ طفولیت میں تختی پر رباعیاں لکھنے کا شوقین تھا، چار مصرعوں پر مشتمل رباعی کی ساخت پہچان میں آجاتی تھی.... خلاصہ یہ ہے کہ صنفِ رباعی سے اپنی محبت بچپن سے ہے نجانے کیوں اس میں ایک خاص حُسن و جمال ایک خاص متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ رباعی کا فن صادقین کے مزاج سے بہت زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ مشکل پسندی سے اُنہیں خاص رغبت تھی کہ مصوری خود ایک بے حد مشکل فن ہے لہٰذا انہوں نے شاعری کے لئے رباعی کا انتخاب کیا۔ دوسرے روایت سے بغاوت کرنا اُن کے خمیر میں تھا۔ اُن سے یہ کہا گیا تھا کہ ”شاعر کو چالیس برس کی عمر سے پیشتر رباعی پر طبع آزمائی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ زبان و بیان و خیال پر جس حد تک رباعی کہنے کے لئے قدرت ہونی چاہیے وہ سالہا سال کے شاعرانہ ریاض کے بعد سنِ بعثت پر پہنچ جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔“ اس لئے انہوں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے سنِ بعثت سے پہلے ہی رباعی تخلیق کرنی شروع کر دی۔

جذبات کی کرتی ہیں بے نقابی باچھیں
لائی ہیں عجب دل پہ خرابی باچھیں
کھاتی ہیں تمناؤں کی چغلی اے شوخ
کھلتی ہوئی یہ تیری گلابی باچھیں

صادقین کو خود اِس کا احساس ہے کہ اُن کے یہاں تکرار ہے لیکن وہ اس اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اُن کی افتادِ طبع ہے اور اُن کا نظریہ جمال یہ ہے کہ کسی شے کا جمالیاتی مشاہدہ ہر زاویئے اور ہر پہلو سے کرنا چاہیئے" تخلیق کار کا یہ اپنا زاویۂ نظر ہے اور تخلیق کار بھی وہ ہے جو مصور ہے اس لئے فنی نقطۂ نظر سے چاہے اسے خامی قرار دیا جائے لیکن تخلیق کار کے نقطۂ نظر سے یہ بھی ایک خوبی ہے کہ اُس کے کلام میں تکرار موجود ہے۔

صادقین کی رباعیاں "غیب کے مضامین" کے ضمن میں نہیں آتیں۔ رباعیاں انہوں نے شعوری طور پر تخلیق کی ہیں اور انہیں اس پر فخر بھی ہے کہ وہ رباعی کے فن میں ماہر ہیں اور دوسرے اساتذہ کی طرح ٹھوکر نہیں کھاتے۔ اپنی بہت سی رباعیوں میں انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے اور انہوں نے وہ رباعیات جو فرمائش پر کہی ہیں وہ اِس کا ثبوت ہیں کہ شعوری طور پر انہوں نے تصویروں کے ساتھ ساتھ رباعیات کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔

صادقین کی رباعیوں میں سادگی اور شوخی کی ملی جُلی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُس میں حُسن و صداقت کی آمیزش ہے۔ آورد نہیں آمد ہے۔ زبان کی لطافت نہیں سچائی کا کھردراپن ہے۔ اُن کے یہاں قدیم تمثالیں بھی ہیں اور جدید IMAGES بھی۔ انہوں نے نئی لفظیات کے ساتھ ساتھ نئی امیجری کا بھی استعمال کیا ہے۔ اُن کے یہاں روایت کے پردے میں جدیدیت پنہاں ہے۔ بنیادی طور پر وہ مصور ہیں لہذا انہوں نے اپنی رباعیوں میں الفاظ سے تصویر کشی کی ہے اور ان تصویروں میں نئی علامتوں سے رنگ بھرے ہیں۔

صادقین کی رباعیات کا مطالعہ کرتے ہوئے دوشعرا کا خیال بار بار آتا ہے اُس میں پہلے نمبر پر فراق گورکھپوری کا نام آتا ہے۔ فراق کی رباعیات میں زبان کی سلاست، شگفتگی، نرمی اور مٹھاس نظر آتی ہے۔ انہوں نے نئی نئی ترکیبیں استعمال کی ہیں اُن کی بہت سی عشقیہ رباعیوں میں محبوب کے مختلف اعضا کی تعریف کی گئی ہے اور اس کے لئے انہوں نے نادر تشبیہات استعمال کی ہیں اور نئے اور اچھوتے استعارات سے نیاپن پیدا کیا ہے۔ یہ خصوصیات صادقین کے یہاں بھی نظر آتی ہیں۔

صادقین	فراق
ہیں ناگ سے ان زلفوں کے بل لکھوں گا	جمنا کی تہوں میں دیپ مالا ہے کہ زلف
تو جیسی ہے، بے ردوبدل لکھوں گا	جوبن شبِ قدر نے نکالا ہے کہ زلف
پہلے میں غزالہ کی بنا کر تصویر	تاریک اور تابناک شامِ ہستی
پھر حسنِ غزالہ پہ غزل لکھوں گا	زندانِ حیات کا اُجالا ہے کہ زلف
دنیا میں ہیں یہ سب سے نرالی آنکھیں	تاروں کو بھی لوریاں سناتی ہوئی آنکھ
اُف کتنی حسین ہیں یہ کالی آنکھیں	جادو شبِ تار کا جگاتی ہوئی آنکھ
ہاں پردۂ ابرو میں یہ شمشیریں ہیں	جب تازگی سانس لے رہی ہو دمِ صبح
قاتل ہیں غزال کی غزالی آنکھیں	دوشیزہ کنول سی مسکراتی ہوئی آنکھ

اسی طرح کی بہت سی رباعیات کا مقابلہ و موازنہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فراق اور صادقین کے محسوسات اور تجربات تقریباً ایک جیسے ہیں مگر فراق ایک شاعر کا دل رکھتے ہیں جبکہ صادقین ایک مصور ہیں۔ فراق اعضائے جسمانی کی تعریف میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں جبکہ صادقین کے یہاں اعتدال ہے۔ فراق نے تشبیہات و استعارات سنسکرت ادب سے حاصل کی ہیں اور اُن پر انگریزی ادب کا گہرا اثر ہے جبکہ صادقین نے اپنے گرد و پیش کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انہیں تشبیہات و استعارات میں ڈھال کر اپنی رباعیوں میں استعمال کیا ہے۔ فراق کے یہاں ہندوستانی تہذیب، رسم و رواج اور دیو مالاؤں اور ہندی زبان و ادب سے تشبیہات و استعارات، تصورات و خیالات مستعار ہیں جبکہ صادقین نے اپنے مشاہدات و تجربات اور اپنی علمی بصیرت اور مصورانہ بصارت سے کام لیتے ہوئے اپنی رباعیات میں نئی تشبیہات و استعارات تخلیق کی ہیں۔

فراق گورکھپوری کے رباعیات کے مجموعے کا نام "روپ" ہے۔ "روپ" میں جتنی رباعیات شامل ہیں وہ سب عشقیہ اور جمالیاتی نوعیت کی ہیں اور اُن میں اعضائے نسوانی کے ہر حصّے سے متعلق رباعیاں موجود ہیں۔ جمالیات کے علاوہ فراق کی رباعیوں کا اور کوئی موضوع نہیں ہے۔ اثر لکھنوی نے تحریر کیا ہے کہ فراق نے بہت سی جگہوں پر ٹھوکر بھی کھائی ہے اور اُن کی رباعیات کے بہت سے مصرعے خارج از بحر ہیں۔ کم از کم صادقین کی رباعیوں پر موضوع اور فن دونوں اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے موضوعات میں تنوع ہے اور جہاں تک رباعی کے فن کا تعلق ہے وہ اس پر قادر ہیں۔

صادقین کی رباعیات کا مطالعہ کرنے والا جوش ملیح آبادی کی رباعیات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ صادقین نے اپنی خود نوشت میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ جوش کی شاعری اور خصوصی طور پر اُن کی رباعیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جنون و حکمت کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے اپنی خود نوشت میں تحریر کیا ہے۔

"صنفِ رباعی سے پیدائشی وابستگی کے باعث "جنون و حکمت" کی خوشخط نقل شروع کر دی اور اس کا اپنا ذاتی قلمی نسخہ تیار ہونے لگا جو ایک ہفتے کی محنت شاقہ کے بعد مجلّد بھی ہو گیا اور نقل کرنے کے دوران مجھے بہت سی رباعیاں یاد ہوتی بھی چلی جارہی تھیں اور رباعی کی بحر کا اتار چڑھاؤ، اُس کے پیچ و خم کا زیر و بم مدھم انداز سے میرے قرطاسِ شعور پر صوتی اور صوری طریقے سے مزید اُجاگر ہوتا چلا جارہا تھا، رباعی کے پیکر کا ڈھانچہ لوحِ محسوسات پر بتدریج نمودار ہو رہا اور یہیں سے رباعی کہنے کے شوق کا آغاز ہوا...."

مندرجہ بالا سطور اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ دراصل صادقین کی رباعی گوئی کے شوق کو جس شخصیت نے مہمیز کیا وہ جوش ملیح آبادی ہیں۔ انہوں نے جوش سے بے حد تاثر قبول کیا اور متاثر ہو کر رباعیات تخلیق کیں۔ وہ اس حد تک جوش سے متاثر ہیں کہ انہوں نے اُن موضوعات پر رباعیات تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے جن موضوعات کا انتخاب جوش نے کیا ہے۔

جوش	صادقین
اسرار کے ہر قفل کو توڑا میں نے	خط بن کے جو کاغذ پہ سنورتا ہوں میں
آیات کی ہر شاخ کو جوڑا میں نے	حرف ہو کے جو لوحوں پہ اُبھرتا ہوں میں
دیکھا کہ صراحی میں ہے افشردۂ جہل	قدرت نے جو راز چھپایا مجھ میں
جب خوشۂ علم کو نچوڑا میں نے	اُس راز کو تم پہ فاش کرتا ہوں میں

رباعیاتِ صادقین

بخطِ

صادقین

قہاری ہے رنگِ حلیمی دیکھو
جباری ہے نقشِ رحیمی دیکھو
چھوٹا سا کوئی گناہ کر کے مولیٰ!!
میں کیوں نہ تری شانِ کریمی دیکھوں؟

آتے ہیں حسین ہاتھ میں پھول ہوتا ہے
روزانہ کوئی تحفہ وصول ہوتا ہے
صورت میں حسینوں کے کرم کی ہم پر
اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

سچائی ہے اک گناہ کر لو یارو؟
اب درد کی حد ہے، آہ کر لو یارو؟
رکھنے کو تری شانِ کریمی کی لاج
معمولی سا اک گناہ کر لو یارو؟

پھر شان میں حق کی اک جریدہ لکھو
مضمون بہت ہی چیدہ چیدہ لکھو
میں حمدِ خدا، نعتِ محمدؐ کہہ کر
پھر شانِ علیؑ میں اک قصیدہ لکھو

ہر شام کو کی ہے واہ، ڈر کے میں نے
پھر صبح کو ٹھنڈی آہ بھر کے میں نے
مولیٰ تری بخشش کو کسوٹی پہ کسا
اکا دُکا گناہ کر کے میں نے

اے شخص! نہ ہابیل نہ قابیل سے پوچھ
دریافت ہے کر قرآن سے انجیل سے پوچھ
لاہول صفات ہیں جو بڑے فن کی
جبریل و عزازیل و سرافیل سے پوچھ

تھا درد فزوں تو آہ کر کے میں نے
افلاک پہ اک نگاہ کر کے میں نے
مولیٰ کی ملائکہ سے رکھ لی کچھ بات
کل چھوٹا سا اک گناہ کر کے میں نے

اس ہستی مُنجلی سے ورثے میں ملا
اللہ کے رسولؐ سے ورثے میں ملا
قرآن کی آیات کو لکھنے کا یہ شوق
مجھ کو حضرت علیؑ سے ورثے میں ملا

ہاں ہاں یہ مری شاعری ہذیان تو ہے
تم اس کو کرید دو یہ پریشان تو ہے
یاں تو خس و خاشاک اُٹھا لایا ہوں
اس میں کوئی ہیرا ہو یہ امکان تو ہے

کُوڑے سے جو ہم لکھ کے رُباعی نکلے
کوڑے کرکٹ کی لیکے ڈھیری نکلے
اس میں سے نگارِ شاعری کی شاید
تم اس کو کرید و تو انگوٹھی نکلے

ناقد! سوئے گلزار ہی لے آیا ہوں
وہ سب کے سب اشعار ہی لے آیا ہوں
ہر وقت نہ تھا، اس میں سے نیلم چُنتا
کوڑے کا میں انبار ہی لے آیا ہوں

کب لیلیٰ فن کو گھیر لایا میں ہوں
ہر رہ سے سیر دل ہی سیر لایا میں ہوں
یہ سوچ کے شاید کہ ہو اس میں پکھراج
کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لایا میں ہوں

یہ تو نہیں فلسفے کی گھاتوں کے لیے
یہ تو ہے عطیہ جیسی ذاتوں کے لیے
شبلی کے یہ شاگرد سے کہہ دو کہ غزل
ہے حسن اور عشق ہی کی باتوں کے لیے

غزلیں کسی مہ رُو، کسی گُل رُو کو سناؤں
کاکُل والوں کو، اہلِ ابرو کو سناؤں
شعروں میں مخاطب ہے حسینوں کو کیا
پھر اُن کی بجائے کیوں ارسطو کو سناؤں؟

مینائے غزل کے حسنِ نازک کو پرکھ
اس میں سے مئے چشمِ غزالی کو چکھ
تو اس میں نہ قارورۂ بقراط کو لے
اور اس میں نہ تو فضلۂ بقراط کو رکھ

کیوں صرف حکیموں کی سمجھ میں آئیں؟
بس فلسفی لوگوں کی سمجھ میں آئیں؟
جب آئی ہی اُن سے ہیں غزل میں باتیں
تو شعر حسینوں کی سمجھ میں آئیں

حکمت کے طبق کا بوجھ غزلوں پہ نہ لاد
منطق کے سبق کا بوجھ غزلوں پہ نہ لاد
جیسے کا جو کام ہو وہ غزلوں سے نہ لے
مضمونِ ادق کا بوجھ غزلوں پہ نہ لاد

مے نوشی پہ ہے مجھ کو ناز اے ساقی!
مغرب ہے نہ عشا ہے نہ نماز اے ساقی!
لیکن ترے شیخوں سے ملاقات کے بعد
شکرانے کی پڑھتا ہوں نماز اے ساقی!

سقراط کی افیون کو غزلوں میں نہ لکھ
بقراط کی معجون کو غزلوں میں نہ لکھ
آئینۂ شعر میں ہو حسنِ ناہید
افکارِ فلاطون کو غزلوں میں نہ لکھ

ہر شب ہی میں مولا کو بہت یاد کیا
ہر روز ہنر کچھ نہ کچھ ایجاد کیا
لیکن ہے مری عمر کا حاصل وہ وقت
محفل میں حسینوں کی جو برباد کیا

پردہ جو ہٹا حسن کو مانا میں نے
ابجد کا وہیں دیکھا خزانہ میں نے
پھر نافِ گلابی کو سمجھ کر نقطہ
شفافِ شکم کو نون جانا میں نے

گردش کا ستاروں کی نظام اے ساقی!
قسمت سے اسے کچھ نہیں کام اے ساقی!
ہم پر تو بلا واسطہ کرتا ہے اثر
گیتی پہ حسینوں کا خرام اے ساقی!

چھپتی ہے سیاہی کی سیہ راتوں میں ناف
ابجد کے ہر حروف کے حجابات میں ناف
جس دم شکم نون بنایا میں نے
نقطے کی طرح آ گئی خیالات میں ناف

افلاک پہ ہے گردشیں سیاروں کی
تقدیر بدل دی ہے ناداروں کی
قسمت پہ مگر اپنی زمیں کے اوپر
ہوتا ہے اثر چال کا مہ پاروں کی

وہ سانولی کس شان سے اٹھلاتی ہے
ہاتھوں کو چلاتے ہوئے اِتراتی ہے
ہم سے کوئی چھوٹا سا لطیفہ سُن کر
ہنستی ہے تو ہنستی ہی چلی جاتی ہے

مے یاروں کی لائی ہوئی مے پیتے ہیں
اُن کی ہی "بنائی" ہوئی مے پیتے ہیں
اور اُن کے ہی ہاتھوں سے خریدے زاہد!
ہم عرش سے آئی ہوئی مے پیتے ہیں

اُس کی تو ہر اک بات ہے اعلیٰ صاحب
وہ تو قد و قامت میں ہے بالا صاحب
انداز تو ہوتا ہے ہر اک کا۔ لیکن
اُس کا تو ہے انداز نرالا صاحب

ہے وعظ عراقی بھی ہماری خاطر
ڈالی گئی باقی بھی ہماری خاطر
یہ کہہ کے کہ "مت پیو" پلانے والی
واعظ بھی ہے ساقی بھی ہماری خاطر

بنتِ حوّا نے فرق کر کے چھوڑا
ناوکِ دل پر جو برق کر کے چھوڑا
یہ دیکھتے ہی بنتِ عنب نے بڑھ کر
بیڑے کو جگر کے غرق کر کے چھوڑا

گیتی پہ نہ ہو عیش کی سیر اے ساقی!
کیوں ہم سے طیوں کو ہے بیر اے ساقی!
اُن کا یہ تقاضا ہے کہ کٹائیں ہم رات
انگور کی بیٹی کے بغیر اے ساقی!

اُف دُخترِ حوّا کا شباب اے ساقی!
چھوڑی دلِ زخمی میں نہ تاب اے ساقی!
باقی تھا جگر، بنتِ عنب کے ہاتھوں
اس کا بھی ہوا خانہ خراب اے ساقی!

حالت ہے جگر کی شاق، کیسے گذرے؟
اُف طب کا یہ طمطراق، کیسے گذرے؟
اک عمر میں ہے بناتِ عنب سے اُنس
پہلی ہے شبِ فراق، کیسے گذرے؟

مولیٰ ہے دو عالم کا بنانے والا
بندوں کو ہے پروان چڑھانے والا
ساغر مئے انگور کے درویشوں کو
ہاتھوں سے حسینوں کے پلانے والا

دیکھا ہی نہیں شیشۂ دیوار میں عکس
پایا بھی نہیں چشمۂ گلزار میں عکس
پھولوں کی تو تازگی کا میں نے اے شوخ!
دیکھا ترے آئینۂ رخسار میں عکس

بلور کا جگ ہے کہ حسیں لاتے ہیں
دکھتی ہوئی رگ ہے کہ حسیں لاتے ہیں
مولیٰ ہی تو بھیجتا ہے مینا ہم کو
یہ بات الگ ہے کہ حسیں لاتے ہیں

میرے لئے مطلوب بس اک شے ہوتا ہے
ساغر میں وہ ملتی ہوئی مے کے ہوتا ہے
مولیٰ کی نوازش میں حسینوں کا کرم
ملتا ہے تو دو آتشہ ہی ہوتا ہے

گر جام کو ملے حلقۂ تدبیر کہاں
تدبیر کو بنتی ہوئی تقدیر کہاں
جس میں غم دنیا کو جکڑ دیتے ہیں
جاموں کے تسلسل کو وہ زنجیر کہاں

یہ جو غم دنیا ہے یہ کم کرتا ہے
معشوق کو اور مے کو بہم کرتا ہے
نومیدی کے عالم میں اچانک اکثر
اللہ فقیروں پہ کرم کرتا ہے

زاہد اشکِ ناب سے کرتا ہوں وضو
تیری طرح کب آب سے کرتا ہوں وضو
تو جسم کا لوٹے سے مگر روح کا میں
مینائے مئے ناب سے کرتا ہوں وضو

ہے جو فلکِ حسن کا تارا مکھڑا
مہکا ہوا، سالونا، پیارا مکھڑا
گلدستے کی چلمن سے نظر آتا ہے
پھولوں میں سے چھن چھن کے تمہارا مکھڑا

بس ایک جھلک اُس کی وہیں دیکھتے ہیں
ہم دیکھ کے پھر اور کہیں دیکھتے ہیں
اِس خطرے سے شاید کہ نظر لگ جائے
تا دیر حسینوں کو نہیں دیکھتے ہیں

یوں یارِ طرحدار کو ہم دیکھتے ہیں
اک بولتے شہکار کو ہم دیکھتے ہیں
باتوں کے بہانے کا ہر اک پردہ حسین
حسنِ لب و رخسار کو ہم دیکھتے ہیں

شاخوں میں سب وہ حسن رکھتے ہم ہیں
مکھڑے کا نمک نظر سے چکھتے ہم ہیں
جو دخترِ باغباں کے جلووں کے ہیں راز
وہ پردۂ برگِ گل میں رکھتے ہم ہیں

محفل میں مکالمے میں میرا وہ خروش
باتوں میں کسی شے کا نہیں تھا مجھے ہوش
میں بزم میں محوِ گفتگو تھا جس سے
تنہائی میں اُس کے ساتھ کیوں ہوں خاموش؟

محفل میں ہر اک بات کو کہہ جاتا ہوں
گفتار کی امواج میں بہہ جاتا ہوں
تنہائی میں جب کوئی حسیں ہوتا ہے
خاموش ہی بیٹھا ہوا رہ جاتا ہوں

بنیادِ عدم کی ہل گئی ہے اے دوستے!
باچھ اپنی خوشی سے کھل گئی ہے اے دوستے!
یہ زندگی جیسی بیش قیمت اک شے
مجھ جیسے بشر کو مل گئی ہے اے دوستے!

کل بات تو پھر یار کو دیکھا میں نے
حسنِ لب و رخسار کو دیکھا میں نے
خاموشی کے لمحات تھے لیکن پھر ہم
تا دیر دلدار کو دیکھا میں نے

غم کیسے ہو کچھ تو کر گیا ہوں اے دوستے!
دل کا ہوا اُس میں بھر گیا ہوں اے دوستے!
لاہور میں اک نقش بنا لینے کی
شاید کہ خوشی میں مر گیا ہوں اے دوستے!

طلسمِ ذات

احمد ندیم قاسمی، ہاشم رضا، نورالحسن جعفری، منیر احمد شیخ، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمود الرحمن،

نصراللہ خاں، منو بھائی، زاہدہ حنا، ڈاکٹر سلمان عباسی، شیخ عزیز،

توصیف احمد خاں، سلطان احمد، ستارہ جعفری، حسین امین،

جاوید صدیق، مجاہد لکھنوی اور حسنین جاوید

احمد ندیم قاسمی

صادقین کی انفرادیت

مصور صادقین، خطاط صادقین، شاعر صادقین ہمارے فنون اور ہماری تہذیب اور ہمارے کلچر پر اپنے انمٹ اثرات کندہ کر کے ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے مگر وہ اپنی مصوری اور خطاطی اور شاعری کے دم سے اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسان کی حسِ جمال زندہ ہے۔ متعدد اصحاب کا خیال ہے کہ صادقین نہ اچھا مصور تھا اور نہ اچھا خطاط تھا اور نہ اچھا شاعر تھا۔ "شومین شپ" کا ماہر تھا اور خود کو "فقیر" بھی اس لئے لکھتا تھا کہ اس طرح اپنی امارت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ صادقین کے مداحوں کو بعض لوگوں کے اس طرح کے خیالات سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ چغتائی کی تصویروں کے چہروں کو غیر انسانی چہرے کہنے والے بھی موجود ہیں کہ آنکھوں کے گوشے کانوں میں گھسے جا رہے ہیں۔ اور ہاتھ کی بند مٹھی کھلے تو ایک ایک انگلی کی لمبائی ایک ایک بالشت نکلے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار چغتائی کی تصویروں کی جو نمائش الحمرا (لاہور آرٹ کونسل) میں منعقد ہوئی تھی اس میں چغتائی صاحب نے چند نیوڈز بھی رکھی تھیں۔ ایک نہایت محترم ادبی و علمی شخصیت نے یکایک مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور چغتائی کی ایک "نیوڈ" کے سامنے کھڑا کر دیا پھر فرمایا "انسانی جسم کی اس ہیئت کذائی کو دیکھو جس سے صاف ظاہر ہے کہ چغتائی انسانی جسم کی اناٹومی سے بے خبر ہے چنانچہ یہ "نیوڈ" تصویریں دیکھ کر مجھ پر یہ راز منکشف ہوا ہے کہ چغتائی اپنی تصویروں کو اتنے بہت سے اینا رو رانیا رکپڑے کیوں پہناتا ہے۔ دراصل اس طرح وہ انسانی جسم کی اناٹومی سے اپنی بے خبری کو چھپانا چاہتا ہے۔"

جب لوگ چغتائی کے سے عظیم مصور کے بارے میں اس طرح کی گفتگو کر سکتے ہیں اور علامہ اقبال تک کو شاعر کی بجائے (طنزاً) واعظ قرار دیتے ہیں اور اس صدی کے بے بدل خطاط حافظ یوسف سدیدی تک کے نقائص نکالنے پر قدرت رکھتے ہیں وہ اگر صادقین پر طعنہ زن ہوتے ہیں تو اس سے صادقین کی عظمت میں کمی نہیں آسکتی۔ مجھے یاد ہے کراچی میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی بڑے اہتمام سے منائی گئی تھی۔ میں بھی اس تقریب میں شامل تھا۔ لاہور سے مولانا غلام رسول مہر اور پروفیسر حمید احمد خاں بھی تشریف لائے تھے۔ میں ان دونوں بزرگواروں سے ملنے پیر حسام الدین راشدی کے دولت کدے پر حاضر ہوا تو یہ زعماء صادقین کی وہ تصویریں دیکھنے جا رہے تھے جو اس نے غالب کے شعری فن سے متاثر ہو کر تخلیق کی تھیں۔ میں یہ نمائش دیکھ چکا تھا۔ صادقین کے گنے چنے چند رنگوں (بطور خاص نیلا اور کالا) اور انسانی پیکروں کی لمبی لمبی گردنوں اور ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کے حوالے سے میرے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ یہ بزرگانِ علم و فن بہت بدمزہ ہوں گے کیونکہ چغتائی کے فن کے ان پرستاروں کو نہ وہ دلآویز اور ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت رنگ نظر آئیں گے اور نہ چغتائی کے وہ انتہائی باریک اور دھڑکتے ہوئے خطوط دستیاب ہوں گے اور یوں وہ بے خیالی میں نوجوان صادقین کی ہمت شکنی کر بیٹھیں گے مگر جب ان تینوں بزرگوں نے تین چار درجن تصویروں کو دیکھنے میں دو ڈھائی گھنٹے لگا دیئے تو معلوم ہوا کہ وہ صادقین کی غالب شناسی پر عش عش کر رہے ہیں۔ اور حیران ہو رہے ہیں کہ اس دھان پان نوجوان نے یہ بصیرت کہاں سے سیکھی ہے کہ غالب کے اشعار اس کی تصویروں میں جگمگا اٹھے ہیں اور اسے اشعار کو تصویروں میں منتقل کرنے کی یہ بے پناہ مہارت اس عمر میں کیسے حاصل ہو گئی ہے اور صادقین کی تجرید میں کتنی غیر مبہم تفاصیل چھپی ہوئی ہیں اور تصویر کشی کے فن پر اسے کتنا بے پناہ عبور حاصل

ہے۔ جب انہوں نے یہ سب باتیں صادقین سے کہیں تو اس کی آنکھیں کچھ یوں جگمگائیں جیسے ان کی پتلیوں میں چراغ جلنے لگے ہوں۔ اس نے "ابھی میں کس قابل ہوں" اور "یہ سب آپ کا حسنِ نظر ہے" کے سے رسمی جملے ادا کرنے کا تکلف نہیں کیا بلکہ اس دادِ تحسین کو اس نے کچھ اس انداز سے قبول کیا جیسے یہ سب کچھ اس کا حق ہو۔ اس روز میں نے صادقین کی خود اعتمادی کا یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تھا۔

صادقین سے باقاعدہ تعارف سے پہلے اس نے رسالے کے ایک کنٹری بیوٹر کی حیثیت سے مجھے خط لکھا۔ ان دنوں بھی ہاجرہ مسرور اور میں رسالہ "نقوش" نکالتے تھے۔ ہم دونوں اس غیر معروف "صادقین صدقی" کے سلیقے کی داد دیتے تھے کہ اس نے اپنی رباعیاں اور قطعات کتنے اہتمام سے ایک ننھے سے کتابچے کی شکل میں اتنے خوبصورت خط میں لکھ کر بھجوائی ہیں۔ بعد میں صادقین کے ساتھ جب بھی اس نوخیز "صادقین صدقی" کا ذکر چھڑا وہ خوب ہنستا تھا اور کہتا تھا "دیکھیے ابتدا ہی سے ہمارا معیار کتنا بلند تھا کہ ہم اپنے چھپنے کا آغاز ہی "نقوش" کے سے رسالے سے کرنا چاہتے تھے۔"

مجھے صادقین کا دوست کہلانے کا اعزاز تو حاصل نہیں ہے مگر وہ مجھ سے جب بھی ملا بڑے پیار اور احترام سے ملا۔ چند مرتبہ وہ میرے دفتر بھی آیا۔ کئی مرتبہ میں اس کے ٹھکانوں (عجائب گھر، اوپن ایئر تھیٹر، انڈسٹریل ہوم اشاف کالج وغیرہ) میں اس سے ملنے گیا۔ اسے کام کرتے بھی دیکھا، اپنے مداح خواتین و حضرات کو خوش کرتے بھی دیکھا، چند سیکنڈ کے اندر خطاطی کے چند سو نمونے تیار کر کے ادھر ادھر بانٹتے بھی دیکھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ اس کے اندر تخلیقِ فن کا یہ آتش فشاں کہاں سے آیا ہے کہ وہ جس چیز کو چھوتا ہے اسے امر کر دیتا ہے۔ عجائب گھر میں اس نے خطاطی کے جو غیر فانی شاہکار دیواروں اور چھتوں پر منتقل کئے ہیں وہ حیرت انگیز حد تک متوازن اور خوبصورت ہیں۔ عمارتیں تو فانی ہوتی ہیں اس لئے قبل اس کے کہ عجائب گھر کی عمارت کو کوئی گزند پہنچے۔ صادقین کے ان شاہ پاروں کو سیلولائڈ میں محفوظ کر لینا چاہیئے پھر جب میں نے منگلا ڈیم میں اس کے میورال دیکھے تو حیرت زدہ بلکہ مرعوب ہو گیا۔ دراصل مجھے تعجب تھا کہ انسانی ارتقاء کی کہانی کے کرداروں کو اس نے کس طرح دیواروں پر منتقل کیا ہو گا۔ جب کہ ان میں سے ہر ایک کی لمبائی چوڑائی عام انسانی جسم سے بیسیوں گنا زیادہ ہے اور وہ محض کھڑے نہیں ہیں بلکہ مصروفِ عمل ہیں۔ صادقین نے ملک کی کئی دوسری عمارتوں میں بھی میورال تخلیق کئے ہیں مگر میری ذاتی رائے میں منگلا ڈیم کا میورال اس کے شاہکاروں میں سرِ فہرست رکھا جا سکتا ہے۔

صادقین شاعر بھی بلا کا تھا۔ اس نے اپنے جذبہ و خیال کے شعری اظہار کے لئے اردو کی اصناف شاعری میں سے سب سے مشکل صنف یعنی رباعی کو منتخب کر رکھا تھا۔ کتنی بار اس سے اس کی رباعیاں سننے کا اتفاق ہوا۔ اور ہر بار محسوس ہوا کہ مصوری اور خطاطی کی طرح اس کی شاعری بھی مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ اور وہ رباعی ایسی صفائی اور سلاست اور سہولت سے کہنے لگا ہے اور رباعی کے آخری مصرع میں اس غضب کی ضرب لگاتا ہے کہ متاثر ہوئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ آج سے کئی برس پہلے "جنگ" ہی میں "لاہور لاہور ہے" کے زیرِ عنوان میں نے صادقین کی رباعیات کا تنقیدی بلکہ تحسینی جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ صادقین میری اس کوشش سے اتنا خوش ہوا کہ کہنے لگا "اب کسی روز فقیر کے ہاں تشریف لائیے کہ آپ کا ایک "پورٹریٹ" بنا کر آپ کی نذر کیا جائے۔" میرے پورٹریٹ کا یہ خیال اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ جب بھی ملتا تھا یہی فرمائش کرتا تھا اور میں ایسا قلیل الفرصت قلمکار کبھی اس کے ہاں جا کر اسے ایک "سٹنگ" تک نہ دے سکا۔

صادقین اس دور کی ایک نابغہ۔۔ ایک جینئس شخصیت تھا اس کو بین الاقوامی شہرت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل گئی تھی بلکہ اس نے اپنی مہارت اور عظمت کو یورپ کے بڑے نک چڑھے نقادانِ فن سے بھی تسلیم کرا لیا تھا۔ یورپ کے کتنے ہی تصویر کدے اسی لئے صادقین کی تخلیقات سے مزین ہیں۔ یقیناً وہ لوگوں کو متاثر کرنے کا فن جانتا تھا مگر اس کے پاس جو مقناطیس تھا وہ دراصل اس کے فن کی انفرادیت تھی۔ اسی لئے تو اس نے جب بھی کسی کو متاثر کیا ہمیشہ کے لئے متاثر بلکہ مسحور کر لیا۔

۱۸ مئی کو پنجاب آرٹس کونسل (فیصل چوک) کی گیلری میں صادقین کی تازہ تصویروں کی ایک نمائش شروع ہوئی ہے خود صادقین نے نقش و

نگار صادقین، تازہ بہ تازہ نو بہ نو" کا نام دیا ہے۔ گیلری میں داخل ہوتے ہی یا ابتدائی چند تصاویر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ صادقین بدل رہا ہے اور یہ تبدیلی ارتقائی ہے۔ سب سے اہم اور بنیادی تبدیلی رنگوں کی ہے۔ بہت عرصہ تک صادقین چند مخصوص رنگ ہی استعمال کرتا رہا۔ یہ ایسے رنگ تھے جو اسکے داخلی کرب اور جستجوئے حقیقت کی راہ پُرخار کی اذیتوں اور آزمائشوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اب اس کے رنگ بدلے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکا نقطۂ نظر، مسائلِ حیات کے بارے میں اس کا ردعمل، کائنات کی وسعتوں اور امکانات سے متعلق اسکی سوچ کا انداز بھی بدلا ہے اور صادقین کی رباعیاں اس تبدیلی کی بھرپور تائید کرتی ہے جو اسکی نئی تصاویر کے پہلوؤں میں ننھی منی تختیوں پر اسکی خوبصورت اور رواں اور متحرک خطاطی کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ اور اس تبدیلی کی بھی، جو اس کے فن میں خوشگوار انداز میں آئی ہے۔ اور جس نے اس کے فن کے افق حدِ نظر تک پھیلا دیئے ہیں۔

اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے دعوت نامے میں صادقین نے اعلان کیا ہے کہ قطبین کے مابین جہاں گردی کے بعد، شہر لاہور میں ایک پُراسرار پہاڑی پر پناہ لے کر "شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا" کی صداقت کی توانائی کے سبب فراوانی میں بنائے ہوئے نقش و نگار "صادقین تازہ بہ تازہ نو بہ نو۔ تصویر کے جوکھٹے سے نکل کر پنجاب آرٹ کونسل کے توسط سے آپ کے سامنے حاضر ہو رہے ہیں۔ کونسل کے اراکین آپ کے منتظر اور خود فقیر صادقین بہ شرفِ ملاقات کے لئے موقع پر موجود ہوگا۔" یہ پُراسرار پہاڑی دراصل لاہور کے وسیع و عریض باغ جناح کی وہ معروف پہاڑی ہے جس کی چوٹی کا اوپن ایئر تھیٹر نا معلوم کتنے ہی عظیم تہذیبی اجتماعوں کا مرکز رہا ہے، اسی تھیٹر کے مشرقی جانب چند کمرے ہیں جن میں سے دو تین کمروں میں "فقیر صادقین" دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ آج سے ربع صدی پہلے مشہور مشتو آرزوبی نے انہیں میں سے ایک کمرے میں تہذیب و فن کی معروف شخصیتوں کے "بُت" تیار کئے تھے۔ دراصل پہاڑی کی اس چوٹی پر چاروں طرف کا منظر دیدنی ہے۔ خاص طور پر شام سے پہلے جب باغِ جناح اور ملحقہ گلستانِ فاطمہ کے سبزہ زاروں اور کل کروں میں لاہور کے خواتین و حضرات امڈ پڑتے ہیں تو یہ مناظر بولنے لگتے ہیں۔ پھر بلند درختوں کی "اسکائی لائن" کے اوپر کھلا آسمان صادقین کے سامنے صبح سے رات تک کتنے ہی رنگ بدلتا ہے۔ لوگ اس کے پاس آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں۔ وہ ان کی مدارات کرتا ہے۔ ان کی گفتگو میں حصہ لیتا ہے مگر تخلیق فن کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسی لئے تو میں نے ایک بار انہی کالموں میں لکھا تھا کہ صادقین کے اندر تخلیق کا ایک آتش فشاں ہے۔ اس آتش فشاں کو اپنی آسانی کے لئے "جن" کہہ لیجئے۔ اتنی آمد اتنی بے ساختگی اور اتنی بھرپور روانی بہت کم تخلیق کاروں کے حصے میں آتی ہے۔ ڈیڑھ دو مہینے کے اندر صادقین نے یہ چالیس کے قریب تصویریں اسی پُراسرار پہاڑی پر بیٹھ کر بنائی ہیں۔ جسے اس کے عقیدت مند "تلّہ صادقین" کہنے پر مُصر ہیں۔ مگر وہ خود سوچ رہا ہے کہ اس پہاڑی کا نام "کوہِ الوان" کیسا رہے گا!

صادقین ننھی ننھی تختیوں پر انتہائی فنکاری سے لکھی ہوئی اپنی تازہ رباعیوں کو عجیب و غریب نام دیتا ہے۔ وہ تصویروں کی نمائش کو ضیافتِ الوان و خطوط قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ بڑی سے بڑی ضیافت میں بھی ننھی ننھی پیالیوں میں چٹنی کا بندوبست ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ رباعیاں اس ضیافتِ الوان کی چٹنی ہیں۔ میں نے بحیثیت شاعر اس ضیافت میں شرکت کا آغاز اس "چٹنی" ہی سے کیا۔ اور یہاں بھی مجھے وہ واضح تبدیلی جلوہ گر نظر آئی جو گیلری میں داخل ہوتے ہی "اطلس کے پہلے دو ورق" میں نمایاں نظر آتی ہے۔ جس طرح نمائش کی یہ پہلی تصویر دیکھنے والوں کو ایک نئے صادقین سے متعارف کراتی ہے، اسی طرح گیلری میں داخل ہونے سے پہلے ہی صادقین ہی کے ہاتھ سے جلی حروف میں لکھی ہوئی ایک رباعی لوگوں کو چونکاتی ہے جس میں صادقین نے بظاہر ایک رندانہ اور لاابالیانہ سا اعلان کیا ہے مگر دراصل اپنی خطاطی، اور خاص طور پر قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی خطاطی کے سلسلے میں بعض "معترضین" کی قطعی طور پر متعصبانہ رائے زنی سے متعلق اپنے فنکارانہ اور آزادانہ ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

لو کر چکا صادقین ترکِ اسلام
خطاطی نہیں۔ اب ہے بناتا اصنام
ماتھے پہ وہ اب کھینچ رہا ہے قشقہ
کل لوح پہ لکھتا تھا جو اللہ کے نام

اس رباعی کے نیچے صادقین نے میر تقی میر کا حوالہ دے کر پڑھنے والوں کا کام آسان کر دیا ہے۔ ان کے ذہن میں میر کا یہ شعر فوراً گونجنے لگتا ہے۔

میرے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

میں سمجھتا ہوں، صادقین خطاطی سے تائب نہیں ہوا ہے، وقتی طور پر دست کش ہوا ہے اور یہ دست کشی نتیجہ ہے اس قطعی بے بنیاد اور بے معنی تنقید کا، جو اس کے سلسلے میں بعض نام نہاد زہاد کی طرف سے روا رکھی گئی۔ اس ستم کو فن کی دنیا کبھی نہیں بھولے گی کہ وہ فن کار جس نے خطاطی کو ایک قطعی نیا بُعد عطا کیا، بعض پیشہ ور خطاطوں اور فقہ کے بعض اجارہ داروں کا ہدفِ طعن بنا۔ ورنہ صادقین اندر سے کیا ہے، یہ خود اس سے سنیئے:

اے شیخ، حجابات برآمد ہوں گے
لاہوتی خیالات برآمد ہوں گے
قشقہ نہ مٹا، ورنہ میرے ماتھے سے
سجدوں کے نشانات برآمد ہوں گے

اور اپنے سجدوں کے نشانات اس نے شعوری طور پر چھپائے ہیں کیونکہ سطح بینوں کے نزدیک ان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے:

پھر کیا کیا۔ کچھ شیخ جو آئے۔ میں نے
خیمے کے وہ باہر ہی بٹھائے میں نے
اور جلدی سے ماتھے پہ بنا کر قشقہ
سجدوں کے نشانات چھپائے میں نے

اس ضمن میں صادقین نے کچھ ڈھکا چھپا رکھا ہی نہیں۔ بالکل واضح الفاظ میں اور قطعی غیر مبہم لہجے میں اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ:

یہ تو نہیں قدرت کا اشارہ ہوا
میں پھر چلا سوئے کفر، بارہا ہوا
اسلام سے بندے کا مشرف ہونا
اسلام کے مفتی کو گوارا نہ ہوا

اور اس رباعی میں تو صادقین جیسے چیخ اٹھا ہے:

یارب، یہاں مومن کا گزارا ہی نہیں
کافر ہی رہوں گا، کوئی چارہ ہی نہیں
ہونا اگر میں چاہوں مسلماں سچا
یہ جھوٹے مسلماں کو گوارا ہی نہیں

صادقین کی نئی تصویروں پر دو موضوعات چھائے ہوئے ہیں۔ وحدت اور مرد و زن۔ وحدت اور اکائی کے عنوان سے متعدد تصویریں اس نمائش میں شامل ہیں جن میں ایک سے زیادہ اجسام بڑے توازن اور تناسب کے ساتھ اکائی میں بدلے نظر آتے ہیں۔ مرد و زن کے عنوان سے جو تصاویر سجائی گئی ہیں ان میں موضوع کی تکرار کہیں نہیں ہے بلکہ مرد و زن کے سماجی اور جذباتی اور تہذیبی رشتے کتنے مختلف اور کتنے ناقابلِ یقین زاویوں سے مڑتے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہو رہے ہیں۔ البتہ ان تصویروں میں محسوس ہوتا ہے کہ نازک اندام عورت پر مرد کا مضبوط اور توانا ہاتھ، تحفظ کا سایہ کیے کھڑا ہے۔ ممکن ہے خواتین کو صادقین کا یہ اسلوب نہ جچ سکے، مگر ان کی خاطر یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں عورت کو کمزور و نحیف ثابت نہیں کیا گیا، اسے حسن و جمال اور نزاکت و صباحت کا ایک ایسا خزانہ بنا کر پیش کیا گیا ہے جس کا تحفظ ہر مرد کا ایمان ہونا چاہیے۔ سبھی تو نہیں مگر بیشتر تصویریں انہی دو موضوعات کے متنوع اظہار جیسی "عمارات بلند" اور "عکس خورشید" کی سی تصویریں، جو صادقین کے ماضی کے حوالے سے، ایک قطعی نئے صادقین سے ہمیں متعارف کراتی ہیں۔ بظاہر ان موضوعات

سے الگ آزاد اور منفرد ہیں۔ صادقین نے چند اپنی تصویریں بھی اس نمائش میں رکھی ہیں۔ ان میں بھی صادقین صاف طور پر بولا ہوا ہے۔ اب وہ محض کرب کا نمائندہ نہیں ہے۔ آفاق میں پھیلی ہوئی فکر کا نمائندہ ہے۔ البتہ فکر کرب سے آزاد نہیں ہے اور اسے آزاد ہونا بھی نہیں چاہیئے کہ کرب اگر آرٹسٹ کو بالکل مفتوح نہ بنالے تو وہ اسے مزید کرید، مزید کھوج، مزید جستجو پر ابھارتا ہے اور صادقین کا کرب یہی مثبت اور تخلیقی کرب ہے۔

مجھے اندازہ ہے کہ صادقین کی تصویروں اور "رباعیات" کے اعلانوں سے بعض اونچے ماتھوں پر اکثر ابہت سے بل پڑجائیں گے مگر حسن و صداقت کے متلاشی فنکار قوی فن کے ان "خیر اندیشوں" کی مصلحتوں سے بلند ہوتے ہیں ان تصویروں میں وہ لذتیت نام کو نہیں ہے جو بھولوں بھلوں کو بھی فحش بنا سکتی ہے۔ ان تصویروں کے دانشگاف نوعیت کے اظہار میں وہ طہارت ہے جو صادقین کی مصوری اور شاعری اور شخصیت کا ایک لازمی جز ہے۔

فنی تحسین سے نابلد لوگوں کی بات الگ ہے کہ اگر ان کے اصولوں اور معیاروں کو بروئے کار لایا جائے تو علامہ اقبال کے اس طرح کے اشعار بھی خارج کردیئے جائیں۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

مجھے ایک بزرگ کبھی نہیں بھول سکتے جو علامہ اقبال کے بڑے معتقد تھے اور اسی انتہائی عقیدت کی وجہ سے علامہ پر اس طرح کے اعتراضات وارد کرتے رہتے تھے کہ جب انہوں نے غروب آفتاب کا اس طرح کا منظر کھینچا تھا تو انہیں تذکیر و تانیث کے معاملے میں احتیاط برتنا چاہیئے تھی۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

ان کا استدلال یہ تھا کہ اس طرح کے اشعار سے نوجوان نسل کا اخلاق خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ سورج مذکر ہے، شام مونث ہے۔ اس تذکیر و تانیث سے نوجوان اپنے ڈھب سے لذت یاب ہوں گے اور راہ چلتی سیہ قبا لڑکیوں کو پھول مارنے لگیں گے!۔ اب اگر صادقین کی نئی تصویروں کے بارے میں اس طرح کا استدلال قبول کرلیا جائے تو پھر یہاں سب کچھ قابلِ اعتراض ہے۔ البتہ اگر عقل و شعور اور ذوقِ لطیف کی تہذیب ہوچکی ہو تو یہ نمائش خود صادقین کے الفاظ میں یقیناً ایک ضیافتِ الوان و خطوط ہے جسے دیکھ کر ذہنوں میں نرمی اور دلوں میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ اور ہمارے قومی مزاج میں نرمی اور گداز کی بڑی کمی پیدا ہو رہی ہے۔

آخر میں صادقین کی چند اور رباعیاں ملاحظہ کیجئے جن میں اس کے تخلیقی ذہن کی طہارت، اسکی فکر کی توانائی اور حسن و جمال سے فیض یاب ہونے کی معصومانہ خواہش کا بڑے سلیقے سے اظہار ہوا ہے۔ پہلی رباعی میں وہ اجارہ دارانِ مذہب پر کتنا مؤثر وار کرتا ہے:۔

تن کے لئے احکامِ دقیقہ بھی سناؤ!
غسلِ مخصوص کا سلیقہ بھی بتاؤ
نظریں برا کام کرکے طاہر ہوں۔ مجھے
اے اہلِ شریعت! وہ طریقہ بھی بتاؤ

پھر صادقین جن حالات اور کیفیات میں تخلیقِ فن کرتا ہے اسکی ایک جھلک اس رباعی میں دیکھئے:

دن رات، ہو جب شام یا پو پھوٹتی ہے
کنگھی مرے ہاتھوں سے نہیں چھوٹتی ہے
پھر کام سے دکھ جاتا ہے اتنا مرا ہاتھ
روٹی کو جو توڑوں تو نہیں ٹوٹتی ہے

اور آخر میں دو دلربا رباعیاں:

صفحہ ۱۲۰ پر

سیّد ہاشم رضا

ایک عہد ساز شخصیّت

۱۰ر فروری ۱۹۸۷ء کو صبح کاذب کے وقت کراچی کے افق پر ایک ایسا ستارہ ڈوبا جو پھر کبھی نمودار نہ ہوگا، یہ سید صادقین احمد نقوی تھے جو ۵۷ برس پہلے امروہے میں پیدا ہوئے اور کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۱۲ر فروری کو امام بارگاہ رضویہ میں مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب پیش کرنے کے لئے قرآن خوانی اور مجلس میں جوق در جوق مداحانِ صادقین نے شرکت کی اور عقیدت کے آنسو بہائے۔ سوگواروں کی کثیر تعداد دیکھ کر میرے ذہن میں جناب سیماب اکبر آبادی کا یہ مصرعہ گونجا ؎

میں بعد مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں

استاد ذوقؔ نے کہا تھا ؎

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے یہی نا، کہ دو پشت چار پشت

صادقین کا نام ان کے فن سے زندہ جاوید بن گیا ہے، ان کا فن ان کی زندگی پر اس طرح محیط ہوا کہ انہیں شریکِ حیات کے انتخاب کی فرصت ہی نہ ملی ایک مرتبہ انہوں نے حضرت غالبؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن، پھر بھی کم نکلے

اور کہا کہ "میرا تجربہ غالبؔ کے تجربے کے برعکس ہے میری ہر خواہش اللہ نے پوری کی۔ میں نے کبھی کوئی ایسی خواہش نہیں کی جو میری دسترس سے باہر ہو" انہیں نفسِ مطمئنہ کی دولت عطا ہوئی تھی جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں،

مجھے ان کے والد ماجد سید سبطین احمد نقوی مرحوم نے بڑے فخریہ انداز میں اپنے بیٹے کا یہ واقعہ سنایا: "۱۹۶۱ء میں جب میں کربلائے معلیٰ میں مقیم تھا صادقین نے مجھے پیرس سے خط بھیجا جہاں ان کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی اور لکھا کہ کراچی سے پیرس تک کا آدھا راستہ آپ طے کر چکے ہیں۔ اب آپ پیرس آ جائیں کیونکہ عرصے سے میں آپ کی زیارت سے محروم ہوں، بغداد سے پیرس اور پیرس سے بغداد کا ٹکٹ بھیج رہا ہوں، اسی کے ساتھ ایک پرچے پہ اپنا پتہ لکھ رہا ہوں جس کو احتیاط سے وقتِ سفر اپنی جیب میں رکھ لیجئے گا۔"

سبطین مرحوم نے کہا کہ جب میں آرلی ایئرپورٹ پیرس پہ پہنچا اور جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ غائب تھا، میں اپنی خفت الجھن اور پریشانی پر ہاتھ مل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس وسیع شہر میں میں صادقین کی رہائش گاہ پہ پتے کے بغیر کیونکر پہنچوں گا۔ میں بغداد کی واپسی کے لئے پر تول رہا تھا کہ ایک ایئر ہوسٹس آئی اور پوچھنے لگی کہ آپ کو کہاں جانا ہے، میں نے صرف دو لفظ کہے SADEGAIN'S FATHER

وہ فرطِ عقیدت سے اچھل پڑی کیونکہ وہ صادقین کی FAN تھی اور ان کی تصویروں کی دلدادہ تھی اس نے میرا بریف کیس اپنے ہاتھ میں لیا،

میرا اسباب نکلوایا اور میرے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر مجھے صادقین کے گھر پہنچا دیا، صادقین جب اسکول میں پڑھتا تھا تو اسے ڈرائنگ کی لت پڑ گئی تھی، جغرافیہ اور حساب کی کاپیوں میں بھی ڈرائنگ ہی کی مشق کرتا تھا۔ میں اکثر اس کی گوشمالی کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کیا تم ڈرائنگ ماسٹر بننا چاہتے ہو۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہی ڈرائنگ اسے بین الاقوامی شہرت عطا کرے گی۔"

ایک دوسرا واقعہ میں نے صادقین کی زبانی سنا وہ لاہور آرٹس کونسل کی عمارت میں اپنے مداحوں کے جھرمٹ میں سورہ رحمٰن کی آیتوں پر خطاطی کے نمونے دکھلا رہے تھے کہ کالج کی کئی طالبات نے انہیں گھیر لیا، انہیں دیکھ کر صادقین نے یہ آیت پڑھی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

مجمع میں ایک زاہد خشک بہ ریش دراز مولانا بھی تھے جنہوں نے کہا، صادقین صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں کہ قرآن کی آیت کا بے جا استعمال کرتے ہیں اور لاحول پڑھا۔ صادقین نے مسکرا کر جواب دیا، جناب مولانا آپ کو اس موقع پر شیطان الرجیم یاد آیا اور مجھے ارحم الراحمین اور پھر میر انیس کا یہ شعر پڑھا۔

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

مولانا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

مجھے ایک تیسرا واقعہ یاد آیا جس کے چشم دید راوی سید امروہوی ہیں، صادقین کی شہرت سن کر بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے انہیں اپنے آبا و اجداد کے وطن میں آنے کی دعوت دی اور اپنے فن کے مظاہرے کی فرمائش کی۔ ان کی مصوری اور خطاطی سے متاثر ہو کر وزیر اعظم بھارت نے مراد آباد کے ڈپٹی کمشنر کو حکم دیا کہ سبطین صاحب کا گھر جو امروہے میں EVACUEE PRA-PERTY کی حیثیت سے حکومت کی تحویل میں تھا صادقین کو تحفتاً پیش کیا جائے۔ صادقین جب مراد آباد پہنچے جس ضلع میں امروہہ واقع ہے، تو ڈپٹی کمشنر نے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا اور اپنی موٹر میں بٹھا کر انہیں امروہہ لے گئے۔ امروہے میں ہزاروں مشتاقانِ دید صادقین کے منتظر تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے حسبِ ہدایت صادقین کے آبائی مکان کی کنجی ان کے حوالے کی اور کہا کہ آج سے یہ مکان آپ کا ہے۔ صادقین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں تو پاکستان میں رہتا ہوں اور وہاں ہر طرح میری پذیرائی ہوتی ہے گھر تو گھر والی کے لئے ہوتا ہے اور میری کوئی گھر والی نہیں۔ میں بھارت کی وزیر اعظم کی اس پیش کش کی بہت قدر کرتا ہوں اور یہ مکان اہلِ امروہہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس مکان میں ایک لائبریری قائم کی جائے۔ اہلِ امروہہ نے اس پیش کش کی بڑے جوش و خروش سے داد دی، خدا کے فضل سے ہمارے پاکستان میں بڑے مصور اور خطاط ہیں اور مردم خیز خطے میں بہت سے مصور اور خطاط پیدا ہوں گے لیکن کوئی صادقین جیسا نہ ہوگا بقول غالب

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

میں نے جب صادقین کی مرگِ ناگہانی کی خبر سنی تو میرے جذبات ان شعروں میں رونما ہوئے۔

صادقین احمد مدام سے ہو گئے ہیں ناگہاں
کیا کہیں جز الفراق والحفیظ والاماں
سرنگوں ہیں ملک بھر کے رنگ سازوں کے قلم
نقش گریاں ہیں، در و دیوار ہیں نوحہ کناں
سورہ رحمان کی تفسیر کس خوبی سے کی
ذہن میں پنہاں تھے جو منظر کیا ان کو عیاں
چٹکیوں میں زندگی کی گتھیاں سلجھا گئے

صفحہ ۱۵۶ پر

نورالحسن جعفری
کراچی

صادقین: کچھ یادیں

صادقین کا نام میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں سنا۔ میرے ایک بچپن کے دوست اور ہم جماعت شاہ محمود سلیمان کراچی سینٹرل ایکسائز کے سربراہ تھے۔ یہ مثبت پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں جس چیز کا شوق ہو اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ مصوری، فوٹو گرافی، ہاتھ کے کرتب یعنی جادو (MIND HANDLING) وغیرہ اور ہر چیز میں کمال حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ جادوگروں کی عالمی تنظیم کے ممبر ہیں اور صدر منتخب ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ صدر وہ شخص بنتا ہے جو ایسا کرتب دکھلائے جس کی ترکیب دوسرے جادوگر نہ بتا سکیں۔ صدر مقام لندن ہے۔ آج کل واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ عالمی بنک کی صدارت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور تجارت کا ذاتی کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی بابت پھر کبھی تفصیل سے لکھوں گا۔

میں لاہور سے دورہ پر آیا تھا کہنے لگے ایک نوجوان مصور ہے جس کو میں نے کڈرانی کے ایک کمرے کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا دیا ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔ صرف پینٹ برش اور بستر وغیرہ کا انتظام کر دیتا ہوں۔ معاوضہ کوئی نہیں اور وہ کیکٹس (CACTUS) کی تصویریں بنا رہا ہے۔ مجھے وہ تصویریں دکھانے سینڈز پٹ (SANDSPIT) کی طرف کسٹم کلب میں لے گئے۔ تیس چالیس کینوس آویزاں تھے سب میں یکساں سلیٹی رنگ استعمال ہوا تھا۔ میں مصوری کی نزاکتوں سے آگاہ نہیں ہوں کچھ متاثر نہیں ہوا۔ داد نہ دے سکا۔

اس زمانے میں کڈرانی جانے کی سڑک بھی نہیں تھی۔ کچھ کچا پکا راستہ تھا۔ جیپ سے جانا پڑتا تھا۔ محمود سلیمان نے کہا کہ جب ملاقات کروا دی جائے چار پانچ گھنٹے صرف ہوتے۔ چنانچہ میں نے انکار کر دیا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک میں کراچی میں متعین رہا، اس عرصے میں صادقین کا تذکرہ کسی سے نہیں سنا۔ محمود سلیمان اپنی پرانی جگہ سے ہٹ گئے تھے ان کا بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میرے حلقۂ احباب میں عالی اور ابن سعید وغیرہ شامل تھے لیکن ان میں سے کسی نے صادقین کی بات نہیں کی۔

۱۹۶۱ء میں میری تقرری لاہور میں بحیثیت ممبر فنانس واپڈا (WAPDA) ہوئی۔ دریائے سندھ پر متبادل نہروں اور بندوں کا انتظام ایک عالمی معاہدے کے تحت ان اداروں کے ذمے کیا گیا اور دریائے جہلم پہ بند کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بجلی گھر کی دیوار پر ایک میورل بنایا جائے گا اور مصور صادقین یہ کام کریں گے۔ عالمی بنک اس مصوری کی قیمت ادا کرنے پر رضامند ہو گیا۔ خاصی خطیر رقم تھی۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ عالمی بنک ایک میورل کی قیمت ادا کرے۔ بنک وغیرہ ان کاموں پہ عام طور سے کوئی رقم خرچ نہیں کرتے۔ میں نے سوچا کہ صادقین یقیناً عالمی شہرت کی شخصیت کے مالک ہوں گے۔ منگلا میں بجلی گھر کا کام شروع ہو گیا۔ صادقین سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں پورے مغربی پاکستان میں دورے کیا کرتا تھا اور منگلا تو لاہور کے نزدیک تھا۔ صادقین سے ملنے کے لئے پروگرام بنایا، افسران متعلقہ کو اطلاع کی گئی۔ میں آپا اور بچوں کے ساتھ منگلا پہنچ گیا۔ دو دن کا قیام تھا۔

طے یہ ہوا کہ دفتر میں کام کرنے کے بعد پاور ہاؤس میں ہم لوگ تقریباً گیارہ بجے چلے جائیں۔ پاور ہاؤس کے اندر ایک بہت طویل اور خاصی اونچی دیوار ہے۔ دیوار کی پیمائش مجھے یاد نہیں۔ اس پر کچھ پینل لگے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ صادقین ایک الگ کمرے میں پینل پر کام کر رہے ہیں اور وہیں ملاقات ہوگی۔ جب ہم لوگ اس جگہ پر پہنچے تو صادقین تو غائب تھے۔ کچھ پینل جن پر وہ کام کر رہے تھے موجود تھے۔ کمرے میں پینٹ برش اور بیئر کی بوتلیں اور ڈبے بکھرے پڑے تھے۔ ایک طرف فرش بچھا ہوا ہوا تھا جس پر بڑے سے بڑے کاغذ اور اسکیچ بنانے کا سامان تھا۔ کچھ سیڑھیاں وغیرہ پڑی ہوئی تھیں کیونکہ یہ پینل (PANEL) پندرہ بیس فٹ اونچے تھے۔ کمرے میں بے ترتیبی نمایاں تھی۔ چیزوں پر گرد بھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دفتر والوں سے پوچھا کہ صفائی کیوں نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ صادقین صاحب کا حکم ہے کہ اس کمرے کی کسی چیز کو ان کے حکم کے بغیر نہ چھیڑا جائے۔ بیئر کے خالی ڈبوں کے علاوہ زمین پر سگریٹوں کے ان گنت ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ جب میں نے ان کی بابت دریافت کیا تو عملے نے جواب دیا کہ ایک دو دن کے بعد صادقین کی اجازت سے یہ خالی ڈبے اور بجھی ہوئی سگریٹوں کے ٹکڑے ہٹائے جاتے ہیں۔ جب میں نے صادقین صاحب کی بابت دریافت کیا تو عملے کا جواب کچھ معذرتی تھا۔ صادقین کو میری آمد کے وقت اور ملاقات کی خواہش کی اطلاع دے دی گئی تھی وہ کہیں چلے گئے تھے۔ بتایا گیا کہ وہ کسی افسر وغیرہ سے ملاقات نہیں کرتے۔ منگلا کے کام کے سلسلے میں بھی اُن کا رابطہ صرف اُن حضرات سے ہوتا ہے جو اُن کو رنگ برش وغیرہ منگوا کر دیتے ہیں۔ میں نے اُن کے کھانے کے انتظام کی بابت پوچھا کہ شاید کھانے پر ملاقات ہو جائے تو بتایا گیا کہ نہ اُس کا کوئی وقت ہے نہ اہتمام۔ کبھی افسروں کے ریسٹ ہاؤس سے کھانا آجاتا ہے اور کبھی بازار سے۔ کبھی نہیں بھی کھاتے۔ دو دو دن میں وہ صرف چائے اور بسکٹ وغیرہ پر گزارا کرتے ہیں۔ بیئر ان کا مرغوب مشروب ہے۔ وہ ہمیشہ موجود رہنا چاہیئے۔ کھانے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایک بجلی کی کیتلی موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ چائے بہت پیتے ہیں۔ کام کا کوئی وقت مقرر نہیں کبھی پوری رات کام کرتے ہیں کبھی سو جاتے ہیں اور آدھی رات کے بعد کام کرتے ہیں۔ ملاقات تو نہ ہو سکی ہاں ان کی بابت کچھ معلومات حاصل ہو گئیں۔ سگریٹ اور شراب کی بہتات، کھانے سے عدم دلچسپی۔ وقت کے بادشاہ اور اپنی مرضی کے مالک۔ کپڑوں سے بے نیاز کیونکہ ایک کھونٹی پر میں نے ایک میلا سا کرتا اور چوڑی مہری کا پاجامہ ٹنگا ہوا دیکھا تھا۔ نہ ملنے پر افسوس تو ضرور ہوا لیکن کسی قسم کی محرومی کا احساس نہیں ہوا۔ تصویروں سے صرف اس قدر متاثر ہوا کہ سائز بہت بڑا تھا۔ رنگ اب سیلیٹی اور نیلے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے CACTUS نہیں دکھائی دیئے لیکن چہرے زیادہ تر بیڑھے، کرب کی کیفیت، انسانی شکلوں سے صرف شباہت تھی مطابقت نہیں۔ میں تو زیادہ متاثر نہیں ہوا لیکن میں نے سوچا کہ اگر عالمی بینک ان کا معاوضہ ادا کر رہا ہے تو پھر دنیائے مصوری میں ان کو کوئی درجہ حاصل ہوگا۔

مقامی افسران پریشان تھے کہ صادقین سے ملاقات نہ ہونے کو میں اُن کی نا اہلی نہ سمجھوں۔ آخر میں اتھارٹی کا ممبر تھا اور اس میں چیئرمین کے علاوہ صرف دو ممبر اور تھے۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ ملنا ضرور چاہتا تھا لیکن اگر صادقین صاحب لوگوں سے ملتے نہیں تو اس میں ان کا قصور نہیں۔ پھر کبھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے اپنا اور ادا کا نام بتایا کہ زبانی ہمارا سلام کہہ دیں۔

صادقین کی بابت میں سوچنے لگا کہ عموماً تو لوگ کسی ادارے کے متعلقہ افسروں سے ملنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ آخر اس بے نیاز طبیعت کے آدمی کو دیکھنا تو چاہیئے۔ مصوری کی دنیا میں اس مصور کا کوئی اعلیٰ مقام ہے ورنہ عالمی بینک اس کام کے لئے معاوضہ دینے پر رضامند نہ ہوتا۔ اس بے نیازی میں عزم کا کتنا عنصر ہے۔ یہ سب خیالات میرے ذہن میں گھومتے رہے۔ میں منگلا ایک دو بار اور گیا بس تصویر دیکھ کر چلا آتا۔ پھر میں نے صادقین سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا

۱۹۶۵ء میں واپڈا کے تقریباً پانچ سال ختم کرنے کے بعد میں عالمی بینک میں چھ ماہ کے ایک کورس کے لیے آذا کے ساتھ واشنگٹن جانے کے لئے کراچی میں تھا۔ روانہ ہونے سے دو دن قبل سامان لگوانے کے لئے گیا تو معلوم ہوا کہ بھاری ہے۔ اور میں گھر واپس آگیا۔ ۶ ستمبر کو ہندوستان سے جنگ چھڑ گئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں نہیں جاؤں گا۔ حکومت نے فیصلہ مجھ پہ چھوڑ دیا اور میں نے انکار کر دیا اور ایک بار پھر راولپنڈی تعینات ہو گیا۔

۱۹۶۶ء کے فروری میں کسی کام سے لاہور گیا۔ میرا چھوٹا بھائی قمر لاہور کی ایک نجی فرم میں ملازم تھا اور نیڈوز ہوٹل میں رہتا تھا۔ اُسے مصوری وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ صادقین اس کے ساتھ نیڈوز میں مقیم ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے کچھ تعجب ہوا۔ قمر اور صادقین کی عمروں میں کم از کم سترہ اٹھارہ سال کا فرق تھا، ان کی دوستی سمجھ میں نہیں آئی، پھر صادقین کی خواہش تو کچھ معمّا معلوم ہوئی۔ جب میں نیڈوز میں قمر کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ درمیانی قد کا ایک دُبلا پتلا شخص ایک ڈھیلی ڈھالی کالی شیروانی پہنے ہوئے ننگے سر بال بکھرے ہوئے سگریٹ پی رہا تھا اور نظریں چھت پر تھیں۔ آنکھوں پہ چشمہ، بے ترتیب بال اور گھسی ہوئی شیروانی، ننگے پیر حلیہ کچھ عجیب تھا۔ قمر نے میرا تعارف کرایا کہ یہ بھائی جان ہیں۔ صادقین گھبرا کر اُٹھ گئے۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے منگلا میں ملاقات نہ ہونے کا واقعہ یاد دلایا تو صادقین نے کوئی معذرت نہیں کی۔ بہت بے تکلفی سے جواب دیا کہ جعفری صاحب میں افسروں سے نہیں ملا کرتا میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ "صاحب" کو انہوں نے مختصر کر کے "صاب" ادا کیا اور زبان تیزی سے حرکت کرتی رہی۔ میں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو رہی۔ اس میں صادقین کے ہاتھ برابر چلتے رہے وہ داہنے ہاتھ کو ہوا میں گھماتے گویا کچھ لکھ رہے ہیں۔ آذا کی بابت دریافت کرتے رہے، وہ اس کی شاعری سے واقف تھے۔ کہنے لگے میں بھی شاعری کرتا ہوں لیکن SPECIALIST ہوں میں صرف رُباعی کہتا ہوں اور بغیر میری فرمائش کے اپنی کچھ رباعیاں سنائیں جن میں زیادہ تر اپنی ذات سے متعلق تھیں اور حسیناؤں کا تذکرہ تھا۔ زلف، خدوخال رنگ۔

اس پہلی ملاقات ہی میں ہم بے تکلف ہو گئے۔ لیکن حفظِ مراتب کا ایک خاص مقام انہوں نے مجھے عطا کیا۔ میں قمر کا بڑا بھائی تھا اسی کی وساطت سے میں ملا تھا اور انہوں نے کہا کہ میں ان کا بڑا بھائی ہوں۔ بے تکلفی اور روابط بڑھنے لگے لیکن میرے اس مرتبے میں سرِمُو فرق نہیں آیا۔ چاہے ہوش میں ہوں چاہے عالمِ مدہوشی میں میری بزرگی کا ہمیشہ اُن کو احساس رہتا۔ انتقال سے تقریباً ایک مہینہ قبل میری ملاقات ہوئی تھی۔ اُٹھ کر مجھے رُخصت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پلنگ پہ اُن کو لٹا دیا۔ کسی حال میں ہوں اگر میں اُن سے ملاقات کے لئے جاتا تو اُٹھ کر سلام کرتے۔ بہت محبت سے ہاتھ ملا کے ایک دو منٹ ہاتھ پکڑے رہتے۔ اگر زیادہ عالمِ سرور میں ہوں تب بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔ دروازے تک رُخصت کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر کبھی پیر لڑکھڑاتے اور میں منع کرتا تو کچھ مشکل کے بعد مان جاتے لیکن دوسرے دن بے شمار معافیاں مانگتے کہ بے ادبی ہو گئی تھی۔ تقریباً بیس سال انہوں نے مجھے اپنا بزرگ سمجھا۔ محبت اور بے تکلفی بڑھ گئی۔ لیکن میرے اس درجہ کا جو انہوں نے خود عطا کیا تھا ہمیشہ خیال رکھا۔ رفتہ رفتہ میں بھی اپنی بزرگی کے اختیارات کو استعمال کرنے لگا۔ میں صادقین سے اس کی بداحتیاطی پہ تنبیہ کرتا۔ سگریٹ اور شراب میں زیادتی پر منع کرتا اور سونے کے اوقات مقرر کرنے کے لئے کہتا۔ صادقین بہت سکون سے میری بات سنتے اور وعدے بھی کرتے کہ وہ اعتدال کی زندگی بسر کریں گے۔ کبھی میری نصیحت کا بُرا نہ مانا کہتے کہ آپ کو حق ہے۔ وعدے بھی کرتے کہ کوشش کروں گا اور بس پھر گفتگو کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتے۔ صادقین کو اس بات کا پورا ادراک تھا کہ اُن کی بے اعتدالی اُن کی صحت اور کام پہ بُری طرح اثر انداز ہو رہی ہے لیکن اُن کی شعوری کوشش ان کے لاشعور سے پسپا ہو جاتی۔

۱۹۶۳ء کے وسط میں ایک کورس کے لئے تقریباً آٹھ ماہ کے لئے امریکہ چلا گیا، اس سے قبل جب میں لاہور آیا، تو صادقین سے ملاقات ہوتی۔ وہ لاہور کے عجائب گھر میں کام کر رہے تھے اور اس کے ایک تہ خانے میں مقیم تھے۔ اگر شام کو گیا تو ان کا شغل جاری ہوتا اور پندرہ بیس لڑکیوں اور مداحوں کا مجمع ہوتا۔ صادقین رباعیاں سناتے ہوئے کسی لڑکی سے زبانی چھیڑ کرتے ہوئے اس پر فی البدیہہ رباعی کہتے اس کا اسکیچ بناتے اور رباعی لکھ کر اس کی نذر کر دیتے۔ حسبِ دستور میرا تعارف کراتے ہوئے، میرا عہدہ بتاتے اور یہ کہ میں ان کا بڑا بھائی ہوں۔ اگر کبھی دن میں گیا کھڑے ہو کر میرا استقبال کرتے۔ اکیلے پھر بھی نہ ملے۔ ایک دو آدمی ضرور ہوتے اور وہ بھی اپنے کام میں منہمک۔ ان دنوں شغل کم ہوتا تھا۔ لیکن یہ کوئی قطعی کلیہ بھی نہیں تھا۔ اگر کام میں انہماک بہت زیادہ ہوا تو گفتگو کم ہوتی۔ ایک آدھ ہوں ہاں لیکن اصرار ہوتا کہ میں بیٹھا رہوں۔ داد طلب کرتے۔ جعفری صاحب کیا خیال ہے۔ کیسا کام ہو رہا ہے؟ آپ آرٹ وغیرہ کی بابت کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوں۔ اس زمانے میں انہوں نے عجائب گھر کے لئے سورۂ یٰسین کی خطاطی شروع کر دی تھی۔ جس سے لاہور عجائب گھر کی چھت اب مزین ہے۔

میں اپریل ۱۹۶۹ء میں وطن واپس آیا۔ بچوں کو لندن واپس بلا لیا تھا۔ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا تھا، اور حرمین کی حاضری نصیب ہوئی تھی اور ایک مرتبہ پھر اسلام آباد میں تعینات ہو گیا۔ صادقین سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بس وہ پیرس کی بابت بہت شوق سے تفصیلات پوچھتے رہے۔ اس شہر میں وہ خاصا عرصہ گزار چکے تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ صادقین کراچی چلے گئے۔

جولائی ۱۹۷۰ء میں سرکاری کام سے کراچی آیا تھا۔ دل کی تکلیف ہوئی اور میں جناح ہسپتال پہنچ گیا۔ ادا پریشانی کے عالم میں کراچی آئیں اور تقریباً پانچ ماہ کے لئے اسپتال کا چکر رہا۔ کبھی اندر کبھی باہر۔ جب کچھ بہتر ہوا تو ایک یا دو بار صادقین ملاقات کے لئے آئے۔ زیادہ بات نہیں کی بس تسلی تشفی دیتے رہے۔ میں ابھی سفر کے قابل نہیں تھا اور کراچی میں ادا کے بھائی کے گھر مقیم تھا۔ صادقین نے اپنی خطاطی کی پہلی نمائش آرٹ کونسل میں کی۔ میرے بڑے بچے اپنی امی کو اصرار سے لے گئے۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ سیڑھیاں چڑھ سکوں۔ اس لئے میں نہ جا سکا۔

صادقین نے ادا کو خطاطیاں دکھلائیں، مختلف نکتے بتاتے رہے۔ نمائش کی بابت اس کا تاثر پوچھا اس نے کہا بہت اچھی ہے۔ صادقین اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ پھر کسی شاہکار کی بابت پوچھا کہ یہ کیسی لگی۔ ادا نے جواب دیا کہ بہت اچھی۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ جواب ناکافی ہے۔ ادا نے ان کو دعائیں دیں اور جواب دیا کہ بس آنسوؤں سے ہی اس کو خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ بیٹھی رہے۔ اُن کو تکتی رہے اور آنسو بہتے رہیں۔ کائنات اور خلاقِ عالم کی بابت خاموشی سے سوچتی رہے اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتی رہے۔ اب صادقین مطمئن ہو گئے۔ واپس آکر ادا نے نمائش کی تفصیل بتائی اور گفتگو کا متن بتایا۔ بات ختم ہو گئی۔ دس بارہ دن بعد صادقین کا لاہور سے فون آیا کہ انہوں نے آرٹ کونسل والوں کو ہدایت کر دی ہے اور وہ ایک خطاطی جو ان کو پسند آئی ہے جا کر لے لیں۔ "یہ فقیر کا تحفہ ہے"۔ فون پر ادا سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ منع کرتی رہی اور ان کا اصرار جاری رہا۔ غرض کہ ادا وہ خطاطی لے آئیں۔

بعد میں لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس خطاطی کے لئے کسی سفیر نے ایک خطیر رقم پیش کی تھی۔ اور صادقین نے انکار کر دیا تھا کہ وہ اب اپنی تخلیقات کو فروخت نہیں کرتا۔ صادقین سے میں نے استفسار کیا تو انہوں نے تصدیق کی کہنے لگے کہ اگر میں فروخت کرنا شروع کر دوں تو پیسے والے میرے جوہر پاروں کو لے جائیں گے اور اپنے ڈرائنگ

محروم ہی لگائیں گے۔ یہ تو میری توہین ہے۔ میں کوئی بکاؤ مال تھوڑی ہوں کہ ہر سیٹھ ساہوکار مجھے خرید لے۔ جب میں نے ادا کی بات کی کہ وہ تو خطاطی اور مصوری کی باریک بینی کی بابت کچھ بھی نہیں جانتی تو جواب دیا کہ خلوص اور محبت کا کاروبار اور ہے۔ اس کے اوزان مختلف ہیں اور پھر وہ تو شاعرہ ہیں۔ رباعی اور شعر و شاعری کی باتیں کرنے لگے۔ یہ تو صادقین کی سخاوت کا میرا پہلا تجربہ تھا۔

قمر نے بتایا کہ ان کی یہ سخاوت تو عام ہے۔ بسم اللہ اور اسکیچ تو ہر مانگنے والے کو مل جاتا ہے۔ اگر موڈ ہو تب خطاطی کے نادر شاہکار دوستوں کی نذر کئے جاتے ہیں۔ لمحے اور موڈ کی بات ہوتی ہے۔ صرف حکومت کی سطح پر وہ فن پاروں کو فروخت کرتے ہیں۔ سرکاری عوامی عمارتوں میں وہ میورل وغیرہ بناتے تھے۔ ایک سعودی شہزادے نے اپنے ذاتی ہوائی جہاز کی تزئین کے لئے ایک خطیر رقم پیش کی انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں فن بیچتا تھوڑا ہوں جو پیسے والوں کے گھر کی زینت کے لئے کام کروں۔ "لاحول ولا قوۃ۔ میں اللہ تعالیٰ سے بدعہدی کیسے کر سکتا ہوں۔ جعفری صاحب یہ مالک کی توہین ہوئی نا؟" "نا" پر زور دیتے اور پھر میری تصدیق چاہتے۔ جب صادقین موڈ میں ہوتے تو "نا" کی تکرار ہوتی۔ "بات ہوئی نا" "ٹھاٹھ ہیں نا" "یہ کام ہوا نا"

میں تندرست ہو کر واپس اسلام آباد پہنچ گیا۔ میرے مکان کی پشت پر ایک دوسری سڑک پر صادقین کے بڑے بھائی کاظمین صاحب مرحوم مقیم تھے۔ ان سے بھی یاد اللہ ہو گئی۔ صادقین کی ایک یا دو بیوہ بہنیں تھیں اور صادقین اپنے پورے کنبے کے کفیل تھے۔ خود اُن کی زبانی ان اعزہ کا تذکرہ نہیں سُنا۔

وہ لاہور میں اب باغِ جناح میں مقیم تھے۔ وہاں ایک کمرہ تھا اور اس سے ملحقہ ایک باورچی خانہ یہی ان کی کٹیا یا خانقاہ تھی، ایک بورڈ بھی لگ گیا "خانقاہِ صادقین" خطاطی یا غالب اور فیض کے اشعار کی مصوری ان کا شغل تھا۔ لاہور سے جب کاظمین صاحب کے یہاں آتے تو میرے گھر بھی آتے۔ اب مجھے صادقین کی طبیعت کا کچھ اندازہ ہو گیا۔ بے تکلفی تو پہلی ہی ملاقات میں ہو گئی تھی لیکن اب روابط بڑھے اور محبت کے رشتے استوار ہوئے۔ اگر کھانے کا وقت ہوا تو بغیر اصرار کے وہ دعوت قبول کر لیتے۔ ماش کی دال، مونگ کی بگھری ہوئی دال، کوتھمیر (ہرا دھنیا) کی خوشبو ان کو پسند تھی۔ یہ لفظ پہلی بار میں نے اُن سے سُنا۔ کڑھی، پائے، سیخ کا پسندہ کباب اور کبھی کبھی پوری اُن کی پسندیدہ غذا تھی۔ کم خوراک لیکن چٹ پٹی چیزوں کے شائق تھے۔ کبھی کبھی فرمائش بھی کر دیتے۔ مرغی گوشت اور میٹھے سے قطعی رغبت نہیں تھی۔ میٹھے میں صرف رسا دل ان کو پسند تھی جس کو ادا ان کی فرمائش پر جاڑوں میں اگر وہ آتے تو پکا دیتی۔ کھانے پر وہ کسی اور کی موجودگی پسند نہیں کرتے تھے علاوہ یہ کہ کوئی ان کا بہت بے تکلف دوست ہو جسے میں بھی جانتا ہوں۔ گھنٹوں بیٹھتے۔ میرے یہاں شغل کا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا لیکن وہ سیر ہو کر آتے۔ آٹھ بجے بلایا ہے تو دس بجے آتے اور بارہ ایک بجے تک بیٹھتے۔ میں رات کو دیر تک جاگنے کا عادی نہیں ہوں۔ جب میری جمائیاں زیادہ ہونے لگتیں تو پھر وہ معافی مانگتے اور رخصت ہو جاتے۔

سیاست کے علاوہ ہر موضوع پر گفتگو ہوتی جس میں شعر و ادب کا زیادہ حصہ ہوتا۔ کبھی کبھی ملکی حالات پر تبصرہ کرتے لیکن بہت کم۔ سیاست دانوں کو وہ جہلا میں شمار کرتے تھے۔ کہتے کہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ سیاست کا بھی جنازہ ہی نکل گیا۔ اب تو یہ مٹی کے پتلے ہیں دماغ نہیں ہے۔ صادقین لاابالی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ وقت اور تاریخ کی پابندی کبھی نہ کرتے، معلوم ہوتا ہے اچانک کسی اور شہر چلے گئے، کبھی باہر جانے والے ہیں تو قطعی نہیں معلوم کہ پندرہ دن میں واپس آئیں گے یا دو ماہ بعد، بس جس وقت دل چاہا اٹھ کھڑے ہوئے جب دل بھر گیا واپس آ گئے۔

جنوری ۱۹۷۳ء میں میری بیٹی صبیحہ کی شادی کی تقریب طے ہوئی اور میں نے ان کو شرکت کی دعوت دی جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ صادقین آزاد طبیعت کے مالک تھے اور وقت پر پابندی تو قطعی لگانا نہیں جانتے۔ نکاح کا وقت صبح دس بجے تھا۔ صادقین لاہور سے آئے اور نکاح میں شریک ہوئے۔ شام کو دعوت تھی اس میں بھی شریک ہوئے اور میرے داماد زبیر کو گلے لگایا اور لاہور عجائب گھر آنے کی دعوت دی کہ اپنی شادی کا تحفہ لے لیں۔ میرے اور ان کے لئے یہ بہت خوشی کا موقع تھا اور صادقین نے جس اپنائیت کا اظہار کیا اس سے ہم لوگ بہت متاثر ہوئے۔ یہ صادقین کا انسانی پہلو تھا۔ وہ سماجی تقریبوں سے گھبراتے تھے لیکن شادی کی تقریبات میں تمام وقت شامل رہے لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔

اپنی حد تک وہ روپے سے قطعی بے نیاز تھے۔ کپڑے اور سگریٹوں کے علاوہ ان کا کوئی خرچ نہیں تھا۔ کپڑے بھی معمولی اور زیادہ تر میلے۔ پرانا جوتا یا چپل، پرانا موزہ، سردی میں گلے میں مفلر اور شیروانی جس کے بٹن عموماً کھلے ہوتے لیکن وہ روپے کی اہمیت اور اپنے فن کے مرتبے سے واقف تھے۔ جب حکومت کے لئے کام کرتے تو پورا معاوضہ لیتے، اپنی لاابالی طبیعت کے باوجود وقت پر کام ختم کر کے بیٹھتے۔ اپنی تعریف سُن کر بہت خوش ہوتے۔ پاکستان کے کسی دوسرے مصور کی تعریف کم کرتے تھے۔ شاکر علی اور علی امام کے مدّاح تھے۔ باقی زیادہ تر کو وہ کاروباری گردانتے تھے۔ فن کار کم تاجر زیادہ، لیکن کسی کی مصوری کی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ اوّل تو تذکرہ ہی نہیں کرتے تھے۔ اگر تذکرہ آگیا تو پھر رائے کا بے لاگ اظہار، اگر کسی نے ان کے فن پاروں کو خریدنے کی بابت دریافت کیا تو کہتے میں تاجر تھوڑی ہوں۔ ان کو بھی یاد نہیں تھا کہ کس کس کو انہوں نے اپنی بڑی بڑی تصویریں دی ہیں۔ میں کسی کے گھر دیکھتا اور اُن سے استفسار کرتا تو کہتے یاد تو نہیں لیکن یقیناً دی ہوگی۔ وہ اپنی تصویروں پر دستخط کم کرتے تھے لیکن صادقین کی تخلیق تو پکارتی ہے کہ تخلیق کار کون ہے؟

ایک مرتبہ کراچی P.I.A. میں نمائش ہو رہی تھی۔ ایک قطعی معصوم جوڑا بڑے غور سے اُن کے شاہکار دیکھ رہا تھا۔ اس کو صادقین کے مقام کا علم نہیں تھا۔ بس ان کے مدّاحوں میں سے ایک تھا۔ صادقین کے پاس آکر اُس نے نہایت معصومیت سے ایک کینوس کی قیمت پوچھی۔ پہلے تو گویا انہوں نے سُنا ہی نہیں، دوبارہ اُس نے زیادہ وضاحت سے پوچھا تو انہوں نے نہایت ملائمیت سے جواب دیا میاں آپ دیکھیں آپ خرید نہیں سکتے۔ اُس نے پھر اصرار کیا تو جواب دیا کہ یہ فروخت کے لئے نہیں ہیں۔

۱۹۷۴ء یا ۱۹۷۵ء میں کاظمین صاحب علیل ہوئے اور صادقین اُن کی تیمارداری کے لئے لاہور سے آکر اُن کے ساتھ رہنے لگے۔ سرطان کا مرض تشخیص ہوا تھا اور پہلی بار میں نے صادقین کو فکر مند اور ملول دیکھا۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے اور جہاں تک مجھے علم ہے صرف میرے یہاں آتے تھے کیونکہ میرا مکان پانچ منٹ کے پیدل فاصلے پر تھا۔ ان کے ہم پیالہ احباب نسبتاً زیادہ دور تھے۔ صادقین نے شغل قطعی ترک کر دیا تھا کیونکہ کاظمین صاحب ان سے بڑے تھے اور مذہبی حفظِ مراتب کا معاملہ تھا۔ کاظمین صاحب کی علالت کے سلسلے میں چھوٹے چھوٹے معاملات میں مشورہ کرتے۔ باہر لے جانے کی نیت ہوئی۔ میڈیکل بورڈ کی تشکیل، زرِ مبادلہ کی فراہمی وغیرہ۔ میں اُن کے یہ کام کرتا رہا میرے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ صادقین دفتری کاروبار سے قطعی غیر آشنا تھے۔ اور ان کو یہ مسائل پہاڑ معلوم ہوتے تھے اور انہوں نے یہ کام میرے ذمّے کر دیا۔ بعد میں کاظمین صاحب کو لندن لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ ڈاکٹروں نے منع کر دیا تھا۔

بہت اصرار سے انہیں ایک دو بار اپنے ساتھ کھانے پر لایا۔ ایک مرتبہ شام کو اسلام آباد کلب لے جا کر ان کو

شغل کرایا۔ وہ کاظمین صاحب کے پلنگ کی پٹی سے لگے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ بہت مشکل سے راضی ہوئے جلدی جلدی ایک دو حربے لئے اور واپس آگئے۔ اداس میرے ساتھ بھی ہم ادھر ادھر کی گفتگو کرتے لیکن وہ خاموش رہتے۔ پھر ایک صبح معلوم ہوا کہ کاظمین صاحب خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ میں گھر پہنچا تو صادقین صاحب موجود نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے شغل کر کے آئے تھے اور ہلکے پھلکے لگ رہے تھے۔ گلے لگا لیا کہنے لگے جعفری صاحب آپ گواہ ہیں کہ اس عرصے میں سوائے آپ کے سامنے میں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، اب میں کراچی پہنچوں گا تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو بھائی تو مر گیا اور صادقین شراب پی رہا ہے لیکن کیا "پروا" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رسمی ماتم پرسی بھی نہیں کی۔ صادقین کو یہ انجام معلوم تھا اور تقریباً تین ماہ کے بعد وہ اپنے کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً دوپہر بعد ہوائی جہاز سے میت روانہ ہوئی۔ خاقی جی بھی اس جہاز میں تھے۔ ان کا بیان ہے کہ راستے بھر صادقین صرف مرحوم بھائی کی بات کرتا رہا اور شغل کرتا رہا۔ اس کے ہوش و حواس حاضر تھے اور وہ جانتا تھا کہ اس کے اعزہ اس پر لعن طعن کریں گے لیکن میں اس بات کا گواہ ہوں کہ تقریباً تین ماہ وہ کاظمین کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا تھا۔ اور اس نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا سوائے ایک دن کے لیکن میری گواہی کس کام کی؟ پہلی بار مجھ کو صادقین پر رحم آیا۔ اس شخص کے مدّاح اور جاننے والے بہت ہیں لیکن اس کو نزدیک سے کتنوں نے دیکھا ہے۔ اس کے اندرونی کرب اور اس کی محبتوں سے کتنے لوگ واقف تھے؟

۱۹۷۶ء میں ایک بار پھر میری تعیناتی اسٹاف کالج لاہور میں ہوگئی۔ یہ جگہ باغ جناح سے بہت قریب ہے اور ہم دونوں صادقین کے پاس زیادہ جانے لگے عموماً شام کو جاتے، ان کا شغل جاری ہوتا۔ چاہنے والے بیٹھے ہوتے۔ گپ، رُباعیاں لڑکیوں سے زبانی چھیڑ چھاڑ، چاہنے والے اسی فکر میں ہوتے کہ کوئی رُباعی لکھوا لیں کوئی اسکیچ بنوا لیں۔ اس کا دار و مدار صادقین کے موڈ پر ہوتا کبھی منٹوں میں کام ہو جاتا کبھی گھنٹوں گزرنے کے بعد بھی کام نہیں نکلتا۔ ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھتے کیوں کہ ہماری موجودگی سے محفل کا رنگ پھیکا پڑ جاتا۔ کسی حالت میں بھی ہو صادقین اس بات کا خیال رکھتا کہ بڑے بھائی کے سامنے کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو حفظِ مراتب کے خلاف ہو۔ اگر قطعی مدہوش ہوتے تو ہم لوگ چلے آتے لیکن ان کو یاد رہتا اور اگلی ملاقات میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے۔

کبھی کبھی کسی خاص کھانے کی فرمائش کر دیتے۔ بیسن کی روٹی، لہسن کی چٹنی، بگھرا ہوا دال ساگ، سیخ کے پسندے کباب شغل کے بعد آتے۔ تین چار گھنٹے بات ہوتی اور گیارہ بجے رات کے بعد کھانے کی نوبت آتی۔ رباعیاں بہت سننے میں آتیں اور خود اپنی تعریف یہ صادقین کی واحد کمزوری تھی۔ ان کو اپنا مقام تو معلوم تھا لیکن وہ اعادہ بھی کرتے اور چاہتے کہ دوسرے بھی اس کی تائید کریں۔ یہ نہیں کہ ان کو یقین نہیں تھا لیکن آخر انسان میں کوئی کمزوری تو ہونا چاہیئے۔ یہ صادقین کی واحد کمزوری تھی وہ اپنی تعریف سننے سے کبھی نہیں تھکتے تھے۔

پھر صادقین اسلام آباد کے اسپورٹس اسٹیڈیم کے میورل بنانے میں مصروف ہو گئے اور ان کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ رات رات بھر کام کرتے۔ سردیوں کا زمانہ تھا وہ ہال بہت بڑا تھا اور بجلی کے ہیٹروں کے باوجود گرم نہیں ہوتا تھا۔ کھانسی ہوتی رہتی تھی۔ میں نے علاج کے لئے بہت کہا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔ زمین پر گدّوں کا فرش اس پر لحاف اور کمبل، چائے کی بجلی کی کیتلی، کھانے کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ کبھی کوئی مدّاح کچھ لے آیا اور انہوں نے جب دل چاہا کھا لیا۔ جتنی کام کی شدت اتنا ہی شغل میں زیادتی۔ ایک اوورکوٹ پہنے ہوئے گلے میں مفلر لپیٹے ہوئے کام میں منہمک۔ رات کے بارہ ایک بجے تک میں نے ان کو اس انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی میرے گھر نہانے کے لئے چلے آتے اور میرے چھوٹے بیٹے عامر کے کمرے میں گرم پانی سے نہا کے صاف کپڑے پہنتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ کام مکمل ہو گیا اس میورل میں

ایک خاتون بیچ میں کھڑی ہیں۔ ان کی شکل تو بنائی لیکن اُسے ڈھک دیا۔ ایک دن بہت اصرار پر دکھایا یہ ان کے کسی محبوب کی شبیہہ تھی۔ یہ خوب صورت لڑکی صادقین کی محبوبہ تھی۔ اس کو دیکھ کر خوش ہو لیتے اس پر دو چار رباعیاں کہہ دیتے۔ اسکیچ کے تحائف دے دیتے اگر لڑکی سمجھ دار ہوتی تو ایک دو تصویریں بھی حاصل کر لیتی۔ صادقین نے نسائیت کا احترام ہر حالت میں کیا میں نے صادقین کی زبان سے کبھی کوئی مبتذل لفظ نہیں سُنا اور نہ کبھی کوئی رکیک حرکت کرتے دیکھا۔ میں نے ان کو ہر عالم میں اور چوبیس گھنٹے کے تقریباً ہر پہر میں دیکھا ہے۔ رات کے ایک دو بجے جب عالم سرور میں پیتے ہوئے بھی تین چار گھنٹے ہو جاتے اس وقت بھی ان کے ہوش و حواس قطعی درست ہوتے۔ صادقین کا لاشعور انتہائی پاکیزہ تھا۔

میرے علم میں انہوں نے خطّاطی ہمیشہ پاک صاف ہو کر کی۔ الفاظ کی حُرمت اور اہمیت کا ان کو پاس تھا۔ "مولا کا کرم" ان کا تکیۂ کلام تھا اور واقعی مولا کا کرم نہ ہوتا تو جس طرح صادقین دونوں ہاتھوں سے حفظانِ صحت کے اصولوں کو لُٹاتے رہے اس حساب سے اتنے دن بھی ان کا جینا مشکل تھا۔

اس درمیان میں صادقین کسی کام سے عرب امارات کے لئے تیار ہوئے اور انہوں نے فرمائش کی کہ اسلامک کالج کے ہاسٹل میں ایک کمرہ ان کے لئے مختص کر دیا جائے۔ وہاں ایک پُرانا ہاسٹل تھا جس کی عمارت استعمال نہیں ہوتی تھی لیکن ایک حصّے میں گودام تھا، ایک حصّے میں بینک تھا۔ طلباء وہاں نہیں ٹھہرائے جاتے تھے۔ میں نے ایک کمرہ اور غسل خانہ اُن کے لئے صاف کروا دیا۔ لیکن ایک بات کی درخواست کی۔ رات کی ملاقاتوں میں لڑکیاں نہ آئیں تو بہتر ہے۔ کوئی قدغن تو نہیں لگائی لیکن چونکہ وہ ایک کالج کی عمارت تھی اس لئے میں نے ان کو احتیاط کا مشورہ دیا اور اپنی ذمّہ داری کی بابت عرض کیا کہ لوگ ہر قسم کی باتیں بناتے ہیں۔ لیکن ان کے مخالفین کی تعداد کچھ کم نہیں اور میرے اوپر حرف نہ آئے۔ انہوں نے میرے اس مشورے پر سختی سے عمل کیا۔ کھانے کے سلسلے میں وہ پہلے کی طرح بے نیاز تھے۔ کالج کے کچن سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بس کمرے میں بجلی کی کیتلی ضرور موجود تھی۔ ان کے ہاسٹل کے قیام کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ وہ ایک روز بغیر بتائے ہوئے کراچی چلے گئے۔ حسب عادت واپسی کی بابت کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کا ایک رجسٹری خط چکّر لگا رہا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ڈاکیہ مجھے مل گیا۔ اور وہ خط مجھے دینے پر تیار ہو گیا۔ دو تین دن بعد صادقین واپس آئے۔ اور وہ خط انہوں نے میرے سامنے کھولا۔ ان کے کام کا معاوضہ تھا۔ غالباً بارہ لاکھ روپیہ کے زرِ مبادلہ کا ڈرافٹ تھا۔ کہنے لگے کہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ چلئے بچّوں کا کچھ کام ہو جائے گا۔ اپنے بھتیجوں کی بات کر رہے تھے جن کے وہ کفیل تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس رقم سے انہوں نے کیا کیا۔ وہ یقیناً اپنے بھتیجوں کو دے دی ہو گی۔

میں ۱۹۷۷ء میں پھر اسلام آباد تبدیل ہو گیا۔ لیکن میرے بعد مسرور حسن خاں صاحب نے اس اہتمام میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ان کے زمانے میں کالج کا خوب صورت آڈیٹوریم بنا اور صادقین نے بھی اپنے بے شمار شاہکار کالج کی عمارت اور آڈیٹوریم میں آویزاں کر دیئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ انہوں نے عطیہ دے دیئے تھے یا صرف عارضی طور پر ٹانگے تھے۔

اسٹیڈیم کا میورل تیار ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ حکومت تبدیل ہو گئی تھی اور صادقین کبھی کوئی تحریری معاہدہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے معاوضے کی ادائیگی میں کچھ دقت ہو رہی تھی۔ میں نے روئیداد خاں سے جو کلچر سیکریٹری تھے، رجوع کیا اور کہا کہ وہ اس معاملے پر فیصلہ کر دیں۔ صادقین تو ملے نہیں اور یہ معاملہ کچھ عرصے لٹکا رہا۔ حکومت دس بارہ لاکھ دینے پر تیار ہو گئی۔ پندرہ لاکھ مانگ رہے تھے۔ وہ یہ رقم لینے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ کہنے لگے کہ چلئے فقیر کا تحفہ ہے۔ حکومت بدعہدی کر رہی ہے۔ میں نے سمجھایا کہ حکومت تو بدل چکی ہے۔ جواب دیا کہ میں تو نہیں بدلا۔ میں جو کہہ رہا ہوں بہت مشکل سے سمجھایا کہ آڈٹ بھی ایک چیز ہوتی ہے، پھر قاعدہ قوانین بتلائے۔ سرکاری قوانین ایک انتہائی ذہین آدمی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ان کو بہت حیرت تھی کہ

کوئی ایسا بھی ہوگا جسے صادقین کے بیان پر یقین کرنے میں تامل ہو۔ آخر راضی ہوگئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس رقم کا کیا بنا۔ ذاتی طور پر ان کو روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی غذا تو ان کے مدّاح پہنچا دیا کرتے، کچھ محبت میں اور کچھ تصویروں کے معاوضے میں۔ اس طرح تصویریں کوڑیوں کے مول مل جایا کرتیں۔ صادقین کو یہ معلوم تھا کہ وہ اشرفیاں لٹا رہے ہیں لیکن ان کا فلسفہ یہ تھا کہ خوش ہونے دیجئے۔ آخر کو مداح ہیں۔

اسلام آباد کے قیام میں اُن سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اصرار کیا کہ اگلی مرتبہ وہ میرے گھر ٹھہریں۔ راضی ہوگئے اگرچہ ان کو معلوم تھا کہ میرے گھر نہ اُن کو شراب ملے گی اور نہ وہ اپنے ذرائع سے منگوا سکیں گے۔ دو دن گھر پر رہے۔ صبح دیر سے سو کر اُٹھتے پوری کا ناشتہ ہوتا دن بھر ادا سے باتیں کرتے۔ عامر سے کھیلتے۔ شام کو دیر تک گپ شپ ہوتی اور گیارہ بجے شب محفل ہوتی۔ کہنے لگے کہ بہت اچھا ہوا کہ میں آپ کے یہاں ٹھہرا ہوں۔ صحت پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔ تیسرے دن شام کو کہا کہ ذرا دوستوں سے مل آؤں۔ رات میں کھانے کے وقت تک آجاؤں گا۔ ایک دوست کا نام بتایا کہ ان کے پاس جا رہا ہوں۔ رات کو واپس نہیں آئے مجھے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ شغل میں مصروف ہوگئے ہوں گے۔ دوسری رات اور دن بھی گزر گیا پھر مجھے فکر ہوئی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کو فون کیا۔ تقریباً نو بجے شب کا وقت تھا۔ انہوں نے تسلی دی کہ میں تلاش کرلوں گا۔ رات ساڑھے دس بجے وہ صادقین کو اپنی موٹر میں ڈال کر لائے۔ قطعی بے سُدھ تھے۔ دو آدمیوں نے ان کو اپنے ہاتھوں پہ لے کر موٹر سے اُتارا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ ادا نے کسی کی یہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔ بہت پریشان ہوئیں۔ ڈاکٹر مرزا صاحب بیٹھ گئے کہا کہ کوئی کھٹی چیز چاہیئے۔ اتفاقاً اس دن کڑھی پکی تھی۔ مرزا صاحب نے چمچوں سے صادقین کو کڑھی کھلائی اور وہ سوگئے۔ رات بھر ادا کمرے میں صادقین کو جھانک جھانک کر دیکھتی رہی کہ کس حال میں ہیں۔ صبح گیارہ بجے اُٹھے اور بہت شرمندہ۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگتے رہے اور ہم لوگ ہنستے رہے۔ رات جس کیفیت میں وہ لائے گئے تھے ان کو بتایا کہ آپ نے ہم لوگوں کی جان ہی نکال لی تھی۔ تو یہ کا عرصہ طویل تو نہیں گیا تھا معلوم ہوا کہ جس دوست کے یہاں گئے تھے انہوں نے مشروبات مہیا کردیے اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ۴۸ گھنٹے بغیر کچھ کھائے ہوئے صادقین شغل کرتے رہے۔ میرے ان صاحب سے مراسم نہیں تھے لیکن ڈاکٹر ایوب مرزا نے ان سے بازپرس کی کہ یہ تو صادقین کو مارنے کا انتظام تھا۔ شغل اپنی جگہ لیکن پھر میزبان کو ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ اور مشروبات کے ساتھ کچھ ماکولات کا انتظام بھی ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد باوجود اصرار کے صادقین ہمارے گھر نہیں ٹھہرے۔

۱۹۷۹ء کے وسط میں میں رخصت پر ادا کے ساتھ اپنی بیٹی صبیحہ کے پاس امریکہ چلا گیا اور تقریباً چار ماہ بعد واپس آیا اور پھر کراچی میں تعینات ہوگیا۔ یہ جنوری ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ صادقین لاہور کے ایشاٹک کالج میں مقیم تھے۔

پھر معلوم ہوا کہ صادقین بوریا بستر اٹھا کر اسلام آباد چلے گئے۔ وہاں حکومت ایک صادقین گیلری بنا رہی ہے۔ دستور کے مطابق ایک کمرے میں فرش پر ان کا بستر تھا۔ چائے بجلی کی کیتلی اور ان کی کتابیں اور مصوری کا سامان ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ اب وہ مارکر کا زیادہ استعمال کر رہے تھے۔ میں نے بہت منع کیا کہ مارکر کے نشان مٹ جائیں گے پینٹ اور کینوس استعمال کریں لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ اس میں غالباً سہل نگاری کو زیادہ دخل تھا۔ یہیں صادقین نے سنگِ مرمر کی سلوں پر سورۂ رحمٰن لکھنے کا کام شروع کیا۔ یہ ٹکڑے اب فریئر ہال میں کراچی کے شہریوں کے لئے ان کا تحفہ ہیں۔ میرا خیال ہے ایک جلسے میں غالباً بارہ لاکھ اس کا ہدیہ پیش کیا گیا تھا لیکن صادقین نے انکار کردیا۔ اپنی یادداشتیں بھی لکھنا شروع کیں۔ بہت بڑے کاغذ کے سائز پر سوٹے موٹے حروف میں لکھتے۔ پیٹ کے بل لیٹ جاتے اور لکھنا شروع کردیتے پھر گھٹنوں پہ کاغذ رکھ کر لکھتے۔ میں نے ان کو میز وغیرہ کا استعمال کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ زمین کا فرش اُن کے لئے میز کا کام

دیتا تھا۔ کچھ حصے مجھے سنائے لیکن کہتے تھے کہ فرصت نہیں ملتی بہت کام کرنے کو پڑے ہیں۔

شام کو لڑکیوں اور لڑکوں کا اجتماع ہوتا اس میں ایک لڑکی اُن کے باہر کے دوروں کی خبروں کے تراشے ترتیب دے رہی تھی۔ میں نے کہا کہ بھئی یار آپ کوئی عقل کا کام کر رہے ہیں، اب اپنی تصویروں کی فہرست بنوالیں۔ ذاتی تحائف کو چھوڑ دیں پبلک مقامات کی فہرست بنوائیں۔ جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے یاد بھی نہیں کہ تصویریں کہاں کہاں لگی ہوئی ہیں تعداد سیکڑوں میں ہوں گی اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا گیلری تیار ہوگئی اور صادقین بہت خوش تھے۔ آرٹ کونسل کا عملہ ان کا ہر حکم بجا لانے کے لئے تیار تھا۔ انہوں نے باغ کو بھی ترتیب دیا۔ ان دنوں کچھ کرتب GIMMICKRY کے بھی کام کئے۔ اگر بسم اللہ تو وہ لکھا ہی کرتے تھے یہ تو لکیروں پر ان کی مکمل گرفت کا مظاہرہ تھا۔ اب کاغذ کے ٹکڑے اس طرح کاٹتے کہ جب آدھا حصہ کھلتا تھا صادقین دکھائی دیتا پھر دوسرا حصہ کھلتا تو تہ ہوئے کاغذ میں لفظ گیلری پڑھا جاتا۔ کاغذ کے پیچھے روشنی ہوتی۔

میں نے صادقین کو منع کیا کہ اپنی تخلیقی قوتیں ان فضول کاموں میں نہ صرف کریں یہ تو بچوں کا کھیل ہے جواب دیتے کہ میں تو GIMMICKRY کا ماسٹر ہوں مزا نواسی میں آتا ہے۔ صادقین کے اندر کا بچہ بول رہا تھا۔ جان بوجھ کر کوئی ایسی تصویر یا نقش بناتے جس کو کہ ہمارے نقاد لوگ عریاں گردانتے حالانکہ صادقین کی ٹیڑھی لکیروں کا انسانی جسم کی ساخت سے صرف دُور کا تعلق ہے بس ان لکیروں میں اس کی ذات اور رُوح کا کرب نمایاں ہوتا تھا۔ ان لکیروں سے جنسی تحریک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خواہ وہ کتنی ہی عریاں کیوں نہ ہوں۔ ایک مرتبہ لاہور کی ایک نمائش کے بارے میں صوبائی اسمبلی میں سوال کئے گئے۔ صادقین ان دنوں روس میں تھے جلدی واپس آئے اور اس شور و غوغا سے بہت خوش ہوئے کیوں کہ اسمبلی کے بعد نمائش میں آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ صادقین اپنی اس کامیابی پر بہت خوش ہو کر کہنے لگے کہ مولا کا کرم ہے۔

ایک آدھ بار میں نے صادقین سے کہا کہ اب وہ چین سے آ کر کراچی میں رہیں۔ یہ شہران کا گھر ہے آخر کراچی والوں کو بھی کچھ حق ہے کہنے لگے بات تو ٹھیک ہے لیکن اصل مزا لاہور میں ہے۔ موسم وغیرہ سے وہ بے نیاز تھے۔ بس اس شہر کی فضا سے انہیں اُنس تھا۔ عدنی صاحب بھی ان سے ملاقات کرتے رہتے اور ان کی گفتگو زیادہ طویل ہوتی۔ دونوں میں کچھ قدریں مشترک تھیں، دونوں صوفی منش بہت اچھی یادداشت۔ غالب اور حافظ کی فارسی شاعری کے عاشق۔ کراچی میں قیام کا مسئلہ تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کو آزادی بھی چاہیئے تنہائی بھی اور محفل بھی۔ عدنی صاحب نے نیپا NIPA کا ایک بنگلہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیا اور معلوم ہوا کہ صادقین لاہور سے کراچی ہجرت کر رہے ہیں اور ایک دن فون آیا۔ "جعفری صاحب ذرا آ کر ٹھاٹھیں دیکھیں نا" ۔ "نا" پر زور۔ میں اور ادا مغرب کے بعد پہنچے۔ بہت بشاش تھے۔ عدنی نے ایک پورا تین کروں کا بنگلہ جس میں فرنیچر وغیرہ بھی تھا صادقین کے لئے وقف کر دیا تھا۔ فون لگوا دیا۔ "فقیر" کے کام اور سونے کا کمرہ تو حسبِ دستور بے ترتیبی کا نمونہ تھا لیکن ڈرائنگ روم میں چھوٹی میزیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ کھانے کا کمرہ بھی تھا لیکن جس کے کھانے کا کوئی وقت نہ ہو اُس کو اس کمرے کی کیا ضرورت؟ رفتہ رفتہ ڈرائنگ روم کا استعمال بند ہوگیا۔ کمروں میں اُن کی تصویریں بھر گئیں۔ ڈرائنگ رُوم کا صوفہ اُٹھا دیا گیا اور اس میں فوم کے کُشن ڈال دیئے گئے۔ ایک لکڑی کا ۸ انچ اونچا بکس ڈال دیا گیا۔ وہ صادقین کی میز بن گئی جس پر کتابیں سگریٹ اور چائے کی پیالیاں پڑی رہتیں اور اب صادقین پھر ایک بار اپنے گھر میں تھے۔ یہ ۸۲-۱۹۸۰ء کی بات ہے۔

دن میں بھی شغل کرتے میں جب تنبیہہ کرتا پہلے تو چپ ہوتے پھر کہتے کو چھوڑ دیجئے نا یہ تو میرا رزق ہے۔ ایک مرتبہ طے ہوا کہ ELITE کے مالک مرزا جمیل صاحب کے پاس چلیں گے اور ان سے کچھ

. . . .

کاروبار کی بات کریں گے۔ کراچی کے کسی ناشر نے اُن کی اجازت کے بغیر اُن کی تصویروں کا مجموعہ شائع کر دیا تھا پھر ادھر ادھر

بک رہا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دوسرے دن گیارہ بجے میں اُن کو اپنے ساتھ مرزا صاحب کے دفتر لے جاؤں گا۔ جب میں پہنچا تو شیروانی وغیرہ پہن کر تیار تھے۔ آخر تو کاروباری گفتگو کے لئے جا رہے تھے۔ لیکن اندازہ ہوا کہ اس تیاری میں کم از کم دو گھنٹے سے شغل کر رہے تھے۔ ہم مرزا جمیل صاحب کے یہاں پہنچے کام کی گفتگو تو خیر کیا ہوتی بس مرزا صاحب سے ایک ہی جملہ کہتے رہے کہ دیکھیے آپ سے محبت ہے۔ ایک بار منافع چھوڑ دیجئے اور معرکے کی چیز تیار کر دیجئے۔ مرزا صاحب بے چارے ہر بار ہاں کرتے رہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے صرف یہ جملہ دُہراتے رہے۔ کام کیسے شروع ہوگا TRANSPARENCY کون جیتا کرے گا اس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ غرض کام کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

جب ترنگ میں ہوتے تو صرف ایک جملہ گھنٹوں دُہراتے جاتے۔ کراچی میں میرے گھر کھانے پر آئے تقریباً نو بجے پہنچے، عالمِ سرور میں تھے کہنے لگے کہ عزیز جہاں بیگم ادا میری بہن ہیں تو آپ کیا ہوئے میرے بہنوئی اور میں کیا ہوا سالا اور ساری خدائی ایک طرف بیوی کا بھائی ایک طرف۔ ڈیڑھ گھنٹے اس ایک جملے کی مختلف طریقوں سے تکرار رہی۔ بہت مشکل سے گیارہ بجے کے قریب کھانے کی میز پر پہنچنے کے لئے تیار ہوئے۔ ایک گھنٹے میں کھانا ختم ہوا۔ واپس ان کو فیڈرل بی ایریا ان کے گھر پہنچانا تھا۔ مجھے مکان نہیں معلوم تھا اور مجھے یقین نہیں تھا کہ صادقین راستہ بتا سکیں گے۔ میرا بیٹا عامر موٹر چلا رہا تھا۔ صادقین آگے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اور تقریباً بارہ بجے کے بعد ہم لوگ روانہ ہوئے مجھے بہت حیرت ہوئی کہ بغیر ایک بار بھٹکے ہوئے وہ اپنے گھر کے علاقے میں پہنچ گئے۔ گھر کے پاس پہنچ کر ضرور کچھ دقت ہوئی کیونکہ اندھیرا تھا اور سارے گھر تقریباً ایک وضع کے بنے ہوئے ہیں لیکن ایک دو گھروں کے بعد وہ صحیح گھر پہنچ گئے۔ جب گھر والوں نے دروازہ کھول دیا تو میں رخصت ہوا۔ دوسرے دن دوپہر فون آیا تو گزشتہ شب کے لئے حسبِ دستور معافی مانگ رہے تھے۔

ان دنوں میری نواسی جو امریکہ میں رہتی ہے آئی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر چھ سال کی تھی اور وہ روم ہوتے ہوئے آئی تھی۔ میں نے صادقین کا تعارف کرایا کہ یہ بہت بڑے پینٹر ہیں۔ گفتگو انگریزی میں ہوئی کہنے لگی۔ IS HE MICHELANGELO بہت خوش ہوتے کہنے لگے۔ NO, BETTER IS SADEQAIN اور اپنے نام کے چھ انگریزی حروف بتائے۔ میری نواسی خاصی مرعوب ہوئی اور صادقین بچوں کی طرح بے حد خوش ہوتے اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور کچھ دیر روم کے گرجے کی باتیں کرتے رہے جس کی چھت پر مائیکل انجلو نے مصوری کے شاہکار بنائے تھے جو آج بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں مائیکل انجلو سے کم نہیں۔ یہ تھا اس کا تبصرہ۔

ان یادوں میں تاریخ وار ترتیب نہیں ہے۔ گزشتہ آٹھ سالوں میں صادقین تین مرتبہ اسپتال میں داخل ہوئے اور اس بار تو وہ اسپتال ہی سے مالکِ حقیقی سے ملاقات کے لئے روانہ ہو گئے۔ کچھ کھانسی وغیرہ ہوئی اور مجھے معلوم ہوا کہ جناح اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں داخل ہیں۔ ہم دونوں دیکھنے گئے تو دربار لگا ہوا تھا۔ پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں جتنی کرسیاں تھیں ان پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دو خوش شکل لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اسپتال کی نرسیں بھی موجود تھیں۔ سرہانے میز پر دواؤں کی شیشیاں اور نلیاں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ ساڑھی میں ملبوس ایک مہترانی کھڑی مسکرا رہی تھی اور اخبار کے ایک صفحے پر صادقین اس کا اسکیچ بنا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسکیچ تیار ہو گیا۔ اور پھر فوراً صادقین نے ایک رُباعی کہی اور وہ بھی لکھ کر اس کاغذ کے ایک کونے میں اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ وہ مہترانی بہت خوش ہوئی۔ سامنے دیوار پر ٹیپ سے وہ اسکیچ لگا دیا گیا۔ جب تک صادقین اسپتال میں رہے وہ اسکیچ دیوار پر لگا رہا۔ اسپتال سے روانگی کے وقت صادقین نے اسکیچ مہترانی کو بخش دیا اور غالباً آج وہ اسکیچ کسی جھگی میں اس مہترانی کے خاندان کا ایک قیمتی سرمایہ ہوگا۔ اس کو صادقین کے مقام کا علم تو نہیں ہوگا لیکن اس نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ اس کے سامنے

بہت ساری خواتین نے اپنے اسکیچوں کی فرمائش کی لیکن کچھ کی فرمائش پوری نہیں ہوئی۔ اس دن صادقین کے لئے وہ قابلِ اعتنا تھی اور وہ گفتگو میں اس کے خدوخال کے حسن کو بیان کر رہے تھے اس کا رنگ کالا تھا اور غالباً تیس بتیس برس کی ہوگی۔

ان کا کمرہ ایک کلب معلوم ہوتا تھا۔ اسپتال کا عملہ بھی ان کو مریض شمار نہیں کرتا تھا۔ اُن کا چارٹ وغیرہ تو پُر کردیا جاتا اور دوائیں بھی مل رہی تھیں لیکن ایک مریض کے آرام کے لئے جو پابندیاں لازم ہیں ان سے صادقین کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ نہ سگریٹ پر پابندی عائد کی گئی نہ شغل پر نہ ان کے ملنے والوں پر۔ ان کے معالج خود بھی صرف گپ شپ کرتے۔ بسم اللہ لکھواتے یا اسکیچ بنواتے۔ اس سے قبل بھی صادقین جناح اسپتال میں کئی بار قیام کر چکے تھے۔ ایک بار اسپتال میں خطاطی کی نمائش بھی کی تھی اور اسپتال والوں نے روشنی وغیرہ کا انتظام کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسپتال والوں نے ان کے علاج کی طرف سے غفلت برتی صرف یہ کہنا مقصد ہے کہ ان کو مریض نہیں سمجھا گیا شاید ان کے معالج کو اس بات کا علم تھا کہ وہ کسی کی پابندی برداشت نہیں کریں گے۔ حالانکہ معمولی دیکھنے والوں کو بھی یہ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اس بار صادقین واقعی بیمار ہیں۔ دو تین بار تو ان کو انتہائی نگہداشت والے کمرے میں لے جایا گیا لیکن بحیثیت مریض ان کو وہ آرام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صادقین آسانی سے پابندیوں کو قبول نہیں کرتے لیکن مریض کی جان بچانے کے لئے اسپتال والوں کو سختی کرنا چاہئے تھی چاہے بدمزگی ہی کیوں نہ ہوتی۔ سگریٹوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی اور اس درمیان صادقین پر کھانسی کا دورہ پڑتا رہا۔ ہر وقت چائے اور شغل، کھانے کے وہی غیر معینہ اوقات اور ہر قسم کی بے احتیاطی۔ ایک شام میں صادقین کے بھانجے کو باہر لے گیا اور میں نے اس کو سمجھایا کہ گو کہ وہ عمر میں صادقین سے چھوٹا ہے لیکن صادقین جس حال میں ہیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ اسپتال کے حکام سے کہا جائے کہ وہ ملاقاتیوں پر پابندی لگائیں اور ان کی غذا وغیرہ میں احتیاط برتیں۔ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ صادقین روز بروز کمزور ہو رہے تھے اور کھانسی کا دورہ زیادہ ہو رہا تھا۔ آواز میں نقاہت تھی۔ ایک مرتبہ میں نے سگریٹ بجھوادی۔ انہوں نے میرا کہا مان لیا لیکن میں بھی جانتا تھا کہ اس ایک سگریٹ کے بجھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، ان کو زیادہ توجہ کی ضرورت تھی جو اُن کو نہیں مل رہی تھی۔ اس میں اُن کی اپنی ضد[illegible]لی طبیعت اور اسپتال والوں کی نرم دلی یا بے توجہی دونوں شامل تھے۔ صادقین کو بخار رہنے لگا تھا۔ ایک شام اداؔ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہنے لگے کہ اطمینان رکھیں میری مرنے کی نیت نہیں ابھی تو فریئر ہال کا کام بھی پورا کرنا ہے۔

۔۔۔ اور بہت سے کام ہیں۔ میں نے خود نوشت یاد دلائی تو کہنے لگے ہاں وہ بھی ضروری کام ہے لیکن پہلے فریئر ہال کا وعدہ پورا کرنا ہے۔

میری بیٹی صبیحہ کی ایک سہیلی جو خود بھی مصورہ ہے دہلی سے آئی اور صادقین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بی بی میر اور احمد میر کو لے کر اسپتال پہنچا، لیٹے ہوئے تھے۔ اُٹھ کر بات کی۔ بہت خوش ہوئے کچھ مصوری کی باتیں کیں۔ بی بی میر سے معذرت کا اظہار کیا کہ اسپتال میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کو تحفہ میں پیش کر سکتے لیکن وہ جلد ہی ایمبیسی کے ذریعے اس کو دہلی اپنی کوئی تصویر بھیجیں گے۔ میرا ہندوستان ایمبیسی میں بہت اثر ہے۔ جب وہ دہلی گئے تھے تو اندرا گاندھی سے جو اُن کی گفتگو ہوئی تھی وہ سنائی۔ یہ صادقین کا بچپنا تھا وہ بہت بڑا مصور تھا۔ ساری دُنیا میں اُس کے کام کی نمائش ہو چکی تھی۔ اس کو عالمی اعزازات حاصل ہو چکے تھے۔ پاکستان میں کام کی مقدار کے لحاظ سے اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ لیکن اپنی گفتگو میں وہ خود اپنی اہمیت ضرور جتاتے۔ ان کو کچھ ہندسے یاد تھے کہ انہوں نے اتنے ایکڑ میورل بنائے ہیں، ان کی خطاطی اگر زمین پر بچھائی جائے تو کئی میل طویل ہوگی اور بسم اللہ تو بغیر مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں لکھ کر تقسیم کر چکے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں برش پکڑتے پکڑتے ٹیڑھی ہو چکی تھیں اور جب وہ ہاتھ اُٹھا کر انگلیوں کو ایسے خاص طریقے سے ہلاتے تو وہ لفظ اللہ کی شکل اختیار کر

یقینی۔ یہ لفظ صادقین کے قلب پر نقش تھا۔

اس آخری علالت میں جب وہ چلنے کے قابل نہیں تھے۔ شیروانی پہن کر سید محمد جعفری صاحب مرحوم کے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ میں نے بہت منع کیا کہ نہ جائیں وہ لڑکا کچھ جانے گا کہنے لگے نہیں وہ خود آیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا اگر نہیں جاؤں گا تو اس کو مایوسی ہوگی "جعفری صاحب مجھے ہوا کیا ہے بس ذرا کمزوری ہوگئی" یہ وہ شخص کہہ رہا تھا جو انتہائی ذہین تھا، جس کو پوری طرح معلوم تھا کہ وہ بہت بیمار ہے لیکن دوست کے بیٹے کی دعوت کے لئے وہ جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے کچھ عالم سرور تھا لیکن کمزوری زیادہ تھی۔ دو آدمیوں کے سہارے وہ آئے وعدہ پورا کرکے چلے گئے۔

کراچی ایک مصروف شہر ہے اور باوجود خواہش اور محبت ہم لوگ روز صادقین کی مزاج پرسی کے لئے اسپتال نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن قمر کے ذریعے تقریباً روز فون پر حال معلوم ہوتا تھا۔ ۔ ۔ ان کو کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا تھا۔ کھانا تقریباً بند ہو چکا تھا لیکن پینا جاری تھا۔ صادقین نے کبھی اپنی اس کمزوری کو نہیں چھپایا لیکن ان کا ظرف بے پناہ تھا۔ میں نے ان کو مدہوش تو دیکھا ہے لیکن کبھی ان کی زبان سے مبتذل لفظ نہیں سنا۔ اور معرفت کی باتیں زیادہ ہو جاتیں گو کہ زبان لڑکھڑاتی تھی اور پوری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دخترِ رز کی تلاش میں وہ آج تک نہیں نکلے نہ اس کے لئے کبھی کسی سے فرمائش کی۔ ان کے مداح اور ان کو پسند کرنے والے خود اس کے پہنچانے کا انتظام کرتے تھے۔

وہ تقریباً پندرہ ماہ ہندوستان میں رہے ان کی آؤ بھگت ہوئی۔ انہوں نے سرکاری اور عوامی سطح پر بنارس ہندو یونیورسٹی سے لے کر مدراس اور حیدرآباد تک کا سفر کیا۔ ہر جگہ مفت میورل بناتے رہے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ کبھی پاکستان کے سلسلے میں ایک لفظ شکایت کا نہیں کہا۔ عسکری (ابن سعید) جو ان دنوں دہلی میں ایمبیسی میں وزیر اطلاعات تھے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ اُن کو جو کچھ ملا ہے وہ پاکستان کی وجہ سے ملا ہے۔ پاکستان ان کی شناخت ہے۔ ہندوستان کے قیام میں وہ اپنا سرمایہ صرف کرتے رہے۔ پاکستان کی وزارت خزانہ سے خصوصی اجازت لے کر اپنا روپیہ ہندوستان منگوایا اس کا مجھے علم ہے۔ یہ تو ان کی خودداری اور پاکستان سے محبت کا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے عالم وارفتگی وہاں بھی طاری ہوتا ہوگا لیکن صادقین کی فرزانگی اپنی جگہ تھی یہ ان کے وطن کی عزت کا سوال تھا۔

ایک صبح قمر کا فون آیا کہ رات صادقین کو سانس کی بہت زیادہ تکلیف ہوگئی تھی اور انہیں سولجر بازار کے ایک پرائیویٹ کلینک میں پہنچا دیا گیا۔ قمر کا خیال تھا کہ یہ غلط قدم ہے۔ اور میں فضل الرحمٰن صاحب سیکرٹری صحت کو فون کرکے کہوں کہ صادقین کے علاج پر توجہ دی جائے اور ایک بورڈ اُن کے مرض کی تشخیص کے لئے تشکیل دیا جائے۔ میں نے کہا کہ پرائیویٹ اسپتال میں حکومت کا کوئی افسر کیسے داخل ہو سکتا ہے اور اسپتال بدلنے کا فیصلہ یقیناً اُن کے اعزہ نے کیا ہوگا۔ دن میں عابد علی شاہ سے فون پر خیریت دریافت کی اُنہوں نے بتایا کہ فیصلہ انہوں نے کیا تھا وہ جناح اسپتال کے علاج سے غیر مطمئن تھے۔ اسپتال میں ایک بورڈ کی تشکیل ہوگئی ہے۔ اور امراض قلب اور سینے کے ماہرین اُن کا علاج کر رہے ہیں۔ رات اُنہوں نے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں گزاری۔ فی الحال کوئی ملاقات نہیں کر سکتا۔ ایک دو دن میں وہ کمرے میں آ جائیں گے۔

صاف بات یہ ہے کہ میں صادقین کو اس عالم میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے اداکو اسپتال بھیج دیا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آ چکے تھے اس کو دیکھ کر مسکرائے ہنسنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ کمرے میں دوسرے لوگ موجود تھے اُن سے تعارف کرایا اور میری خیریت دریافت کی۔ پھر وہی تسلی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جاؤں

گا لیکن حالت نہیں سنبھلی ۔ دوسری بار جب ادا آگئی تو وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پہنچ چکے تھے ۔ اور حالت تسلی بخش نہیں تھی ۔ میں دیکھنے نہیں گیا کچھ ہمت نہیں پڑتی تھی ۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے لیکن میرے دل کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ جانبر نہیں ہو سکیں گے ۔ عابد علی شاہ صاحب سے بات ہوئی کہ ان کو لندن لے جایا جائے ۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس قابل نہیں کہ طویل سفر کی تکان برداشت کر سکیں ۔ بس یہی کوئی معجزہ ہو جائے دعا کی ضرورت ہے ۔

ایک صبح تقریباً ۲ بجے قمر نے فون پر وہ خبر سنائی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا اور جو ذہن سننے کے لئے تیار تھا ۔ صادقین تین بجے چلے گئے ۔ میں نے تفصیل نہیں پوچھی اور فون بند کر دیا ۔

دو تین گھنٹے دماغ قطعی خالی تھا اور میں روز کے معمولات میں لگ گیا ۔ جب بات ذہن نشین ہو گئی تو فون پہ تدفین کی بابت معلوم کیا ۔ ان کے آخری سفر میں کاندھا دیا ۔ یہ وہ شخص تھا جو دوسروں کو سہارا دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا لیکن خود کسی سہارے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور نہ قبول کیا ۔ پہلی بار صادقین مجبور تھا ۔ یہ انا کا پتلا اب مٹی کا ایک ڈھیر تھا ۔ یہ بہتر اور چہتر گھنٹے بغیر پلک جھپکائے ہوئے کام کرنے والا ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر چکا تھا ۔ اب اس کی ٹیڑھی انگلیاں خلا میں کبھی نقش نہیں بنائیں گی " جعفری صاحب ٹھاٹھ دیکھ رہے ہیں نا " کہنے والا نظیر اکبر آبادی کے مصرعے " سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا " کی بولتی ہوئی تصویر تھا ۔ سوگوار چہرے مدھم لہجے میں گفتگو ، کچھ لوگ ٹی وی کیمرے والوں کے سامنے آ کر تصویر کھنچوانے میں مصروف تھے کچھ انٹرویو دے رہے تھے ۔ پریس فوٹو گرافروں سے اپنے گروپ بنوا رہے تھے آخر یہ بھی ایک اہم موقع تھا اور دوسرے دن ٹی وی اور اخباروں میں تصویریں آ ہی گئیں ۔ مجھے منگلا کی وہ دوپہر یاد آ رہی تھی جب صادقین ہم سے ملنے پر بھی تیار نہیں ہوا تھا اور خاموشی سے چلا گیا تھا ۔ پھر ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۶ء تک کے احسانات یاد آئے کتنا قریب آ گیا تھا ۔ وہ تصویروں میں باغی تھا لیکن ذاتی تعلقات میں اقدار کا حامل تھا ۔ عمر اور بزرگی کا خیال ، تعلقات کا پاس ، رکھ رکھاؤ ، وضع داری ، محبت ، مروت ، جان بوجھ کر دھوکا کھانا کہ دوسرا خوش ہو جائے ۔ یہ لکھ لٹ خوشیوں کا بانٹنے والا ، یہ ہشیار بادہ نوش جس نے لاکھوں گھروں میں اللہ تعالیٰ کے نام کو اپنے قلم سے روشن کر دیا اب تاریک قبر میں اتارا جا رہا ہے ۔ ایک حساس دل ، ایک روشن دماغ ، ایک بے چین دل ، سیماب صفت انگلیاں اس وقت صرف خاک ہیں اور اپنے خمیر سے مل جائیں گی ۔ اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو اپنے نور سے تا قیامت روشن رکھے ۔ آمین ۔

بد قسمتی سے پاکستان میں کثرتِ استعمال سے الفاظ نے اپنی قدر و قیمت کھو دی ۔ ادب و فن کا ہر نو وارد عظیم ہوتا ہے ۔ افق دریافت کرتا ہے ۔ فہم و ادراک کے منفرد معیار قائم کرتا ہے ۔ جب عظمت ٹکے سیر ہو جائے تو پھر صادقین ایسی نابغۂ روزگار شخصیتوں کے بارے میں کیا الفاظ استعمال کئے جائیں ۔ لکیریں اور رنگ اس کے غلام تھے ۔ ایک منٹ ، ایک سادہ کاغذ ، اخبار کا صفحہ ایک مارکر ، صادقین کی انگلیاں ایسے نقش و نگار بنا دیتی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی ۔ ذہن نے کوئی نقش بنایا اور اس کی انگلیوں نے اسے کاغذ پر منقش کر دیا ۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی ۔ لیکن جب تقریر کرنے پہ آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ خوب صورت الفاظ کا ایک آبشار ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا ۔ باتوں میں ربط ، استدلال میں کبھی جھول نہیں ۔ لکھنے پہ آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ کے ہیرے اور جواہر جڑے ہوئے ہیں ۔ صادقین کی رباعیاں اس کی قادر الکلامی کا نمونہ ہیں ۔ مزاج کی چاشنی ، حالاتِ حاضرہ پہ ایک ہلکا سا طنز ، صادقین صرف ناگواری کا اظہار کرتا تھا ، اسے لیکن غصہ نہیں آتا تھا ۔ ذاتی طور پہ روپے سے بے نیاز وہ اپنے خاندان کا کفیل تھا ۔ نہ معلوم کتنے غریبوں کی مدد کی یعنی ہزار دو ہزار پانچ ہزار دے دیئے ۔ کسی کی بچی کی شادی ، کسی غریب کا علاج لیکن اس طرح دیتا تھا کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی ۔ یوں تو اس کا حلقۂ احباب

منیر احمد شیخ

صادقین — ایک عجوبۂ روزگار

صادقین اک عجوبۂ روزگار تھا۔ مصوروں سے میری دوستی ذرا کم ہی رہی ہے۔ اس گروہ میں، میں نے بہت کم لوگ دیکھے جن کی پرسنیلٹی میں کوئی ایسی پیچیدگی نہ ہو جو طبیعت میں انقباض پیدا کر دیتی ہے۔ صادقین کا معاملہ بھی خاصا ٹیڑھا تھا۔ اسکی صحبت میں من مارکے بیٹھنا پڑتا تھا۔ گفتگو کا مرکز ہمیشہ اس کی اپنی ذات ہوتی تھی جس سے وہ کم ہی باہر نکل پاتا تھا۔ سننے والے تھوڑی دیر تک تو دلچسپی کا اظہار کرتے مگر پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگ جاتے مگر اس کمزوری کے باوجود صادقین زبان و بیان پہ اس قدر قدرت رکھتا تھا کہ سننے والا تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ہو کے رہ جاتا۔ دراصل سارا جادو اُس کی شخصیت میں تھا جو دوسروں سے اس قدر مختلف اور نمایاں تھی کہ خود بخود توجہ کا مرکز بن جاتی۔ ایسی شخصیت کو گرفت میں لانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کی زندگی میں میں نے کئی بار چاہا کہ صادقین پہ لکھوں پر مگر ہر مرتبہ وہ میری انگلیوں میں سے یوں نکل جاتا جیسے مچھلی۔ اب جبکہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گیا ہے اور زندگی میں ایک نہ پُر ہونے والا خلا ہمیشہ کے لئے پیدا کر گیا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ میں اگر اسے گرفت میں نہیں لا سکتا تو کم از کم ان لمحوں کو محفوظ کر دوں جو میرے ساتھ گزرے یا جن کا مشاہدہ کرنے کا مجھے موقع ملا۔

صادقین کے فن سے آشنائی تو ایک مدت سے تھی مگر اس سے ملاقات ہندوستان میں ہوئی۔ یہ ۱۹۸۱ء کا ذکر ہے میں دلی میں پاکستان کے سفارت خانے میں پریس کونسلر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایک روز انڈین پرائم منسٹر کے سیکریٹریٹ سے فون آیا کہ مسز اندرا گاندھی پرسوں رومانیہ کے دورے پہ جا رہی ہیں اور وہ کل دن کے ۱۲ بجے صادقین سے ملنا چاہتی ہیں گی۔ پوچھا کہ صادقین کب آ رہے ہیں؟ کہا کہ اس وقت وہ ہوائی جہاز میں ہیں۔ یہ فلائیٹ دو بجے بعد دوپہر دہلی پہنچ رہی ہے۔ وقت دیکھا تو دن کا ایک بج چکا تھا۔ اسی وقت بھاگا بھاگ پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچا تاکہ اسے وہیں اطلاع کر دوں اور پرائم منسٹر سے ملاقات کے لئے پابند کر دوں جب وہاں پہنچا تو وہ مسافروں میں سے سب سے الگ ایک جانب پاسپورٹ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا میں جلدی سے آگے بڑھا، اپنا تعارف کروایا اور بتلایا کہ کل دوپہر ۱۲ بجے مسز اندرا گاندھی آپ سے ملاقات کی منتظر ہوں گی۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ضرور چلیں گے لیکن مجھے کوئی اطلاع اس کی نہیں دی گئی۔ میں نے بتلایا کہ خود مجھے اس کی اطلاع اس وقت ملی جب آپ کا جہاز محو پرواز تھا۔ صادقین نے کہا کہ ہندوستان کی وزیراعظم کا میں مشکور ہوں کہ انہوں نے وقت کی کمی کے باوجود غیر ملکی دورے پہ جانے سے پہلے میرے لئے وقت نکالا۔ یہ یقیناً میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔

دوسرے روز میں انہیں اپنے ہمراہ لے کر وزیراعظم ہند کے دفتر پہنچ گیا۔ انتظار گاہ میں ہمارے سامنے والے لکڑی کے صوفے پر تین فوجی جرنیل وزیراعظم سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً انہیں اسی وقت آنے کے لئے پہلے کہا گیا تھا مگر وزیراعظم کے پرسنل سیکریٹری نے آن کر انہیں کہا کہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ مسز گاندھی پاکستان سے آئے ہوئے آرٹسٹ سے پہلے ملنا چاہتی ہیں۔ جب ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ مصافحہ کیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ صادقین ابھی بیٹھے ہی

تھے کہ وہ چھوٹتے ہی بولیں: "آپ کے اخبارات ان دنوں مجھ پہ بہت کیچڑ اُچھال رہے ہیں!"

صادقین نے بڑی حیرت سے اپنا منہ اوپر اُٹھایا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میڈم! میں تو اخبار پڑھتا ہی نہیں!" اس غیر متوقع جواب پر مسز اندرا گاندھی ایک دم پشیمان سی ہو گئیں اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو جھٹک کر ایک طرف پھینک دیا۔ انہیں یوں لگا جیسے انہوں نے یہ سوال ایک غلط آدمی سے کر دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ملاقات کے دوران صادقین سے سیاست یا ہند و پاک کے باہمی تعلقات پر کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔ ہاں انہوں نے صادقین کو ہندوستان آنے پر خوش آمدید کہا اور اس سے پوچھا کہ وہ کب تک قیام کرے گا اور کہاں کہاں جانا پسند کرے گا۔ صادقین نے کہا کہ وہ کہیں اور جائے نہ جائے مگر اپنے آبائی شہر امروہہ ضرور جانا چاہے گا۔ گفتگو کے دوران صادقین نے کہا کہ میڈم آپ اپنی فائلیں دیکھتی جائیے اور میں اپنا کام کرتا ہوں۔ اور اپنی جیب سے ایک مارکر نکال کر سامنے پڑے ہوئے ایک سفید کاغذ پہ اللہ کے حروف لکھے اور مسز گاندھی سے کہا کہ آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پڑھئے کہ میں نے کیا لکھا ہے اور کاغذ کو ان کی جانب موڑا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ یہ "اوم" لکھا ہے۔ صادقین نے کاغذ کو ان کی جانب موڑ کے سیدھا کر کے کہا "اب پڑھیے" مسز گاندھی نے کہا۔ "اللہ" مسز گاندھی نے پوچھا "یہ کیسے ہوا؟"

صادقین نے کہا۔ کچھ نہیں یہ محض "جگلری" (اُستادی) ہے۔

یہ محفل آدھ گھنٹہ کے قریب رہی۔ دوران گفتگو اردو زبان اور فن مصوری و خطاطی پر خوب باتیں ہوئیں۔ باہر آئے تو میں نے صادقین سے کہا کہ یا حضرت پاکستانی اخبارات پر مسز گاندھی کی جھنجھلاہٹ تو بجا مگر آپ نے تو سرے سے اخبارات سے اپنی بے تعلقی ہی کا اعلان کر دیا۔ صادقین نے کہا تو بھئی اور کیا کرتا۔ پہلی ملاقات میں میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں اس موضوع کو سر اُٹھانے نہ دوں۔

ابھی ہم باہر جانے کے لئے سیڑھیاں اُترنے ہی والے تھے کہ مسز گاندھی کا پرسنل سیکرٹری بھاگا بھاگا پیچھے آیا اور ہانپتے ہوئے آواز دی "صادقین صاحب! صادقین صاحب! ذرا ٹھہریئے۔ وزیر اعظم پوچھ رہی ہیں کہ آپ امروہہ کس دن جا رہے ہیں؟ صادقین نے کہا کہ اس ماہ کی ۸ تاریخ کو جا رہا ہوں۔ پرسنل سیکرٹری نے کہا کہ "نہیں آپ گیارہ تاریخ کو جائیے" صادقین نے کہا کہ نہیں میں اپنے عزیز و اقارب کو اطلاع دے چکا ہوں، اب رُکنا مناسب نہیں۔ پرسنل سکریٹری نے کہا کہ پہلے شہر آپ کو ریسیو کرنے کی تیاری کر لے، پھر آپ وہاں جائیں۔

وزیر اعظم کی اس خواہش پر صادقین نے کہا۔ اچھا جیسے وہ چاہتی ہیں ہم گیارہ ہی کو چلے جائیں گے۔

گیارہ تاریخ جب آئی تو دہلی کے ریلوے پلیٹ فارم پر امروہہ جانے والی گاڑی میں صادقین کے لئے الگ ڈبہ لگایا گیا تھا جس پر جلی حروف میں صادقین لکھا ہوا تھا۔ جب یہ گاڑی امروہہ پہنچی تو اسٹیشن پر صادقین کو خوش آمدید کہنے کے لئے شہر اُمڈ پڑا تھا کمشنر، پولیس کے اعلیٰ افسران، عمائدین شہر اور دیگر حکام ہاتھوں میں ہار لئے کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک ہاتھی کو سجا کر کھڑا کیا گیا تھا۔ صادقین پھولوں سے لدا اس ہاتھی پر سوار ہوا تو اوپر ہودے پر قدم رکھتے ہی اُس نے نیچے اپنے ذاتی سیکریٹری انور کو آواز دی "انور! اس طرح تو جواہر لعل بھی امروہہ میں نہیں آئے تھے۔"

ہاتھی کی سواری شہر کی جانب چلی۔ جگہ جگہ کیلوں کے درختوں کے دروازے بنے ہوئے تھے اور بازاروں میں مکانوں کی چھتوں پر سے پھولوں کی پتیوں کی بارش صادقین پر ہو رہی تھی۔ صادقین کا اپنے شہر کے بازاروں میں اس طمطراق سے جانا اس کی زندگی کا یقیناً ایک اہم واقعہ تھا۔

صادقین ہندوستان میں ایک بین الاقوامی نمائشی میلے میں شرکت کے لئے صرف ایک ہفتہ کے لئے آیا تھا مگر ایک سال سے

کچھ عرصہ اور یہ تک رُک گیا۔ اس طویل قیام کے دوران اس نے اپنے آپ کو بے حد مصروف رکھا۔ کئی شہروں میں اپنی تصاویر اور خطاطی کی نمائشیں کیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی، سرنگاپٹم میں ٹیپو سلطان شہید کے مزار، دہلی میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی دیواروں اور چھتوں پر اپنے فن کے نقش ثبت کئے۔ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت دہلی شہر کی پُرشکوہ عمارتوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کا ہال کمرہ گولائی میں تین چار منزلوں تک اوپر اٹھا ہوا ہے۔ صادقین ساڑھے تین ماہ تک اس کی گول دیواروں پر اللہ کے ننانوے نام لکھنے میں دن رات مصروف رہا۔ اس میں اس کی گردن بھی ٹیڑھی ہوگئی مگر وہ بے حد خوش تھا کہ اس نے یہ یادگار کام مکمل کر لیا۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری اور بنارس یونیورسٹی کے بڑے دروازے پر بھی خطاطی کی جس کے لئے اسے خاصی محنت کرنا پڑی لیکن وہ محنت میں بڑا خوش رہتا تھا۔ کام کے دوران اُس پہ ایک جذب کی سی کیفیت ہوجاتی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہوکر اپنے کام میں گم ہوجاتا۔ رنگ اور لکیریں ہی اس کی زندگی تھی اور وہ ہر وقت انہی میں ڈوبا رہتا۔ بلاشبہ اس دنیا میں جنہوں نے کچھ نام کمایا، وہ اسی قبیل کے لوگ تھے۔ اپنے کام میں عشق کی حد تک ڈوبے ہوئے، دنیوی طمع و حرص سے بے نیاز۔ صادقین نے ہندوستان کے قیام کے دوران اپنے کام کا معاوضہ لینے سے قطعی انکار کر دیا۔ بعض اداروں نے اس کی خدمت کے پیشِ نظر اسے مناسب طریقے سے نوازنے کی کوشش بھی کی مگر وہ ٹس سے مَس نہ ہوا۔ اپنے قیام کے دوران اخراجات کے لئے جب اس کے پاس پیسے ختم ہوجاتے تو وہ میرے دفتر میں آجاتا اور سامنے میز پر بیٹھ کر خطِ شکستہ میں صدرِ پاکستان کو ایک خط لکھتا کہ اس فقیر نے مشرقِ وسطیٰ سے لوٹتے ہوئے زرِ مبادلہ کی اتنے لاکھ کی کثیر رقم سرکارِ دولت مدار کے حوالے کر دی تھی اس میں سے اتنے ہزار بھجوا دیجئے کیونکہ یہ فقیر اپنے نان و نفقہ کے لئے ہندوستان میں کسی کے آگے اپنا ہاتھ پھیلانا نہیں چاہتا۔ اس خط کے جواب میں پاکستان سے مطلوبہ رقم اُسے فی الفور پہنچ جاتی۔

صادقین نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے قریب ایک نئی بستی جنگپورہ میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور اس کے کمروں میں چٹائیاں بچھا دیں اور ایک سال کے لگ بھگ انہی چٹائیوں پر دن رات گزار دیئے۔ اس فلیٹ کے در و دیوار کو بھی اپنی نقاشی سے بھر دیا اور محلے بھر میں ایک دھوم مچا دی۔ محلے والے جو تحفہ جیز گھروں میں پکاتے اسے صادقین کے پاس بھجوا دیتے اور دیکھتے دیکھتے وہ جنگ پورے کا ایک محبوب باسی بن گیا۔ کسی پان والے کے سامنے اس کا نام لیجئے، وہ اس کے گھر کا پتہ بتا دیتا تھا۔ "غالب، دلی" کی طرح اس کا پتہ بھی مختصر ہوگیا تھا اور وہ "صادقین، جنگ پورہ، دلی" کے پتے پر ہر کس و ناکس کو مل جاتا۔ وہ اپنی اس قدر مقبولیت پر بہت خوش تھا اور اکثر اس کا اظہار بھی کرتا۔

دلی ہندوستان کا دارالحکومت ہونے کے ساتھ وہاں کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز بھی ہے۔ موسیقی، مصوری، ڈرامہ، فلم، لوک میلے، ادبی مجالس اور موسمی تہواروں کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ کوئی صبح اور شام ایسی نہیں ہوتی جب اس شہر میں کچھ نہ کچھ نہ ہو رہا ہو۔ اس ہجوم فن میں صادقین کا چہرہ بھی اب نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ اُس کی تصاویر کی پہلی نمائش انڈین کونسل فار کلچرل افیئرز نے دلی میں منعقد کی جس کا افتتاح ہندوستان کے نامور مصور ایم۔ حسین نے کیا۔

ہندوستانی پریس نے صادقین کے فن اور شخصیت پر خوب تبصرے کئے۔ مضامین کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ کوئی اخبار اور رسالہ ایسا نہ ہوگا جس نے صادقین پر نہ لکھا ہو۔ خود صادقین نے ان مضامین کو اکٹھا کیا اور ایک جلد میں محفوظ کر لیا۔ یہ مضامین ایک ضخیم کتاب کا مواد بن گئے تھے اور اُس کا ارادہ تھا کہ اُسے جب فرصت ملی تو وہ ان مضامین اور تبصروں کو کتابی شکل میں شائع کرے گا۔ یہ مضامین اور تبصرے ان کے کاغذات میں اب بھی محفوظ ہوں گے۔

روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر سردار خشونت سنگھ، ٹائمز آف انڈیا کی کالم نویس اوما واسودیو اور السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں ایم حسین کے مضامین کا بڑا شہرہ ہوا۔ صادقین اس واقعے کو اپنے لئے بہت بڑا اعزاز جانتا تھا کہ اس کے ایک ہمعصر

نامور مصور ایم الیف حسین نے اس کے فن کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

صادقین کے کئی انٹرویو ریکارڈ کئے گئے۔ ان تمام انٹرویوز میں صادقین نے بڑی استقامت دکھلائی۔ کہیں بھی اس کی زبان نے لغزش نہ کھائی۔ ہندوستان میں اس قدر آؤ بھگت اور قدر و منزلت کے باوجود اس نے اپنی وابستگی اپنے ملک سے قائم رکھی اور اپنی سرزمین پر اس کے ایمان میں ذراسی بھی دراڑیں پیدا نہ ہوئیں۔ اسی رویئے کی بنا پر اس کی زیادہ عزت ہوئی بہ نسبت ان شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے جو اپنی جنگ اپنی سرزمین میں لڑنے کی بجائے ملک کی سرحدوں سے باہر نکل کر ملک کو مطعون کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صادقین بھی ایک حساس فنکار کی طرح اپنے ملک کی ہر شئے سے خوش نہ تھا اور اس کا اظہار بھی وہ اپنوں میں کرتا رہتا مگر وہ غیروں کے درمیان بیٹھ کر اپنوں میں کیڑے نکالنے کا قائل نہ تھا۔ یہ وطن سے محبت کے علاوہ ذہنی بلوغت کی بھی دلیل تھی جو مجھے صادقین کے علاوہ فیض احمد فیض میں بھی نظر آئی کہ وہ بھی دوسرے ملکوں میں جا کر اپنی موجودگی کو ایکسپلائٹ نہیں ہونے دیتے تھے۔

اُدھر دوسری جانب صادقین کے ادبی چسکے کا سامان غالب اکیڈمی اور ایوانِ غالب مہیا کر رہے تھے۔ ان دونوں اداروں میں صادقین کی خطاطی کی نمائشیں منعقد ہوئیں اور پھر شعر و سخن کی محفلیں بھی خوب جمیں۔ صادقین نے ان محفلوں میں گھنٹوں بھر اپنی رباعیات سنائیں جو مختلف مضامینِ سخن کا احاطہ کرتی تھیں۔ رباعیات بھی خطاطی کی طرح اُس کا ایک شغل تھا۔ ان دونوں سرگرمیوں کو وہ اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا جتنا مصوری کو اور اسے یہ احساس تھا کہ مصور کی حیثیت سے وہ کہیں درمیان میں آن کے رُک گیا ہے اور آگے نہیں بڑھ سکا مگر وہ اس مقام کی عظمت سے پوری طرح آگاہ تھا اور کبھی کبھی ہوش اور بیہوشی کے درمیان وہ دبے دبے لفظوں میں اس کا اقرار بھی کیا کرتا مگر خاص نجی اور مخصوص محفلوں میں۔

صادقین صاحب کا نام دراصل ایک مصور کی حیثیت سے ہی پاکستان کے تہذیبی منظر نامے پر اُبھرا تھا۔ اس ابتدائی دور کی تصاویر میں "کیکٹس پیریڈ" اور "سرمد پیریڈ" مصوری کے میدان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں ان کے تخلیقی کارناموں میں انسانی زندگی کے مجبوری و بے بسی، خیر و شر کی باہمی کشمکش اور عقل و عشق کی جنگ رنگوں اور لکیروں میں ظاہر ہو رہے تھے۔ یہ دَور مصور کی حیثیت سے صادقین کا زرخیز ترین دور تھا اور اُس کے اس دَور کی تصاویر میں تخلیقی شدت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ازاں بعد پیرس سے واپسی کے بعد وہ ایک اور دور میں داخل ہوا اور چند نئے موضوع اسکی مصوری میں داخل ہوئے جن میں عشق و محبت سب سے نمایاں طور پر سامنے آیا۔ اس زمانے میں انہوں نے رنگین تصاویر کے علاوہ ڈرائینگز اور اسکیچیز کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کی ڈرائینگز کی ایک نمائش KISS (بوسہ) کے عنوان سے لاہور میں منعقد ہوئی جسے "اہلِ خرد" نے نذرِ آتش کر دیا۔ اس جلتی ہوئی نمائش میں سے وہ صرف چند تصاویر بمشکل بچا سکے۔ اس کے "جنوں" پر یہ پہلی قدغن تھی۔ وہ بہت تِلملایا، بہت چیخا اور چلایا اور پھر مصوری کے بجائے خطاطی میں پناہ لے لی۔ کیا صادقین نے ایک PURITAN معاشرے کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی؟ اس پہ اختلافِ رائے ہو سکتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ صادقین نے زمانے کی ہوا کو دیکھ کے ہتھیار ڈال دیئے حالانکہ وہ سرمد شہید اور غالب کا خود کو مُرید سمجھتا تھا اور یہ دونوں ہستیاں اپنے عہد کے جبر کے خلاف انسانی آزادی کی جدوجہد کی علامتیں بن چکی ہیں۔ اب جو اس کی زندگی میں مروجہ روایات اور تصورات کے خلاف جو تھوڑی بہت بغاوت نظر آتی تھی، وہ اس کی ذات تک ہی محدود ہو کے رہ گئی تھی، اس کا اظہار اس کے فن میں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ بحیثیت مصور کے صادقین ۱۹۶۰ء کے آخر میں مر گیا تھا۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر خطاطی ہی کرتا رہا جسے مقبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا اور جس کی کمرشل حیثیت بھی تھی۔ زندگی کے آخری سالوں میں اُسے قبولِ عام کے ساتھ قبولِ خاص کی اسناد بھی عطا ہوئیں اور خطاطی نے اسے مال و دولت سے بھی بے نیاز کر دیا مگر وہ اپنے آپ کو مجبور اور تنہا سمجھنے لگا تھا۔

صادقین واقعی بہت تنہا ہو گیا تھا۔ وہ محبت کا بہت جویا تھا۔ جس سے محبت کرتا ٹوٹ کے کرتا۔ اس پہ اپنا سب کچھ نثار کر دیتا۔ اس کا دسترخوان بڑا وسیع تھا اور وہ بہت تواضع کرنے والوں میں سے تھا۔ عمر بھر شادی نہ کی مگر حسینوں کا تذکرہ اسکی زبان پہ ہر وقت رہتا اور ان کے حسن کے بیان میں اس کے یہاں ایک ایسی چمک آجاتی کہ وہ جو کچھ منہ سے کہتا وہ شعر و ادب کا درجہ اختیار کر لیتا۔ افسوس کہ کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ صادقین کی گفتگو کے ان لمحات کو ریکارڈ کرلے۔ اس کی گفتگو اُردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہوتی۔

وہ غالب کے عاشقوں میں سے تھا اور اس کی گفتگو غالب کے اشعار میں گندھی ہوتی۔ وہ یہ موتی اسی کثرت اور فیاضی سے بکھیرتا چلا جاتا جس فیاضی سے وہ اپنے ہر ملنے والے کو خطاطی کے نمونے بطور تحفہ دے دیتا۔ اسے دعویٰ تھا کہ آپ غالب کا کوئی مصرع، پہلا یا دوسرا، اس کے سامنے پڑھیں تو وہ دوسرا مصرع سنائے گا۔ کئی مرتبہ اس کے اس دعویٰ کا امتحان لیا گیا اور ہر مرتبہ وہ اس امتحان میں کامیاب رہا۔ دہلی میں وہ دو مزاروں پہ اکثر بیٹھا رہتا۔ ایک غالب اور دوسرے سرمد شہید کا مزار جو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے سامنے ہے۔ ان کے علاوہ، وہ کہیں حاضری نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سرمد کی طرح فرقۂ ملامیہ کا فقیر سمجھتا تھا اور اس کے لئے جو طرزِ زندگی اس نے اختیار کر رکھا تھا وہ ایک روایت پرست معاشرہ کے علمبرداروں کو ہرگز پسند نہ تھا۔ اُسے طرح طرح کے نام دیئے گئے۔ چنانچہ اس نے اپنے اُوپر لعنت بھیجنے والوں کی سہولت کے لئے اپنے اوپر ننانوے ملامتوں کو اللہ کے ننانوے ناموں کی طرح نہایت عمدہ خطاطی میں رقم کیا اور ایک کتابچے کی شکل میں چھپوا کر محفوظ کر دیا۔ یہ خطاطی حُسن و خوبی میں بے حد خوبصورت ہے شاید اس لئے بھی کہ ہر ملامت کو صوری حُسن دے کر وہ اپنے تئیں سرمد شہید کے اور قریب سمجھنے لگا۔ ایسی خوبصورت خطاطی اس کے یہاں کم ہی ملتی ہے جو ملامتوں کی صورت میں اُس نے اپنے عہد کو عطا کی ہے اور یوں اپنے عہد کی گواہی بھی دی ہے۔ صادقین کی یہ خطاطی یقیناً فن کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی خطاطی اس نے بہت کم کی ورنہ زیادہ تر خطاطی آہستہ آہستہ ایک فارمولا بن گئی تھی، فن اس میں کوئی خاص نہ رہا تھا۔ ایک عادت سی بن گئی تھی، اس کی دوسری بعض عادتوں کی طرح۔

میں نے ابھی صادقین کے فن گفتگو کا اوپر ذکر کیا تھا کہ اس کی گفتگو ادبی نثر کا مقام رکھتی تھی۔ یاد آیا کہ پچھلے دو برس سے اس نے اپنی سوانح اپنے ہی قلم سے خطِ شکستہ میں لکھنا شروع کی تھی اور وہ تین چوتھائی کے قریب مکمل بھی ہو چکی تھی۔ اپنی سوانح کے پہلے صفحہ کے نیچے "بقلم خود" کی بجائے "بہ کلکِ خود" کے الفاظ لکھے۔ یہ تحریر اس دور میں لکھی جانے والی تحریروں میں حُسن و فن میں یکتا ہے۔ اس میں اردو کے کلاسیکی ادب کی چاشنی بھی ہے اور صادقین کے حُسن بیان کا ایک عظیم شاہکار بھی ہے۔ پھر اسے رقم جس عمدگی سے کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ خطِ شکستہ بے پایاں حُسن کا ایک نادر نمونہ ہے۔ حُسن و بیاں کی خوبی کے علاوہ اس خود نوشت میں صادقین کے فنّی سفر کا شعور حاصل ہوتا ہے اور ابھی تک جو چند اقتباسات اس میں سے شائع ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کون کون سے اثرات تھے جن کے تحت اسے جمالیات کا ادراک حاصل ہوا اور اس کی حیات کو حُسن کی باریکیوں کی آگاہی ہوئی۔ بلاشبہ وہ حُسنِ کائنات کی اتھاہ گہرائیوں کا شعور رکھتا تھا اور اُس کی نظر سے کوئی ایسی شے اور جاندار مخفی نہ رہتے تھے جن کے حُسن کو وہ نہ پہچان سکتا ہو۔ یقیناً ایسی نظر عمر بھر کی ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور صادقین جب تک جیا، ریاضت کے عمل میں دن رات جُٹا رہا۔ اُسے سستانے یا آرام کرنے کا بھی ہوش نہ رہا بلکہ وہ آرام کے لفظ ہی سے چڑ جاتا تھا بلکہ اسی طرح جیسے گردشِ جام کے دوران اُسے کوئی کھانے کے لئے کہہ دے۔ کھانا اور آرام، دونوں اس کی ڈکشنری میں متروک الفاظ تھے وہ کہا کرتا کہ رازقِ کائنات نے میرے مقدر میں صرف رزقِ سیّال لکھا ہے۔ اور ریاضت کا یہ عالم تھا کہ لکھتے لکھتے اور کام کرتے کرتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اپنی اس کیفیت کو ایک رباعی میں خود ہی بیان کیا ہے۔ ؎

فن کی چل رہی ہے ریڑھی یارب
سطریں لکھتا ہوں ٹیڑھی میڑھی یارب
قرآن کی آیات کو لکھتے لکھتے
اب انگلیاں ہو چکی ہیں ٹیڑھی یارب

لقمہ اٹھاتا تو ہاتھ کانپ رہا ہوتا تھا مگر جب لکیر کھینچتا تھا تو اس میں بلا کی استقامت اور قوت ہوتی۔ مجال ہے ذرا سی لغزش بھی کہیں آنے پائے۔ یہ مقام جذب وعشق کے بغیر حاصل نہیں ہو پاتا۔ صادقین نے اس کے لئے اپنی زندگی دی۔ سالہا سال سے کھانا موقوف کر رکھا تھا۔ دن رات تکیئے پر بیٹھے ہر وقت قلم اور برش کے ساتھ محو رہنا۔ آخر کب تک ؟ انگلیاں تو ٹیڑھی ہو ہی گئی تھیں اب ٹانگیں بھی سوکھ کے لکڑی ہو گئیں۔ اور جگر تیزابیت سے جل جل کے چھلنی ہو گیا۔ روح میں توانائی بدستور تھی مگر جسم اب ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ قضا نے جب اپنا جال پھینکا تو روح جسم کو اس میں چھوڑ کے یوں نکل گئی جیسے پانی جال میں سے مچھلی کو چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔

اور میں یہ بتلانا تو بھول ہی گیا کہ جس روز صادقین دلّی چھوڑ کر واپس آنے کے لئے اپنے جنگپورہ کے فلیٹ سے نکلا تو اسے الوداع کہنے کے لئے اہل محلّہ نے اپنے کاروبار سے چھٹی کی اور اُسے ہاروں سے بھر دیا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ صادقین جس جگہ بھی قیام کرتا، وہاں ایک اپنی ہی دنیا پیدا کر لیتا۔ لوگ اس کی جانب خود خود چلے آتے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ جہاں ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے وہاں بھی ایک حلقہ اپنے غم خواروں کا ضرور تخلیق کر لیا ہو گا۔

صفحہ ۱۱۷ کا باقی

تم ماہ ہو، ہالے میں بھی آجایا کرو
اُوشا کے اُجالے میں بھی آجایا کرو
جب باغ میں آتی ہو تو اس ٹیلے پر
سادھو کے شوالے میں بھی آجایا کرو

جھاڑو سے وہ صاف کر کے آنگن آئی
رکھ کے روٹی، پکا کے سالن آئی
گھر کا سب کام کاج پورا کر کے
سادھو کے شوالے میں سہاگن آئی

نمائش دیکھنے کے بعد میں نے صادقین سے کہا کہ تصویروں کے ساتھ آپ نے رباعیاں بھی بہت سی کہہ ڈالی ہیں۔ کہنے لگے۔ "یہ پوری رباعیاں تو نہیں ہیں جو میں نے اس دوران میں کہیں۔ ایک سو ستر کہی ہیں۔ یہاں چند ہی آویزاں ہیں۔ کیونکہ تختیاں ختم ہو گئی تھیں!!!"

مجتبیٰ حسین

صادقین میری نظر میں

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میں نے اپنے ایک نجی معاملہ کے سلسلہ میں ایک فیصلہ کیا۔ صادقین کو اس فیصلہ کا علم ہوا تو اظہارِ مسرت کرتے ہوئے بولے۔ "بھئی بہت اچھا فیصلہ کیا۔ میں اب پاکستان میں آپ کی طرف سے بے فکر اور مطمئن رہوں گا"۔ میں نے سوچا صادقین رسماً یہ جملے کہہ رہے ہیں ورنہ انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ میں ایک شخصی فیصلہ کر دوں اور وہ پاکستان میں اس فیصلہ کی بنا پر مطمئن اور بے فکر رہیں۔

کچھ دیر بعد صادقین نے پھر کہا۔ "بھئی آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ میں بہت خوش ہوں۔ میں پاکستان میں سچ مچ آپ کی طرف سے مطمئن رہوں گا"۔ میں تب بھی خاموش رہا۔ لیکن اس دن مختلف اوقات میں، مختلف موضوعات کے بیچ اور مختلف واسطوں میں صادقین نے بار بار یہی جملہ کہا تو احساس ہوا کہ صادقین رسم نہیں نبھا رہے ہیں بلکہ اس تعلق خاطر کا اظہار کر رہے ہیں جو مجھے ان سے اور انہیں مجھ سے بے خبری تو سہی گزر بڑا ان چودہ مہینوں کی نظر آئی جو صادقین کی صحبت میں گزرے۔ چودہ مہینوں کا ملاپ ہو یا چودہ برس کا بن باس یا معاملہ چودہ صدیوں کا ہو ان کا انسان پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ اگرچہ صادقین نے صرف چودہ مہینے یہاں گزارے لیکن ان چودہ مہینوں کے ذریعے جتنا وہ ماضی میں پھیلے ہیں اتنا ہی مستقبل میں جڑ گئے ہیں۔

چودہ مہینوں کے قیام کے بعد اب وہ اڑان بھرنے کے لئے پر تول رہے ہیں تو مجھے پچھلے سال کی سردیوں کی وہ شام یاد آ رہی ہے۔ جب غالب اکیڈیمی میں ذہین نقوی صاحب نے میرا تعارف صادقین سے کرایا اور میں نے دوسرے دن ان سے ملنے کے لئے وقت مانگا تو اس بندۂ غالب نے اپنے پرستاروں کے ہجوم میں کھونے سے پہلے کہا۔ "کل شام ٹھیک چھ بجے مزارِ غالب پر آ جائیے"۔ میں سوچتا رہا بھلا مزارِ غالب بھی کوئی ملاقات کی جگہ ہے۔ چونکہ انہوں نے عجلت میں مقامِ ملاقات کا تعین کیا تھا اس لئے میں بعد میں اس شش و پنج میں مبتلا رہا کہ بندۂ غالب نے غالب کے مزار پر ملنے کو کہا ہے یا غالب کے مزار میں۔ تاہم وقتِ ملاقات تو طے ہو چکا تھا اس لئے دوسرے دن مزارِ غالب پر پہنچا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بندۂ غالب، غالب کے مزار کے اندر نہیں بلکہ غالب کے مزار پر موجود تھا اور اتفاق سے بندۂ غالب اس وقت مونگ پھلی بھی کھا رہا تھا۔

مزارِ غالب والی ملاقات کے بعد پچھلے چودہ مہینوں میں صادقین سے میری نہ جانے کتنی ہی ملاقاتیں ہو چکی ہیں ان کا حساب کتاب نہ میں نے رکھا اور نہ صادقین نے۔ یوں بھی محبت کا حساب کتاب بنئے کا کھاتا تو ہوتا نہیں۔ جب صادقین نے مزارِ غالب اور غالب دونوں پہ ترس کھا کر جنگ پورہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ دو چٹائیاں، ایک عدد چارپائی دو عدد بالٹیاں (ایک بالٹی نہانے کے لئے اور ایک بالٹی کوڑا ڈالنے کیلئے) اور کچھ برتن خرید کر جنگ پورہ میں "ٹھاٹ باٹ" کی زندگی گزارنے لگے تو یوں لگا جیسے وہ دہلی کے معمولات کا حصہ بن گئے ہیں۔ معاف کیجئے میں بھول گیا۔ صادقین نے ایک لوٹا بھی خریدا تھا۔ ساز و سامان جب اتنا کم ہو تو اس میں سے کسی شے کو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجھے یہ اعتراف بھی کر لینے دیجئے کہ اگر صادقین دہلی نہ آتے تو میں جنگ پورہ سے اور جنگ پورہ مجھ سے اتنا واقف نہ ہوتا۔ یہ انہی کی ذاتِ بابرکات کا فیض ہے کہ اس محلہ میں میری آمد و رفت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جنگ پورہ کے دو چار پنواڑی پورے اعتماد کے ساتھ وقت بے وقت

مجھے سگریٹ کش اور صاف دیتے ہیں۔ اور مجھ پر شک نہیں کرتے۔ یہ بھی صادقین کا ہی فیض ہے کہ برسوں بعد مجھے چٹائی پر متواتر بیٹھنے کا موقع ملا ورنہ چٹائی پر بیٹھنے کی پریکٹس کب کی چھوٹ چکی تھی۔ میں تو خیر کس شمار میں ہوں۔ میں نے بڑی بڑی نامور ہستیوں کو جو بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھا کرتی ہیں اور شاید نیند میں بھی کرسیوں سے نہیں اترتے، صادقین کے آگے چٹائی پر زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے دیکھا ہے۔ یوں بھی کرسی پر زانوئے ادب تہہ کیا ہی نہیں ہوتا۔ چٹائی کے استعمال کو دہلی میں دوبارہ رائج کرنے میں صادقین کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور رہ جاتے تو فرنیچر بنانے والوں کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ صادقین کے جنگ پورہ والے گھر 19-G کو میں صادقین کا گھر نہیں صادقین کا تکیہ کہا کرتا تھا۔ اس گھر میں صادقین کے سوا کوئی اور قیمتی چیز نہیں تھی بھلا چٹائیاں اور بالٹیاں بھی کہیں قیمتی ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ صادقین کے بیٹھنے کی وجہ سے چٹائیوں کی قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔

اس گھر کا نقشہ یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ صادقین نے اتنے کم ساز و سامان کے ساتھ آخر ایک سال سے زیادہ کی مدت اس گھر میں کیسے گزار لی۔ پھر دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ صادقین کے قیام دہلی کا زیادہ حصہ اس گھر میں گزرا وہ گھر سے باہر کم ہی نکلتے۔ بہت نکلے تو ملا کی دوڑ کی طرح غالب اکیڈمی یا ایوان غالب تک گئے۔ وہ گھنٹوں گھر کی چار دیواری میں منہ اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ اس گھر کے در و دیوار کا بھی کچھ حال بیان ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جب یہ پہلے پہل اس گھر میں آئے تھے تو در و دیوار سچ مچ در و دیوار لگتے تھے۔ بعد میں یہ در و دیوار صفحۂ قرطاس میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ ان دیواروں پر ابتدا میں کچھ ضروری دوستوں کے غیر ضروری پتے لکھے گئے۔ پھر ٹیلیفون نمبروں کی خطاطی کی باری آئی۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ بعض ناپسندیدہ عناصر جن سے میں اپنا ٹیلی فون نمبر پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ انہیں میرا نمبر صادقین کے گھر کی دیوار ہی سے ملا۔ یہ ایک اور بات ہے کہ بعض پسندیدہ عناصر کے پتے جن کی مجھے عرصے سے تلاش تھی۔ صادقین کے گھر کی دیوار ہی سے ملے۔ غیر ضروری پتوں اور ضروری ٹیلی فون نمبروں کی خطاطی سے فرصت ملی تو اکثر یوں ہوتا کہ صادقین کام میں مصروف ہیں اور کسی دوست نے کسی خاص تاریخ کو اپنے ہاں بلایا تو صادقین نے وہیں برش سے دیوار پر بطور یادداشت لکھ دیا کہ فلاں تاریخ کو فلاں کے پاس جانا ہے۔ پھر یادداشتوں سے متعلق تحریروں کے بعد کتابوں کے سرورق کی باری آئی۔ اکثر ادیب و شاعر اپنی کتابوں کے نام اپنے ناموں سمیت اور کتابوں کے نفس مضمون کا خلاصہ رکھ جاتے تھے کہ بعد میں صادقین اس نوشتۂ دیوار کی مدد سے ان کا سرورق بنا سکیں۔ ایک صاحب نے تو اپنی کتاب کا قد آدم سرورق بقلم خود سالم دیوار پر بنا دیا تھا۔ سرورق پر یاد آیا کہ صادقین نے ہندوستان میں اتنی کتابوں کے سرورق بنائے ہیں کہ ان کے چلے جانے کے دس پندرہ برس تک یہ سرورق وقفہ وقفہ سے چھپتے رہیں گے دس پندرہ برس کی بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پرسوں ایک صاحب بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے مجموعہ کلام کا سرورق صادقین سے بنوا رہے تھے۔ صادقین کسی کام سے اندر گئے تو میں نے ان شاعر صاحب سے پوچھا۔ "آپ تو بڑی عجلت میں صادقین سے اپنے مجموعہ کلام کا سرورق بنوا رہے ہیں مجموعہ کلام کب تک چھپوائیں گے؟"

بولے۔ "صاحب! فی الحال تو میرے پاس ایک تخلص ہے اور اس مجموعہ کلام کا نام ہے۔ شاعری تو سرورق بننے کے بعد شروع کروں گا۔ صادقین اب ہندوستان سے جائیں گے تو نہ جانے کب آئیں گے اس لئے حفظِ ما تقدم کے طور پر اپنے مجموعہ کلام جس میں اس وقت تک نہ کلام ہے نہ مجموعہ، سرورق بنوا رہا ہوں۔ کل کلاں کو واقعی شعر کہنے لگ جاؤں تو صادقین صاحب کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ پاکستان کا ویزا بھی تو آسانی سے نہیں ملتا۔ یوں بھی اچھا شعر اور بُرا وقت پوچھ کر نہیں آتا۔"

ہاں تو میں صادقین کے گھر کے در و دیوار کا ذکر رہا تھا اور بات سرورق تک پہنچ گئی ؎

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

صادقین کے اسسٹنٹ میاں انور نے جب دیکھا کہ گھر کے ہر کمرے کی دیوار پر صادقین کے بنائے ہوئے نقش ابھرتے جا رہے ہیں تو انہوں نے بھی حسب استطاعت باورچی خانہ کی دیواروں پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ سارے گھر میں ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں صادقین کا گزر نہیں ہوتا

تھا۔ مگر آفرین ہے میاں انور پر کہ انہوں نے باورچی خانہ کی مناسبت سے اس کی در و دیوار پر ایسی "لذیذ" اور "چٹپٹی" دو تین درجن تصویریں بنا دیں اور انہی کی مناسبت سے ایسی رباعیاں لکھ دیں کہ انہیں دیکھ کر ہر قسم کی بھوک میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ [illegible] ان کے لئے ٹیلیفون ڈائریکٹری بھی تھے اور کلینڈر بھی۔ میں جب بھی ان کے ہاں جاتا تو ان کے دیوار [illegible] دلوا دیے ہیں۔

ہندوستان میں چودہ مہینے کے قیام میں صادقین کو میں نے جب بھی دیکھا کام میں جٹا ہوا دیکھا [illegible] میں لوگوں کے لئے آیات قرآنی کی خطاطی کرتے دیکھا ہے۔ جنگ پورہ میں انہوں نے آرٹ کی گنگا بہا دی تھی [illegible] تھا۔ صادقین کو میں نے اتنی بار اور اتنے لمبے عرصہ تک خطاطی کرتے دیکھا ہے کہ اب خود میرا اپنا ہینڈ رائٹنگ بھی بدل گیا ہے۔ صادقین [illegible] میرے ہینڈ رائٹنگ پر اثر انداز ہونا ضروری بھی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صادقین سے ملنے سے پہلے لوگ میرا ہینڈ رائٹنگ پڑھ لیتے تھے [illegible] پڑھ سکتے۔ آرٹ اس کو کہتے ہیں۔

آرٹ کی دنیا میں گم ہونے کی بات تو میں نے سن رکھی تھی مگر کسی کو سچ مچ آرٹ کی دنیا میں گم ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ صادقین کو دیکھ کر یہ حسرت بھی پوری ہو گئی۔ چودہ مہینے پہلے وہ آئے تھے تو کچھ دن اپنے فن کی نمائش میں مصروف رہے وہاں سے فارغ ہوئے تو علی گڑھ یونیورسٹی [illegible] میں ایک میورل بنانے میں مصروف ہو گئے۔ وہاں سے فرصت ملی تو جناب عابد علی خان، ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے [illegible] قیام حیدرآباد کے دنوں میں، میں بھی حیدرآباد میں تھا۔ حیدرآباد میں انہوں نے وہ [illegible] وہاں کے "اردو گھر" کے لئے [illegible] بنا رہے تھے تو سینکڑوں افراد انہیں کام کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ بعد میں اردو گھر میں جب ان کی خطاطیوں کی نمائش ہوئی تو اس کا حال بیان کرنے کی نہ مجھ میں تاب ہے اور نہ مجال۔ بلا مبالغہ روزانہ دس ہزار سے زائد افراد اس کی نمائش کو دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ پہلے [illegible] عارضی دکانیں کھل گئی تھیں۔ عارضی سائیکل اسٹینڈ چالو ہو گئے۔ آئس کریم والوں اور میوہ فروشوں کے ٹھیلے آ گئے تھے۔ جیب کترے بھلا اس موقع پر کیوں خاموش رہتے۔ انہوں نے بھی اپنا کاروبار چمکایا۔

صادقین سے آٹوگراف مانگنے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ صادقین کو ایک بند کمرہ میں بٹھایا جاتا تھا اور لوگ قطار [illegible] صادقین سے فرمائش کر کے اپنی پسندیدہ آیات لکھوایا کرتے تھے۔ خوب یاد آیا کہ نمائش کے پہلے دن ایک عورت صادقین سے کوئی آیت لکھوا کر لے گئی۔ دوسرے دن وہ سویرے ہی پھر نمائش میں آئی اور لوگوں کے سامنے اعلان کیا اس کا بھائی عرصے سے بیمار تھا مگر کل جب اس نے صادقین کے ہاتھ سے لکھی ہوئی آیت بیمار کے تکیے کے نیچے رکھی تو شام تک صحت یاب ہو گیا۔ اس اعلان کے بعد جو ہونا تھا، اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ اب صادقین، صادقین نہیں رہ گئے تھے بلکہ "پیر و مرشد" بن گئے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کے سروں پر ان کا ہاتھ رکھواتیں اور لوگ عقیدت سے ان کے ہاتھ [illegible] چومتے تھے بلکہ آنکھوں سے بھی لگاتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ نمائش جلد ختم ہو گئی ورنہ حیدرآبادی ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو [illegible] ایک قصبہ کے باشندوں نے ایک بزرگ کے ساتھ کیا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک بزرگ اس قصبہ میں پہنچے تو اپنی روحانی طاقت اور کرامات کے ذریعے وہاں کے لوگوں کے مسئلے حل کر دیتے۔ سارے قصبہ میں ان کی کرامات کی دھوم مچ گئی۔ خاصے قیام کے بعد جب ان بزرگ نے قصبہ سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو [illegible] نے ان سے دست بستہ عرض کی۔ "پیر و مرشد! اب تو ہم آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے، آپ یہیں رہیں گے، ہم آپ کو مار کر یہیں دفنا دیں گے اور آپ کی عالیشان درگاہ بنائیں گے۔ سال کے سال دھوم سے آپ کا عرس مبارک کریں گے۔ یوں بھی ہمارے پاس کوئی درگاہ نہیں ہے، ہمیں نذر و نیاز چڑھانے کے لئے بہت دور جانا پڑتا ہے۔"

غرض ایک مہینہ کے قیام کے دوران صادقین نے حیدرآبادیوں کے دل جیت لئے۔ حیدرآباد میں اتنے لمبے قیام کے باوجود انہوں نے حیدرآباد کے ایسے کئی تاریخی مقامات نہیں دیکھے جنہیں دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ لوگ صادقین کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آنے لگے تھے۔ وہ سارا دن نظام کلب کے کمرہ میں بند ہو کر لوگوں کی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں ہی انہوں نے [illegible] فزیکل ریسرچ

لیبارٹری کے لئے ایک عالیشان میورل تیار کیا۔

حیدر آباد سے واپس آئے تو بنارس ہندو یونیورسٹی میں میورل بنانے چلے گئے۔ بنارس سے واپس آکر اطمینان کی دو چار سانسیں بھی نہیں لی تھیں کہ دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے لئے "اسمائے حسنیٰ" کی خطاطی میں مصروف ہو گئے۔ صادقین کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں انہوں نے دو مہینوں کی شبانہ روز محنت کے بعد ۹۹ کینوس تیار کئے۔ اس کام کو دیکھ کر انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ ہمدرد والوں کو اب ایسی دوا بھی تیار کرنا پڑے گی کہ اس کام کو دیکھ کر جب انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں تو انہیں دوا کی مدد سے بند کیا جا سکے۔ جب یہ کام چل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ صادقین کئی کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ انہیں داڑھی بنانے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا لوگوں کی آمد و رفت سے بے نیاز وہ اپنے کام میں کھوئے رہتے تھے۔ جب تک دن میں دو کینوس نہیں بنا لیتے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ چاہے رات کا پچھلا پہر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یوں بھی میں نے صادقین کو کھانا کھاتے ہوئے بہت کم دیکھا ہے۔ چودہ مہینوں میں بمشکل تمام دس بارہ ایسے مبارک و مسعود مواقع آئے ہیں جب میں نے انہیں کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کھانا کھانے کے لئے میرے چلے جانے کا انتظار کرتے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب تاہم قیاس اغلب ہے کہ وہ کھانا تو کھاتے ہی ہوں گے۔ آرٹسٹ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اسے ایک نہ ایک دن کھانا تو کھانا ہی پڑتا ہے۔

یہ بات صادقین کے کہنے کی نہیں مگر ہمارے کہنے کی تو ہے کہ صادقین نے ہندوستان میں جہاں کہیں اور جو کچھ بھی کام کیا ہے وہ فی سبیل اللہ کیا ہے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صادقین نے کسی کام کا کوئی معاوضہ لیا ہو۔ صادقین نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ مگر انہوں نے ہمیں سب کچھ کیوں دیا۔ اس کا جواب نہ صادقین کے پاس ہے نہ ہمارے پاس۔ دین آرٹسٹ کی عادت ہوتی ہے اور لین مداحوں کی مجبوری۔ صادقین کے گھر سے میں نے کسی کو خالی ہاتھ جاتے نہیں دیکھا۔ جب بھی وہ صادقین سے مل کر واپس جاتا تو اس کے ہاتھ میں یا تو صادقین کے مصافحے کی گرمی ہوتی یا صادقین کے آرٹ کا کوئی نمونہ۔ دل میں صادقین کی دی ہوئی محبت کا گداز ہوتا،

آنکھوں میں صادقین کے فن پاروں کی چمک ہوتی یا کانوں میں صادقین کی رباعیوں کی گونج ہوتی۔ کبھی کبھی میں سوچا کرتا کہ اگر صادقین کے گھر سے جاتا تو دنیا سے یوں خالی ہاتھ نہ جاتا جس کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

صادقین اگرچہ دہلی میں اتنے طویل عرصے تک رہے لیکن تب بھی یوں رہے جیسے دنیا میں ہوں۔ دنیا کے طلب گار نہیں ہوں۔ اگرچہ وہ دہلی کے معمولات کا حصہ بن گئے تھے۔ لیکن دہلی ان کے معمولات کا حصہ نہیں بن سکی۔ جو شخص اپنے گھر میں بند اور آرٹ میں گم رہتا ہو اسے شہر سے کیا مطلب۔

پچھلے ہفتے ایک شام میں ان کے ہاں پہنچا تو پہلی بار صادقین کو مصروفیت کے بغیر پایا۔ یوں بھی وہ اسلامک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کے بڑے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ میرے پہنچتے ہی کہنے لگے۔ "بھئی! بہت اچھے وقت آئے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" پھر میاں انور کو بلا کر کہا۔

"بھئی ایک آٹو رکشا لے آنا۔"

آٹو رکشا آگئی تو میں نے پوچھا۔ "کہاں کا خیال ہے؟"

بولے۔ "میں نے کہیں جانے کے لئے آٹو رکشا نہیں منگائی ہے۔ یوں سمجھئے کہ آٹو رکشا میں بیٹھنے کے لئے آٹو رکشا منگوائی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم منزل کا تعین کر کے ہی رکشا میں بیٹھیں۔ بس چلئے یونہی ذرا ہوا کھاتے ہیں۔ دہلی میں رہتے ہوئے اتنے دن ہو گئے مگر دہلی کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح اور لوگ دیکھتے ہیں۔ کناٹ پلیس کو بھی اس وقت دیکھا ہے جب مجھے حیدر آباد، علی گڑھ، امروہہ یا بنارس جانے کے لئے نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر جانا پڑا ہے۔"

آٹو رکشا والے کو کہا۔ "میاں تم ہمیں جہاں لے جانا چاہو لے چلو۔ ہماری نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہماری کوئی منزل نہیں ہے ہم بڑی دیر تک دہلی "ART FOR ART SAKE" انداز میں سیر کرتے رہے۔ جب آٹو رکشا میں گھوم گھام کر تھک گئے تو مقبرے کے پاس

پہنچے تو میں نے کہا۔ "صادقین صاحب ہم نے سفر برائے سفر بہت کرلیا ہے۔ اب بتایئے کہاں چلیں گے؟"

کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "میرا خیال ہے اب مجھے پاکستان واپس جانا چاہیئے۔"

سو اب صادقین بالآخر پاکستان واپس جا رہے ہیں۔ میں ان سے یوں نہیں پوچھوں گا کہ وہ ہندوستان پھر کب آئیں گے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کسی خاموش شام کو پاکستان کی کسی شاہراہ پر "سفر برائے سفر" کرتے ہوئے ایک دن پھر ان کے سامنے یہی سوال اُٹھے گا کہ "اب کہاں جانا ہے؟" اور اس کے جواب میں وہ شاید کہہ اُٹھیں۔ "اب ہمیں ہندوستان جانا چاہیئے۔" آرٹ کا سفر اسی طرح ہوتا ہے۔ محبت کی منزلیں ملکوں کی سرحدوں کو اسی طرح عبور کرتی ہیں۔ جذبے اسی طرح اپنا راستہ بناتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ اور انہیں پھر ہندوستان آئیں تب تک ہم ان کی راہوں میں یادوں کے چراغ جلائے رکھیں گے۔

چودہ مہینوں کے قصہ کو میں مجبوراً یہیں ختم کرتا ہوں کیونکہ یہ قصہ چودہ مہینوں کا نہیں ہے۔ یہ چودہ جنموں کا بھی ہو سکتا ہے اور چودہ صدیوں کا بھی ؎

سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

میں صادقین کو نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع کہتا ہوں۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

صادقین کا نام بہت دیکھا تھا اور ان کے کام کے بارے میں سنا بھی بہت تھا مگر یہ خدشہ کبھی دل میں نہ آیا کہ ایک دن انہیں دیکھنے اور ان سے رو بہ رو بات کرنے کی نوبت آجائے گی۔ جب دہلی میں بین الاقوامی تجارتی میلہ شروع ہوا تو ایک دن یہ اطلاع ملی کہ اس تجارتی میلے میں پاکستان کا ایک پویلین بھی ہے اور اس پویلین میں خود صادقین بہ نفس نفیس اپنی تصویروں کے ساتھ موجود ہیں۔ صادقین سے ملنے کے ارادے سے نہیں بلکہ ان کی تصویروں کی نمائش دیکھنے کی غرض سے جب میں پاکستان پویلین پر پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ صادقین کی تصویروں کی نمائش کو دیکھنے کے خواہشمندوں کا کیو ایک میل لمبا ہے۔

پھر ایک دن ذہین نقوی ڈائریکٹر غالب اکیڈیمی نے مجھ سے کہا "غالب اکیڈیمی میں صادقین کی خطاطی کے نمونوں اور غالب سے متعلق ان کی تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے آپ ضرور آئیں۔"

صادقین سے میری پہلی ملاقات اسی تقریب میں ہوئی۔ نمائش کے افتتاح کے بعد وہ ایم ایف حسین کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایم ایف حسین نے صادقین سے میرا تعارف کرایا تو بولے "آپ کے بارے میں ذہین نے بتایا تھا۔ میں ہندوستان میں ابھی کئی دن رہوں گا۔ آپ سے ملاقات ہونی چاہیئے۔"

میں نے پوچھا "ملاقات کب اور کہاں ہوگی"؟ بولے "کل شام غالب کے مزار پر ٹھیک ۶ بجے"

پھر ان کے مداحوں نے انہیں گھیر لیا میں تھوڑی دیر کے لئے حیران رہ گیا کہ بھلا غالب کا مزار بھی ملاقات کا کوئی مقام ہے۔ میں ملاقات کے مقام کی دوبارہ توثیق کرنا چاہتا تھا لیکن بعد میں وہ خواتین کو آٹوگراف دینے میں اتنے مصروف تھے کہ اس حسین مصروفیت میں دخل انداز ہونے کی ہمت نہیں پڑی۔ مانا کہ صادقین، غالب کے طرفدار ہیں۔ سخن فہم بھی شاید ہوں گے۔ اپنے نام کے ساتھ "بندۂ غالب" لکھتے ہیں لیکن طرفداری کا مطلب یہ تو نہیں کہ غالب کے مزار کو دیوان خانے میں تبدیل کردیں۔

انہوں نے غالب کے مزار کا حوالہ کچھ اس روانی کے ساتھ دیا تھا کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انہوں نے غالب کے مزار پر ملنے کے لئے کہا ہے یا غالب کے مزار کے اندر۔ دوسرے دن میں نے سوچا آرٹسٹوں کا کیا بھروسہ وہ ملاقات کا وقت اور مقام طے کرکے اکثر بھول جاتے ہیں۔ پھر بھی سوچا کہ جب صادقین نے کہا ہے تو غالب کے مزار پر ۶ بجے پہنچ جاتے ہیں۔ اگر وہ نہ ملیں تو غالب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جائے گی میں ٹھیک ۶ بجے پہنچا تو صادقین پہلے ہی غالب کے مزار پر موجود تھے اور ان کی انگشت شہادت خلا میں کچھ تحریر کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی خلا کو پینٹ کرنے کے

سلیپر کو روکا اور بولے "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"۔

میں نے کہا "صادقین صاحب! یہ غالب کے مزار کو مقام ملاقات بنانے کی بھی خوب رہی"۔

ہنس کر بولے۔ "اصل میں آج غالب سے میرا وقت طے تھا اس میں آپ کو بھی شامل کر لیا"۔

میں نے کہا "غالب سے اگر ملاقات ہو چکی ہو تو اب یہاں سے چلئے کہیں اور بیٹھتے ہیں"۔ وہ اٹھے تو میں نے سوچا صادقین جیسے عالمی شہرت یافتہ آرٹسٹ کے ساتھ بیٹھنے کے لئے کون سی جگہ موزوں ہوگی۔ وہ آرٹسٹ جس نے دنیا گھوم، ہر گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو۔ اسے کسی اچھی جگہ بٹھانا چاہیئے"۔

میں نے کہا "چلئے۔ کناٹ پیلس کے کسی بڑھیا ریستوران میں چل کر بیٹھتے ہیں"۔

بولے "نہیں۔ ابھی نظام الدین کے ایک ریستوران میں بیٹھتے ہیں اور مونگ پھلی کھاتے ہیں۔ ریستوران چاہے جیسا بھی ہو اسکی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مالک امروہہ کے ایک صاحب ہیں"۔

غالب کے بعد انہوں نے اپنی دوسری کمزوری امروہہ کا ذکر مجھ سے کر دیا تھا۔ ۲۲ برس بعد وہ ہندوستان آئے یا یوں کہئے کہ ۳۳ برس وہ امروہہ سے دور رہے اِن برسوں میں دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا بچ رہا ہو جہاں یہ نہ گئے ہوں لیکن یہ ہر جگہ امروہہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے ان کی کتاب "رقعاتِ صادقین" پڑھی ہے جس میں وہ اپنے بھائی کے نام لندن، پیرس، واشنگٹن، نیویارک، ماسکو اور نہ جانے کن کن شہروں سے خط لکھتے ہیں تو ان بڑے شہروں کے بیچ اپنے امروہہ کو پھیلا دیتے ہیں۔ ان ۳۳ برسوں میں امروہہ جتنا ان کے اندر آباد رہ کر پھلتا پھولتا رہا ہے۔ اتنا شاید وہ ہندوستان میں بھی نہیں پھلا پھولا۔ پیرس میں انہیں امروہہ کے آم یاد آئے۔ لندن میں انہیں امروہہ کی مچھلی نے تڑپایا۔ نیویارک میں امروہہ کی اڑد کی دال کا ذائقہ یاد آیا۔ دنیا میں اتنا پھیلنے کے باوجود امروہہ سے ان کا اس قدر جڑے رہنا ان کی اور ان کے فن کی سچائی اور دیانت داری کی دلیل ہے۔

کلکتہ کے ذکر سے غالب کے سینے کا جو حال ہوتا تھا وہی حال امروہہ کے ذکر سے صادقین کے سینے کا ہوتا ہے وہ اکثر یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے انہیں مصوری سے دلچسپی رہی ہے جو خوشخط لکھنا بھی ان کا شوق رہا ہے۔ ایک دن کہنے لگے "میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا ان دنوں اسکول سے چھٹی لینے کے لئے درخواست پر طالب علم کے سرپرست کے دستخط ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ایک دن میں یونہی اسکول سے غائب ہو گیا گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ دوسرے دن میں نے درخواست پر اپنے والد صاحب کے جعلی دستخط کئے اور درخواست اسکول ماسٹر کے حوالے کی تو استاد نے میری پٹائی شروع کر دی۔ استاد نے کہا "تم نے اپنے والد کے جو دستخط کئے ہیں وہ اتنے خوشخط ہیں کہ یہ تمہارے والد کے دستخط نہیں ہو سکتے خوشخطی میں جعلسازی تمہارے سوائے کوئی اور نہیں کر سکتا"۔

[illegible] کی خوشخطی کی پہلی سزا مجھے امروہہ میں ہی ملی تھی بعد میں تو کئی جگہ ملتی رہی البتہ زندگی میں پہلی [illegible] وہیں کی تھی۔

صادقین جب ۱۹۴۸ء میں امروہہ سے گئے ہیں تو وہ امروہہ کے ایک اسکول میں آرٹ ٹیچر تھے۔

صادقین کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت داغ کی طرح یہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ پاکستان وہ گئے تو تھے اپنے بڑے بھائی سے ملنے۔ مگر جب گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ فرانس کی وزارت کلچر نے انہیں (۵) مہینوں کی دعوت پر پیرس آنے کی دعوت دی تو سات برسوں تک پیرس کو اپنا ہیڈکوارٹر بنایا۔ یورپ کے سارے ملکوں کی سیر کی اور اپنی تصویروں کی نمائشیں کیں۔ پیرس جیسے آرٹ کے بین الاقوامی مرکز میں اپنے آپ کو منوانے اور خوشحالی اور مادی آسائشوں کی دہلیز پر پہنچنے کے بعد ایک دن اچانک اپنے والد صاحب کے ساتھ مختصر سے عرصہ کے لئے پاکستان میں قیام کے ارادے سے کراچی واپس گئے تو پھر پاکستان ہی کے ہو رہے۔ ایک بار کراچی سے لاہور اس ارادے کے ساتھ گئے کہ پندرہ دن لاہور میں قیام کریں گے۔ مگر لاہور میں دس برس کے لئے اٹک گئے "ابھی حال ہی میں یہ علیگڑھ گئے تھے۔ چار پانچ دنوں کے لئے پندرہ دن رک گئے۔ اب یہ حیدر آباد بھی جانے والے ہیں۔ دہلی وہ آئے

تھے ایک دو مہینوں کے قیام کے ارادے سے اب خیر سے ہندوستان میں ان کے قیام کی مدت چار مہینے ہونے لگی ہے دلّی والے خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ صادقین نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ہندوستان سے ضرور چلے جائیں گے۔ ہر جگہ سے اپنا رشتہ جوڑنے کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ ہر سرزمین کو اپنی سرزمین سمجھتے ہیں۔ ملکوں اور شہروں کے معاملے میں ان کا رویہ ایک سچے فن کار کا ہے۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

امروہہ نہ الوند کا باشندہ ہوں
دلّی نہ سمرقند کا باشندہ ہوں
ساری دنیا میرا وطن ہے یعنی
میں ارضِ خداوند کا باشندہ ہوں

صادقین ان فنکاروں میں سے ہیں جنہیں نہایت کم عمری میں آرٹ کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ پاکستان میں انہیں تمغۂ امتیاز اور بلا امتیاز نہ جانے کیا کیا مل چکا ہے آج سے بیس برس پہلے پیرس کی بی ناتیل نمائش کا بین الاقوامی اعزاز انہیں حاصل ہو چکا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی آرٹ گیلریوں میں ان کی تصویریں موجود ہیں لیکن ایک بات میں نے محسوس کی ہے کہ زندگی جوں جوں ان کے سر پر عظمتوں کے تاج رکھتی جا رہی ہے ان کا سر فخر سے اونچا ہونے کے بجائے جھکتا جا رہا ہے۔ صادقین کے لئے عظمتیں ایک بوجھ کا درجہ رکھتی ہیں۔ جوں جوں یہ بوجھ بڑھتا ہے وہ جھکے اور رہتی انکسار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے نام کے ساتھ حقیر، فقیر، پُرتقصیر اور خاطی و عاصی نہ جانے کیا کیا لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے لئے کچھ القاب بھی تجویز کر رکھے ہیں جیسے المجہول، الجاہل، المہمل، الخبیث، المریض، المحتاج، المحروم، الخاطی، المردود، المکروہ، المقروض، المحدود، المطعون، المجبور، المفلس وغیرہ وغیرہ۔ بھلا بتائیے کہ کوئی سرنگین ان کو پہنچنے کے بعد اب کوئی بھلا ان کے سامنے اپنے کمتر ہونے کا کس طرح اظہار کر سکتا ہے ہم جیسے لوگ ان کے سامنے اپنے عجز کو بیان کرنے کی کوشش کریں تو اس پٹھان کی یاد آتی ہے جسے زبان کے طور طریقے نہیں آتے تھے اور جس نے اپنی انکساری کے اظہار کے لئے کہا تھا "خو! ہم تو آپ کے سامنے گدھے کا بچہ سؤر کا بچہ ہے"۔

پچھلے دو مہینوں میں صادقین سے میری بیسیوں ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ میں نے انہیں ہر دم ایک درویش اور قلندر کے روپ میں پایا مال و متاع اور جاہ و حشمت سے بے نیاز اپنے فن کی دنیا میں گم۔ اپنے بل بوتے میں مگن دونوں ہاتھوں سے اپنے فن کی دولت لٹاتے ہوئے صادقین مجھے کبھی کبھی عجیب سے لگتے ہیں۔ یہ وہی صادقین ہیں جن سے جب ایک عرب شیخ نے اپنے ہوائی جہاز پر سفر سے متعلق آیات قرآنی کی خطاطی کرنے کی درخواست کی اور لاکھوں روپیوں کے معاوضے کی پیشکش کی تو انہوں نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میرا فن بکنے کے لئے نہیں ہے۔ مگر کوئی بھی شخص محبت کے ساتھ ان کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اس کے لئے کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے تصویر بنا کر دے دیتے ہیں اور یہ سب کچھ فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔

ابھی آٹھ دن پہلے کی بات ہے۔ رات ۱۱ بجے کا وقت تھا صادقین عالم سرخوشی میں اپنی رباعیاں سنا رہے تھے کہ ایک افغانی نوجوان ان کے پاس آیا اور بولا "صادقین صاحب! میں رات میں ۲ بجے امریکہ جا رہا ہوں اگر آپ میرے لئے "اللہ" لکھ دیں تو زندگی بھر اسے اپنے پاس محفوظ رکھوں گا"۔

صادقین نے اپنی رباعیاں فوراً روک دیں۔ کاغذ نکالا اور خطاطی میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس لال رنگ کا مارکر تھا۔ افغانی نوجوان نے کہا "صادقین صاحب! لال رنگ سے مجھے سخت نفرت ہے آپ کسی اور رنگ میں لکھ دیں"۔

اتفاق سے اس وقت ایک اور رنگ کا مارکر نکل آیا اور انہوں نے "اللہ" لکھ کر اسے دے دیا۔ جب وہ افغانی اپنا تحفہ لے کر چلا گیا تو مسکرا کر بولے "دنیا میں کتنی غلط کام غلط ہاتھوں سے ہوتے ہیں۔ بھلا سیاست دانوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ رنگوں کے مزاج کا تعین کریں اور انہیں علامت کے طور پر استعمال کریں۔ رنگوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق تو ہم مصوروں کو پہنچتا ہے"۔

صادقین کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کا حد درجہ احترام کرتے ہیں ایک بار مجھ سے کہا کہ میں خوشونت سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں میں نے خوشونت سنگھ سے ان کی اس خواہش کا ذکر کیا تو بولے میں خود ان سے ملنے کے لئے بے چین ہوں کل شام انہیں لے کر گھر آجاؤ"۔

دوسرے دن ہم خوشونت سنگھ کے گھر پہنچے تو صادقین بار بار خوشونت سنگھ سے کہنے لگے "میں تو مجتبیٰ حسین کا شکر گزار ہوں کہ آپ سے ملاقات

کرائی ؟" نہیں ! شکریہ تو مجھے مجتبیٰ کا ادا کرنا چاہیئے کہ آپ کو میرے گھر لے آئے۔ میں تو کئی دن اپنے احباب میں فخر سے کہتا پھروں گا کہ صادقین میرے گھر آئے تھے۔" اُدھر صادقین مصر تھے کہ میرا شکریہ ادا کریں گے اور اُدھر خوشونت سنگھ بضد کہ وہ میرا شکریہ ادا کریں گے وہ تو اچھا ہوا کہ ستیندر سنگھ مجھے وہاں سے اٹھا کر ایک گوشے میں لے گئے اور بولے "اب تم میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے دونوں کو تمہارا شکرگذار ہونے نہیں دیا ورنہ آج تم بچ نہیں سکتے تھے۔"

صادقین حیدرآباد، اور حیدرآبادیوں کے گرویدہ ہیں اگرچہ کبھی حیدرآباد نہیں گئے مگر حیدرآباد کے بارے میں جانتے خوب ہیں، ایک بار نظامِ حیدرآباد کا ذکر چل نکلا تو نظام کے ارکان خاندان کا ذکر یوں کرنے لگے جیسے یہ خود بڑے حیدرآبادی ہوں۔ حیدرآباد کے محلوں اور مقامات کے بارے میں بھی خوب جانتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے پوچھا "عثمان ساگر اور حسین ساگر کا کیا حال ہے ؟"

میں نے پوچھا "آپ ان تالابوں کو کس طرح جانتے ہیں۔"

بولے "جوش کی یادوں کی بارات میں یہ دونوں تالاب موجود ہیں۔"

ان کا حافظہ بہت تیز ہے ایک دن مخدوم محی الدین کا ذکر چل نکلا تو مخدوم کے "سُرخ سویرا" کی بیشتر نظمیں زبانی سنا دیں۔

صادقین کے ہاتھوں کو آپ غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ان کی سیدھے ہاتھ کی انگلیاں لگاتار کام کرنے کی وجہ سے ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ ایک دن میں نے کہا آپ کچھ دن اپنی انگلیوں کو آرام کیوں نہیں دیتے "؟

بولے "مائیکل اینجلو" کی گردن محض اس لئے ٹیڑھی ہو گئی تھی کہ وہ شبانہ روز یورپ کے گرجا گھروں کو پینٹ کیا کرتا تھا۔ میری تو صرف انگلیاں ہی متاثر ہوئی ہیں۔ گردن تو ٹیڑھی نہیں ہوئی۔"

ان کی انگلیاں ہر دم کام کرتی رہتی ہیں احباب کی محفل گرم ہو اور کسی کے منہ سے کوئی نام نکلے یا جملہ ادا ہو تو صادقین کی انگلیاں فوراً اس نام کی خطاطی کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ مجھے بھی بہت دنوں تک یہ پریشانی رہی کہ آخر ان کی انگلیاں کیا کرتی رہتی ہیں۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان کی انگلیاں محفل کی کارروائی کی خطاطی میں مصروف ہیں۔

صادقین کی تصویروں اور خطاطی کے نمونوں کو دیکھنا تو اپنی جگہ ایک روحانی مسرت ہے۔ میرے دوست شہریار نے سورۂ رحمٰن کی خطاطی کو دیکھنے کے بعد کہا تھا "میں نے آج پہلی بار "نور" کو دیکھا ہے۔ صادقین کو کام کرتے ہوئے دیکھنا بھی ایک عجیب طرح کی مسرت ہے۔ وہ جب کام کرتے ہیں تو انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا کہ وقت کیا ہے اور مقام کہاں ہے انہیں نہ چائے کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی کھانے کی حاجت۔" یوں بھی کھانا ایک ایسی شے ہے جس کا وہ کم سے کم استعمال کرتے ہیں وہ گھنٹوں زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر رنگوں اور خطوں میں کھوئے رہتے ہیں اس وقت ان کی شخصیت کا سحر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے صادقین جیسے عظیم فن کار کی صحبتوں میں بیٹھنے اٹھنے کا موقع ملا۔ اپنے جیتے جی خود اپنی آنکھوں سے انہیں رنگوں اور نور کا جادو جگاتے دیکھا۔ ۲۲ برس بعد وہ ہندوستان آئے ہیں۔ اب کے جائیں گے تو نہ جانے کب لوٹ کے آئیں گے۔

"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"۔ مگر ان کے ساتھ گزری ہوئی ان ساعتوں کے سہارے ہم یادوں کے نئے نئے پیکر تراشتے جائیں گے اور ان میں طرح طرح کے رنگ بھرتے رہیں گے۔

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

صادقین ان کہی کہانی

وہ ۲۲ جولائی ۱۹۸۵ء کی ایک دوپہر تھی۔ میں اسلام آباد میں واقع صادقین آرٹ گیلری میں بیٹھا تھا۔ میرے بائیں جانب مُلک کے ممتاز مصور جناب صادقین نہایت انہماک سے میر امّن کی مشہور تصنیف "باغ و بہار" کی دوسری کہانی کا مسودہ پڑھ رہے تھے۔ میں نے برسوں پہلے پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن... — میں نے برسوں پہلے پاکستان بزماشیل کے چیئرمین جناب فریدی صاحب مرحوم کی ہدایت پر قصہ چہار درویش کی نہایت آسان زبان میں تلخیص کی تھی۔ پہلی کہانی کی تزئین مشہور بیرسٹر کمال اظفر کی بیگم ناہید جعفری نے کی تھی جو فریدی صاحب مرحوم نے نہایت دلآویز طریقے سے اپنے ادارے پاکستان برماشیل سے شائع کی تھی۔ بقیہ کہانیاں ناگزیر وجوہات کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکی تھیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ صادقین بھائی وقت نکال کر کم از کم "دوسرے فقیر کی کہانی" السٹریٹ کر دیں۔ انہوں نے میری خواہش کا خیال رکھتے ہوئے مسودہ مانگا تھا اور اس وقت اسی کا مطالعہ کر رہے تھے۔

مسودہ پڑھنے کے بعد انہوں نے حسبِ معمول معصوم مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر کہنے لگے:

"ہم انڈونیشیا جا رہے ہیں۔ وہاں کی ایک مسجد میں قرآنی آیات لکھنی ہیں۔ واپس آجائیں تو پھر اس کتاب کی تصویریں بھی بنا دیں گے۔" یہ کہہ کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگے۔ معاً انہیں کچھ یاد آ گیا۔ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے:

"وہ میری کہانی کا کیا معاملہ ہے؟ آپ مجھے کچھ سنانے والے تھے"۔

"جی! خوب یاد دلایا آپ نے۔ دراصل آپ کی ایک ان کہی کہانی ہے۔ اسے آپ بھی نہیں جانتے۔"

"ہم بھی نہیں جانتے؟ بہت خوب!" صادقین بھائی کے معصوم چہرے پر فرشتوں جیسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ کیونکر معلوم ہوئی؟"

"مجھے محترم سید ہاشم رضا صاحب نے بتائی تھی۔"

"سید صاحب نے؟" صادقین صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں! سید صاحب نے اور یہ بھی بتایا کہ انہیں یہ کہانی آپ کے والد بزرگوار نے سنائی تھی۔"

"ابا نے؟"

"جی ہاں! آپ کے والد صاحب قبلہ نے۔"

"تو پھر سنائیے نا ہمیں!" صادقین بھائی کے لہجے میں التجا تھی۔ میں ان کا اشارہ پاتے ہی روایت در روایت کے سلسلے کو آگے بڑھانے لگا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے۔

"آپ کے ابا نے یہ کہانی سید ہاشم رضا صاحب کو جس طرح سنائی تھی، میں اسی انداز میں دہرا رہا ہوں۔ تو سنئے اپنی کہانی"

"صادقین پڑھنے لکھنے میں بالکل جی نہیں لگاتا تھا۔ ہر وقت در و دیوار پر کوئلے سے الٹی سیدھی لکیریں بناتا رہتا تھا۔ گھر کی تمام دیواریں اس کی سیاہ لکیروں سے بھر گئیں تو محلے کی دیواریں تختۂ مشق بن گئیں۔ محلے والے شریف اور وضع دار لوگ تھے۔ میرا خیال کر کے کچھ نہیں بولتے تھے۔ مگر

مجھے صادقین کی اس حرکت پر غصہ آتا رہتا۔ اسے منع کرتا مگر وہ کاہے کو سنے۔"

"اسے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ خیال تھا پڑھائی میں ذہن لگ جائے گا تو یہ شغل چھوٹ جائے گا۔ مگر اس لڑکے کو ایسی لت لگی تھی کہ توبہ بھلی۔ اسکول سے شکایت آتی کہ پڑھتا وڑھتا تو خاک نہیں، پنسلوں اور کوئلوں سے دیواروں پر لکیریں کھینچتا رہتا ہے۔ میں اسے ڈانٹا کرتا۔ مگر وہ ان سنی کر دیتا۔"

"ایک روز اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلوا بھیجا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس نے مجھے اسکول کی تمام دیواریں اور دروازے دکھائے اور کہا کہ صادقین اب حد سے بڑھ چکا ہے۔ اسے کسی طرح روکئے، ورنہ بڑی بدنامی ہوگی۔ ہیڈ ماسٹر کی باتیں سن کر مجھے بے حد دکھ پہنچا کہ اب اس لڑکے کے کارن مجھے شکایت سننی پڑتی۔ میں چپ چاپ گھر آ گیا۔ جب شام کو میاں صادقین اسکول سے واپس آئے تو پھر میں نے ان کی خوب مرمت کی۔ سید صاحب! اسے اس قدر مارا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ مگر اسکی لت نہ گئی۔ آخر تھک ہار کر میں نے بھی اسے چھوڑ دیا کہ جو جی چاہے بنائے اور اپنی زندگی خراب کرے۔"

"اب جو میں اس کہانی کا دوسرا حصہ سناؤں گا اس کا تعلق اسی زمانے سے ہے جب صادقین پیرس میں مقیم تھے۔ میں ان دنوں بہت علیل تھا۔ صادقین کو خبر معلوم ہوئی تو اس نے مجھے خط لکھا کہ ابا! یہ دولت کس کام آئے گی۔ آپ پیرس آ جائیے۔ یہاں ایک سے ایک ڈاکٹر ہے۔ آپ کا بہت اچھے طریقے سے علاج معالجہ ہو جائے گا۔"

"شروع شروع میں تو میں ٹال گیا۔ جب اس کا اصرار حد سے بڑھا تو میں نے لکھا کہ بیٹا! جب مجھے پیرس بلانا ہی چاہتے ہو تو پھر ایسا انتظام کرو کہ میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کرتا ہوا آؤں۔ چنانچہ صادقین نے ایسا ہی کیا اور مجھے لکھا کہ جب آپ پیرس کے ہوائی اڈے پر اتریں تو میرا یہ پتہ اپنے پاس محفوظ رکھیئے گا۔ وہاں کسی کو بھی یہ دکھا دیجئے گا۔ وہ مجھے فون کر دے گا اور میں آپ کو آ کر لے لوں گا یا پھر عراق سے مجھے ٹیلی گرام دے دیجئے گا۔"

"جب میں کربلائے معلیٰ کی زیارت سے سرفراز ہو کر پیرس کی طرف محو پرواز تھا تو احتیاطاً اپنے بٹوے کو ٹٹولا تاکہ صادقین کے ہاتھ کا لکھا ہوا پتہ نکال لوں۔ مگر میں حواس باختہ ہو گیا۔ اس لئے کہ پتے والی پرچی غائب تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں بار بار بٹوے کو دیکھا۔ اپنی شیروانی والی جیبوں کی تلاشی لی۔ مگر اسے کہیں نہیں پایا۔ میری پیشانی پر پسینے آ گئے۔ یا اللہ۔ اب کیا ہو گا۔ پیرس جیسے بڑے شہر کا ہوائی اڈہ! میں ایک نووارد نہ انگریزی جانوں نہ فرانسیسی، کس طرح صادقین کے ڈیرے تک پہنچوں گا۔ کس زبان میں اس کا پتہ دریافت کروں گا۔ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر میرا جی ہلکان ہوا جاتا تھا۔"

"اس ادھیڑ بن میں پیرس آ گیا۔ میں جہاز سے اتر کر نیچے آیا۔ پاسپورٹ دکھایا، سامان کی چیکنگ کرائی اور پھر مہمان خانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر تکتا تھا کہ شاید میرا بیٹا کہیں نظر آ جائے اور میری جان مصیبت سے چھوٹے۔ مگر یہ خیال بے سود تھا۔ گھنٹوں اس طرح بیٹھا رہا جیسے کوئی عجوبہ چیز ہوں۔ سلک کی سفید شیروانی، رام پوری سیاہ ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ۔ ازاربند میں چابیوں کا گچھا۔ اردگرد بقچہ، بقچی، پان دان، دیکھنے والوں کے لئے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔"

"جب اسی طرح بیٹھے کئی گھنٹے ہو گئے تو ائیر پورٹ کا کوئی افسر آیا اور اپنی زبان میں مجھ سے کوئی سوال کیا۔ مگر زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم والا معاملہ تھا۔ وہ بولتا رہا۔ میں چپ سنتا رہا۔ آخر تھک ہار کر وہ چلا گیا۔ میں دل میں یہ خیال کرنے لگا کہ شاید اب زندگی کے بقیہ دن یہیں گزر جائیں گے۔"

"کچھ دیر بعد ایک اور افسر آیا اور وہ بھی ناکام لوٹ گیا۔ اب صبح سے شام ہو رہی تھی۔ کئی افسر آئے اور چلے گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بوڑھا مسافر کہاں جائے گا، کس سے ملے گا۔ میں بھی روہانسا ہو رہا تھا کہ معاملہ کیسے حل ہو گا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ جیسے ہی ایک خاتون افسر پوچھنے پچھانے آئی، جھٹ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو سینے پر مار کر اشارہ کیا۔"

"صادقین! ۔ فادر!" ۔ میں نے سن رکھا تھا کہ انگریزی ہر جگہ بھی جاتی ہے اور میں یہ جانتا تھا کہ اس زبان میں باپ کو "فادر" کہتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ مار کر اشارہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میں "صادقین کا باپ ہوں"۔ یہ محض ایک خام خیالی تھی۔ بھلا اتنے بڑے عظیم شہر میں لفظ "صادقین" سے کوئی کیا سمجھے گا۔ مگر میں اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتا تھا۔"

"مگر سید صاحب! لفظ "صادقین" معجزہ سے کچھ کم ثابت نہیں ہوا۔ جیسے ہی اس خاتون افسر نے میرے منہ سے "صادقین! فادر" سنا، وہ دوڑتی ہوئی واپس کمرے میں گئی اور پھر بہت سارے افسران تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ بعض نے ہیٹ اتار کر۔ بعض نے سر کو جھکا کر مجھے سلام کیا اور پھر ہر ایک نے میرا سامان اٹھایا اور مجھے اشارے سے چلنے کو کہا۔ باہر گاڑی میں مجھے بٹھایا گیا اور تین چار افسر بھی اس میں بیٹھ گئے۔"

"کچھ دیر بعد گاڑی ایک شاندار عمارت کے سامنے رکی۔ ایک افسر اترا اور دوڑتا ہوا اس عمارت میں گھس گیا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ دیکھا کہ صادقین میاں ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ پاس پہنچے تو مجھے دیکھ کر بولے: "ابا آپ؟ خبر کیوں نہیں کی۔"

"بیٹا۔ وہ پتے والی پرچی ہی راستے میں کہیں گم ہو گئی۔ اطلاع دیتا تو کیسے دیتا۔ مگر بیٹا! ۔ آج میں اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ بچپنے میں تم دیواروں پر کوئلوں سے جو الٹی سیدھی لکیریں کھینچتے تھے یہ انہی کا اعجاز ہے کہ صرف "صادقین" کے لفظ پر اتنے بڑے بین الاقوامی شہر میں تمہارے پاس ان واحد میں پہنچ گیا۔ آج میں تمہیں زد و کوب کرنے پر شرمندہ ہوں۔"

کہانی ختم ہو چکی تھی۔ صادقین بھائی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

صفحہ ۱۹۲ کا باقی

کے متعدد بڑے اور چھوٹے ملکوں میں اپنی تخلیقات کی نمائش منعقد کر کے مقبول خاص و عام ہوئے اور اس طرح ان کے قدر دانوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا لیکن اب وہ اپنی "اصل" کی طرف لوٹ گئے ہیں۔

گزشتہ روز نمائش دیکھنے سے پہلے ہماری طرح دوسروں کو بھی یہی توقع تھی کہ وہ حسب روایت اسلامی انداز اختیار کریں گے اور اپنے مداحوں کے سامنے اسلامی پہلوؤں کو نئے انداز سے پیش کر کے داد تحسین وصول کریں گے لیکن یہاں تو رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور تھا۔ تہ خانے کے مین دروازے پر یہ اشعار آویزاں تھے۔ ع

لو کر چکا صادقین ترکِ اسلام
خطاطی نہیں اب ہے بناتا اصنام
ماتھے پہ وہ اب کھینچ رہا ہے قشقہ
کل لوح پہ لکھتا تھا جو اللہ کے نام

ہمارا ماتھا تو یہ رباعی پڑھ کر ہی ٹھنکا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ تہ خانے میں جو داخل ہوئے تو عریاں اور نیم عریاں مصوری کے بے شمار نمونے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ جن فن پاروں کے کیپشن "حلاوت بوسہ" "بغل گیری" "نفاست بوسہ" "طہارت بوسہ" اور "نزاکت بوسہ" ہوں۔ ان فن پاروں کی خبر سامعین کا عالم کیا ہوگا جن شاہکار پر نظر دوڑائی عریانی اور فحاشی سے آلودہ نظر آیا۔ دیکھنے والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ صادقین کو یہ کیا ہوا۔ اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ صادقین کے ۔۔ مدیے تیور

صفحہ ۱۷۰ پر

نصر اللہ خاں

صادقین

صادقین کے مرنے کا مجھے بہت دُکھ ہوا لیکن میری آنکھ سے کوئی آنسو نہیں گرا۔ کیونکہ صادقین تو خود ایک آنسو تھا جو آج گر کر بہہ گیا۔ صادقین عام لوگوں جیسا نہیں تھا۔ زندگی سے اُسے بے شک پیار تھا لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتا، کھویا کھویا سا۔ اس کی اپنی الگ ایک دُنیا تھی۔ رنگ و بو کی دنیا۔ جہاں وہ تھا اور کوئی دُوسرا نہیں تھا۔ وہ ہزاروں لوگوں میں بھی تنہا تنہا رہتا نجانے اس کے دِل میں کیا دُکھ تھا اور کیسا دُکھ تھا اور کتنا درد تھا۔ اور کس کس کا درد تھا۔ اس نے ساری کائنات کے درد اپنے دِل میں بیٹھ لئے تھے۔ وہ بڑا دُکھی انسان تھا اور ان دکھوں میں بھی وہ مسکراتا رہتا۔ وہ بہت کم کھاتا تھا اور بہت زیادہ پیتا تھا اور وہ جو پیتا تھا تو آخر وہی پینے والی شے اُسے پی گئی۔

صادقین سے میری ملاقات یوں تو تیس پینتیس برس کی ہے مگر ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب ہم دن رات ساتھ رہتے۔ جب وہ بچہ تھا تو اس کی ماں کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ گیا اور اُسے عمر بھر ماں کی ممتا کی تلاش رہی۔ سنا ہے کہ جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو اس کے ہاتھ میں ایک کوئلہ ہوتا اور وہ یوں دیواروں پر تصویریں بناتا اور مارے باندھے جب اُس نے تعلیم حاصل کرلی تو وہ کراچی آ گیا اور ریڈیو پاکستان میں میرے ساتھ پروڈیوسر ہوگیا لیکن سرکاری ملازمت کہاں؟ اور صادقین کہاں؟ چنانچہ ایک سال کے بعد وہ ریڈیو کی ملازمت سے مستعفی ہوگیا اور اس کے بعد اس نے باقاعدہ تصویریں بنانا شروع کیں اور تصویر کشی میں اپنی ایک انفرادیت پیدا کی۔ تجریدی آرٹ میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ فن کی دُنیا میں ایسا کھو گیا کہ پھر پایا نہ گیا۔ اور ساری دُنیا میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ چنانچہ اُس نے دنیا کی بڑی بڑی عالمی نمائشوں میں حصہ لیا اور دادِ پائی اور اس کی شہرت بین الاقوامی آرٹسٹ کی ہوگئی۔

یہ عجیب بات ہے کہ موت نے صادقین کا گھر دیکھ لیا تھا۔ اس کے سارے بھائی ایک ایک کرکے رخصت ہوئے اور اپنے بیوی بچے چھوڑ گئے۔ چنانچہ صادقین ساری زندگی جو کچھ کماتا ان ہی پر صرف کرتا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے سارے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے ان کی شادیاں کیں اور اپنے کسی بھتیجے یا بھتیجی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ جیسے اس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہے۔

صادقین بڑا اچھا شاعر بھی تھا۔ وہ رباعیات بھی کہتا۔ قطعے بھی کہتا۔۔۔ اس نے انگریزی میں ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور بلا کا طباع انسان تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے مجھ سے کہا کہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں میرے بھتیجوں کو داخل کرادو۔ میں نے ہیڈ ماسٹر کے نام ایک خط لکھ دیا۔ صادقین، وہاں سے واپس چلا آیا اور کہنے لگا کہ کیونکہ اسکول کے اساتذہ کی شکلیں اچھی نہیں ہیں اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میرے بھتیجے وہاں پڑھیں کیونکہ استادوں کی صورت شکل کا بچوں کے احساسِ جمال پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

اگر صادقین شیروانی نہ پہنتا اور چشمہ نہ لگاتا اور اس کے سر پہ بال نہ ہوتے تو شاید وہ نظر بھی نہ آتا۔ اس کی آواز۔۔۔۔ ایسی تھی جیسے کوئی کنوئیں میں سے بول رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میرے بال بچے بھوکے مر رہے ہیں مجھے آٹو رکشہ چلانا آتی ہے۔ آپ مجھے کسی سے کرائے پہ آٹو رکشہ دلوا دیجئے تو صادقین نے اپنی جیب سے پندرہ ہزار روپے دے کر رکشہ دلوا دی لیکن شرط یہ لگوائی کہ مجھے جب ں جانا ہوگا تو تم مجھے وہاں لے جاؤ گے۔ چنانچہ کچھ مدت تک صادقین اس سے یہ کام لیتا رہا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اس نے یہ آٹو رکشہ اسی کے حوالے کر دی۔

صادقین کے بارے میں یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے ایبسٹریکیٹ آرٹ جس میں وہ بے پناہ مہارت حاصل کر چکا تھا کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے خطاطی کیوں اختیار کی؟ تو ایک مرتبہ میں نے اس سے یہ سوال کیا۔ صادقین نے کہا کہ کلامِ پاک میں حکمت، منطق، اور فلسفہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں خالقِ حقیقی کا فن بھی ہے۔ چنانچہ جب میں نے کلامِ پاک بنظرِ غائر ایک گنہگار ہونے کی حیثیت سے مطالعہ کیا تو میں نے اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ ان آیات میں جو فن پوشیدہ ہے اُسے میں نمایاں کروں۔ چنانچہ سورہ رحمٰن کی نقاشی سے اس سورۃ کے معنیٰ اس طرح ذہن نشین ہوتے ہیں جو اور کسی طریقے سے نہیں ہوتے۔

صادقین کے کھانے کی یہ کیفیت تھی کہ اُسے مار مار کر کھانا کھلایا جاتا تھا ورنہ کھانے سے اُسے کوئی رغبت نہیں تھی۔ اس طرح وہ رات بھر جاگتا۔ نجانے کس وقت سوتا وہ ایک زندہ لاش تھا۔ جو اپنے آپ کو اُٹھائے پھرتا۔ وہ دوسروں کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ تھا۔ لیکن اپنے لئے بڑا بھاری بوجھ تھا۔ اور آج یہ بوجھ اُتر گیا اور آج وہ مر گیا اور آج اُس نے آرام پایا۔
اللہ تعالیٰ اُس پہ اپنی رحمتیں نازل کرے۔ (آمین)

صفحہ ۱۳۴ کا باقی

بہت وسیع تھا اور اپنے مداحوں کے درمیان بہت خوش رہتا تھا لیکن علیحٰدہ تنہا ہوتا بس کچھ تھوڑے سے لوگ تھے جن سے وہ صحیح معنوں میں بے تکلف تھا۔ یوں ہر شخص کو معلوم ہوتا کہ وہ صادقین کے خصوصی حلقے میں شامل ہے۔ خوش باتیں اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ نفاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ باتوں میں کھرا۔ بس اگر دل جوئی کا معاملہ ہے تو پھر وہ مصلحت کی گفتگو کر لیتا تھا۔ یونوں کی دُنیا میں وہ سرو کی طرح قدآور تھا۔ مارچ میں ہم لوگ عمرہ کے لئے گئے۔ مکہ مکرمہ میں ایک رات آپا نے اسے خواب میں دیکھا۔ کُرتے پاجامے میں ملبوس وہ بہت خوش ہیں۔ کیفیت سے کچھ یوں ہے کہ سامنے دیگیں پڑی ہوئی ہیں اور وہ کرسی پہ بیٹھے ہوئے مسکرا رہے ہیں اور آپا کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ "دیکھ رہی ہو ٹھاٹھ ہیں نا!" وہی منفرد لہجہ "نا" پُر زور۔ میں تو ایک گنہگار بندہ ہوں لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ صادقین کی مغفرت ہو چکی ہے اور وہ اعلیٰ ترین مراتب پہ فائز ہے۔ باقی رہے اللہ کا نام۔

منّو بھائی

صادقین کی محبوبہ

سیّد صادقین احمد نقوی عنقریب کوئی ہنگامہ کرنے والے ہیں۔ یہ خبر گزشتہ روز جو ہر حسین کی معرفت باغِ جناح کی اس پہاڑی سے نیچے اُتری جو کبھی اوپن ایئر تھیئٹر کہلاتی تھی مگر اب صادقین کا ٹلہ یا جبیل الصادقین یا سادھو کا شوالہ یا جھوک صادقین کے طور پر مشہور ہو رہی ہے۔

صادقین کی طرف سے ہنگامے کا تو ہر وقت خطرہ رہتا ہے کیونکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کا شیوہ ہے۔ مصوری، خطاطی، شاعری، بے تحاشا مصوری، لاانتہا خطاطی اور پھر "لاانتہا" شاعری۔ یہ اطلاع ملی کہ خطاطی کو کچھ عرصہ کے لئے سیٹ کر مصوری کے کینوس پھیلائے بیٹھے ہیں۔ بہت عرصہ سے وہ الوان وخطوط کے کچھ نئے رنگ اور نئے ڈھنگ دکھانے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ بڑے بڑے عجیب نقشے ذہن میں آ رہے ہیں جو میں صرف کینوس پر ہی بیان کر سکتا ہوں۔ جی نے چاہا کہ چل کر دیکھیں تو سہی کیا ہو رہا ہے۔ الوان و خطوط کیا رنگ اور کیا ڈھنگ دکھا رہے ہیں اور کیسے کیسے نقشے ذہن سے کینوس پر منتقل ہو رہے ہیں۔ دیکھا تو وہاں رنگ ہی اور تھا ڈھنگ ہی دوسرا تھا۔ نقشے ہی مختلف تھے۔

صادقین رنگوں اور لکیروں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کا ہاتھ نہایت تیزی سے کینوس پر ایک تصویر اُبھارنے میں مصروف تھا۔ تصویر صادقین کی اپنی تصویر تھی جس میں اُن کے سر پر خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ان جھاڑیوں پر چڑیاں اور پرندے بیٹھے تھے اور صادقین کا ایک ہاتھ ایک کوّے کو انگور کھلا رہا تھا۔ اور دو کوّا پنے بچے کو انگور کا چوگا دے رہا تھا۔ تصویر کے علاوہ مصور کا بھی یہی نقشہ تھا اور ایک چڑیا اُن کے نہایت تیزی سے تصویر بنانے والے ہاتھ کے کندھے پر بیٹھی تھی جو ایک اجنبی کے دخل در معقولات سے گھبرا کر اُڑ گئی۔

پتہ چلا کہ اس چڑیا سے صادقین کی دوستی اس پہاڑی پر کوئی ایک ماہ پہلے ہوئی تھی جب صادقین ایک کینوس کے سامنے بیٹھے تصویر کا کوئی نقشہ سوچ رہے تھے۔ چڑیا نے جو کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ خاموشی سے بیٹھے ہوئے صادقین کو پہلے تو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا اور کچھ عرصہ انتظار کرتی رہی کہ اُن کے جسم میں کوئی حرکت ہو، پھر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ حرکت کرنے والے انسان نہیں انسانی مجسمہ ہے۔ پھر چڑیا کو کوئی ضروری کام یاد آ گیا اور وہ اُڑ گئی۔ دوسرے روز چڑیا اُدھر سے گزری تو اس مجسمے کا خیال آیا۔ کھڑکی میں آ بیٹھی اور دیکھا کہ اس مجسمے میں حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک کینوس پر لکیریں بنا رہا ہے۔ چڑیا کو یقیناً حیرت ہوئی ہو گی وہ آگے بڑھ کر اُن لکیروں کو دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تھوڑی دیر بیٹھی دیکھتی رہی پھر اُڑ گئی۔

تیسرے روز چڑیا آئی تو دیکھا کہ تصویر مکمل ہو چکی ہے اور صادقین ایک دوسرے کینوس کے سامنے مجسمہ بنے بیٹھے ہیں۔ اب کے وہ خاموش نہیں ہیں اور اپنے آپ سے باتیں بھی کئے جا رہے ہیں۔ اب کے چڑیا نے صادقین کی توجہ حاصل کرنا چاہی۔ اس نے "چوں چوں" کی مگر صادقین نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اُچھل کر تھوڑا آگے گئی مگر صادقین نے اس کی طرف نہ دیکھا وہ خالی کینوس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چڑیا مایوس ہو کر چلی گئی مگر وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ چوتھے روز پھر آئی۔ پانچویں روز بھی آئی۔ پھر یہ اس کا معمول بن گیا کہ جب بھی گھونسلے کے کام کاج

محبت ابنِ حسن

زندۂ جاوید صادقین

یہ اُس زمانے کا قصہ ہے جب کراچی کا سہاگ قائم تھا، اور شہرا بھی نظرِ بد سے دور تھا۔ ملک میں پارلیمانی جمہوریت قائم تھی اور حسین شہید سہروردی مرحوم قائدِ حزبِ اختلاف تھے۔ حکومت کی طرف سے انہیں کلفٹن میں ایک سرکاری کوٹھی رہنے کے لئے دی گئی تھی۔ اُس وقت ریڈیو پاکستان کے شعبۂ خبر میں ایک سینئر نیوز ایڈیٹر کاظمین نقوی مرحوم تھے چونکہ میں بھی ایک سال ریڈیو میں بطور سب ایڈیٹر کام کرچکا تھا، کاظمین صاحب سے میرے کچھ مراسم تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی صادقین سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ سہروردی صاحب کے گھر پر صادقین کی تصویروں کی نمائش ہوگی۔ یہ ابھی نوجوان ہیں اور یہ شاید ان کی پہلی نمائش ہے اور ذرا اچھی طرح سے پبلی سٹی کرادو۔ میں نے کہا کہ کاظمین بھائی میں خود کور کروں گا۔ نمائش ہوئی۔ سہروردی مرحوم کے وسیع ڈرائنگ روم میں ۲۵، ۳۰ یا شاید کچھ زیادہ تصویریں سجائی گئیں اور شہید صاحب نے مختصر الفاظ میں صادقین کا تعارف کرایا۔ شہر کے چند حضرات جنہیں آرٹ سے دلچسپی ہے موجود تھے۔ اور اس شخص کی کوششوں کو غور سے دیکھ رہے تھے جو آئندہ چل کر الفاظ و خطوط اور رنگ کا بادشاہ بننے والا تھا۔ یہ صادقین کے آرٹ کا شاید پہلا دور تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب مرحوم نے ایک ایسی تصویر بھی نمائش میں رکھی تھی جسے اگر سیدھا رکھیں تو ناگرہ جیونوں کی جوڑی معلوم ہوتی تھی اور اگر اُلٹا رکھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ دو طوطے برابر برابر بیٹھے ہیں۔ میں نے دو تین برس ہوئے صادقین کو اس تصویر کے بارے میں یاد دلایا تو کہنے لگے "ہاں وہ دورِ اوّل کی چیز تھی۔ اب بھی شاید کہیں پڑی ہو گی"۔ اس کے بعد سے صادقین سے میری ملاقات اکثر ہوتی رہی۔ اسی دوران میں صادقین کے آرٹ کے ایک اور پرستار اور میرے گہرے دوست شاہ محمود سلیمان (سر شاہ سلیمان کے دوسرے فرزند اور شہید سہروردی کے داماد احمد سلیمان مرحوم کے چھوٹے بھائی) کراچی میں بطور کلکٹر آف کسٹمز تعینات ہو گئے۔ انہوں نے گذری میں ساحلِ سمندر پر صادقین کے لئے رہائش کا بندوبست کرایا اور صادقین نے نہایت سکون کے ساتھ اپنے فن کو مزید پروان چڑھانا شروع کیا۔ اب صادقین ایک صاحبِ طرز، نئے دور کے، نئے قسم کے آرٹسٹ ہو چکے تھے، اور ملک میں ان کا نام روشن ہو رہا تھا۔ صادقین نے کیکٹس اور دوسرے قسم کے تجربات تو کئے لیکن وہ بہترین پورٹریٹ بھی بنا سکتے تھے۔ اور انہوں نے محمود کی بیگم کی ایک پورٹریٹ بھی بنائی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک اور محترمہ کو بھی شوق ہوا کہ اپنی پورٹریٹ بنوائیں۔ صادقین نے بہت ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ ان کی لائن نہیں مگر موصوفہ سر ہوگئیں تو انہوں نے نہایت "جدید" قسم کی پورٹریٹ بنائی اس کے بعد سے وہ صاحبہ صادقین سے خفا ہو گئیں۔ صادقین نے کہا کہ "میں کیا کروں مجھے تو آپ ایسی ہی لگتی ہیں"۔ میری صادقین سے لندن میں بھی مختصر ملاقاتیں رہیں اور ان کی عظمت کا سورج بلند سے بلند تر ہوتا رہا۔ ۱۹۸۰ء میں جب میں اسلام آباد میں مقیم تھا تو صادقین کی گیلری جس پر فرانسیسی طرز میں "گیلری صادقین" لکھا تھا، میرے دفتر کے قریب ہی واقع تھی۔ چنانچہ اکثر ان کے پاس جا بیٹھتا۔ پتھروں پر، چمڑے پر اور چیکیلے کاغذ پر خطوط، رنگ بِرنگ بکھرتے رہتے اور صادقین اپنی رباعیاں سناتے اور خوب کھل کر باتیں ہوتیں۔ یہ بات اب سب کو معلوم ہے کہ صادقین جن کی طرح کام کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں صبح گیا اور دیکھا کہ وہ کام میں جُتے ہوئے ہیں اور شام کو گیا تو معلوم ہوا کہ اسی طرح کام جاری ہے۔ کھانا کھانے سے ان کی دلچسپی بس اتنی تھی کہ خوردن برائے زیست است۔ ایک دفعہ میں ان کے یہاں گیا

تو معلوم ہوا کہ صبح "ہنٹر بیف" کھا رہے ہیں جو کسی دوست نے بھجوایا تھا۔ کہنے لگے کل سے کھانا کھانا بھولا ہوا تھا۔ یہ دیکھا تو سوچا کہ چلو کھا ہی لیا جائے۔ ایک دفعہ غریب خانے پر آئے تو میری بیوی سے کہنے لگے کہ ارہر کی دال اور قیمہ کھاؤں گا۔ اور صرف وہی کھایا۔ ورنہ فرمائش کرنا اور کھانوں کی تفصیل میں جانا ان کا کام نہیں تھا۔ آج تک میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ جو شخص صرف مشروبات چائے اور سگریٹ پر گزارہ کرتا ہے اس میں گھنٹوں تک کام کرنے کی ہمت کہاں سے آجاتی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ "لگن اور شوق"۔ میرے خیال میں صادقین جیسا نابغۂ روزگار برسوں میں ایک پیدا ہوتا ہے۔ آرٹ کی مختلف اصناف اور مختلف طریقوں کے علاوہ شعر و ادب میں بھی انہیں درک تھا۔ ان کے کردار کا بنیادی پہلو ان کی شرافت و محبت تھی۔ عام آدمیوں سے، انسانیت سے اعلیٰ اقدار سے، شرافت و حسن سے محبت، میرے خیال میں وہ اتنے رحم دل تھے کہ مکھی تک نہ مار سکتے تھے لیکن تیشہ مار کر کام کرنے میں ان کا ثانی مشکل ہی سے ملے گا۔ آرٹ میں ان کے اسٹائل بدلتے اور ترقی کرتے رہے لیکن ان کی وضع کبھی نہ بدلی۔ وہی ڈھیلی سی شیروانی، ڈھیلا پاجامہ، کنگھے سے ناآشنا چھدرے چھدرے بال۔ اکثر شیو بڑھا ہوا، موٹے فریم کا چشمہ، چہرے پر مسکراہٹ، جو تیس سال پہلے دیکھی تھی آخر دم تک قائم رہی۔ ہندوستان گئے وہاں بہت دن قیام کیا۔ . . . عبدالحمید کے ثقافتی مرکز، علیگڑھ یونیورسٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں اپنے موئے قلم کے نقش و نگار چھوڑ آئے۔ کہتے تھے مجھے گیارہ شیروانیاں لوگوں نے تحفتاً دیں۔ مگر انہیں کپڑوں سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ایک عجیب درویش صوفی منش، فقیر تھا جو اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ لاکھوں روپیہ کمایا مگر ہم نے کبھی صادقین کے ہاتھوں روپے کا وہ استعمال نہ دیکھا جو تھرڈ کلاس لوگوں کا آج کل وطیرہ ہے۔ وہ سخی، دریا دل لکھ لٹ انسان تھا جو قلم اور برش سے یکسوئی کے ساتھ محبت کرتا رہا۔ اور پھر ایک رات چپکے سے چلا گیا۔ جی ہاں چلا گیا۔ مرا نہیں۔ میرے عزیز دوست سابق جوائنٹ سیکرٹری افضال زیدی نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا دو برس ہوئے جب صادقین نے کراچی آنے کا ارادہ کیا۔ ڈاکٹر سعید بٹ نے انہیں اسلام آباد میں روکنے کے لئے بہت ترکیبیں کیں اور بڑا زور دیا کہ وہ "گیلری صادقین" ہی میں مقیم رہیں مگر صادقین نے کہا کہ وہ لاہور کا حسن دیکھ چکے، اسلام آباد کی دلکشی سے لطف اندوز ہو چکے لیکن پرندے اور جانور جب مرنے لگتے ہیں تو واپس اپنے 'افلاک' یا گروہ میں چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا اب انہیں کراچی جانا ہی پڑے گا۔ خالد سعید بٹ ان کے سوئم میں رضویہ کالونی میں ملے تو اس واقعہ کی تصدیق کی۔ چنانچہ وہ کراچی آ گئے جگہ جگہ ان کے موئے قلم نے چراغ جلا دیئے۔ نیپا میں ان کے دم سے رونق آ گئی۔ افتخار احمد عدنی سابق ڈائریکٹر کی کوششوں کے باعث وہ نیپا میں عرصے تک مقیم رہے۔ ان کے لکھے ہوئے اسمائے حسنیٰ سے نیپا روشن ہو گیا۔ فریئر ہال میں جان پڑ گئی مگر وہ اپنی جان جان آفریں کو سپرد کر کے لاکھوں کو روتا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ وہ مرے نہیں۔ ان کے لفظ و خط و رنگ بھلا انہیں مرنے دیں گے؟

صفحہ 119 کا باقی

عقل تھی کیسی رسا اور فکر تھی کیسی جواں
سادگی کے ساتھ پرکاری انہیں پر ختم تھی
روز روز ایسے مصور پیدا ہوتے ہیں کہاں
ہر مرقع میں تھی جدت، اہلِ بینش کے لئے
زاویوں سے جس طرف دیکھا، نیا ابھرا سماں
صادقین اب عالمِ بالا میں کھینچیں شاہکار
کوثر و تسنیم اور نہرِ لبن باغِ جناں

زاہدہ حنا

صادقین کا تصویری سماج

کون ہے جس نے بچپن میں تتلی نہ پکڑی ہو اور پھر اسے آزاد کر دینے کے بعد انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی بھی پوروں پر پیروں کے رہ جانے والے رنگوں کو تا دیر نہ دیکھا ہو۔؟

کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری ہے۔ وقت کی تتلی میری گرفت سے نکل گئی ہے۔ اور اس کے رنگ یاد بن کر جانے کتنے کی پوروں میں رہ گئے ہیں۔ یہ فروری کا مہینہ ہے اور اس مہینے اپنے عہد کا ایک اہم اور نامور مصور اپنے بکھیرے ہوئے رنگوں اور اپنی کھینچی ہوئی لکیروں سے منہ پھیر کر، موت کی چادر کا بکل مار کر اس سفر پر نکل گیا تھا جس میں سب تنہا ہوتے ہیں۔

صادقین احمد کے بارے میں لکھتے ہوئے یادوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ رہا ہے۔ ایک بہت بڑا ہال ہے جس کی بلند و بالا اور وسیع و عریض دیوار رنگوں سے اور ان گنت انسانوں کے خال و خد سے ڈھکی ہوئی ہے۔ لوگوں کا ایک ہجوم ہے جو اس عظیم الشان دیواری تصویر کو دیکھنے کے لئے جمع ہے۔ میں بھی اسکول یونیفارم پہنے ہوئے اس ہجوم کا حصہ ہوں اور حیرت سے اس تصویر کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتی ہوئی گھوم رہی ہوں۔ اسٹیٹ بنک لائبریری کی وہ دیوار ارتقائے تہذیبِ انسانی کا آئینہ بنی ہوئی ہے اور نام بھی اس دیواری تصویر کا "وقت کے خزانے" ہے۔ سب دیکھنے والے اس "خزانے" سے اپنا اپنا دامن بھر رہے ہیں: حسبِ حیثیت، حسبِ مقدور۔ اُس وقت میں تصور بھی نہیں کرتی کہ میں اس دیواری تصویر کے مصور کو دیکھوں گی، اس سے ملوں گی، اس سے باتیں کروں گی۔

لاہور کا میوزیم ہے۔ شام ڈھل رہی ہے۔ صادقین احمد جو گھنٹوں بعد اس پاڑ سے یا یوں کہہ لیں کہ لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی مچان سے اُترے ہیں جس پر بیٹھ کر اور جس پر لیٹ کر وہ لاہور میوزیم کی چھت کو اور اس کے حاشیوں کو مصور کر رہے ہیں۔

اس شام میں نے دیکھا کہ برش کا اور مصور کے ہاتھ کا کیا رشتہ ہوتا ہے۔ اپنی تصویروں کی طرح کج مج اور ٹیڑھے میڑھے صادقین کے ہاتھ سے برش کو علیحدہ کرنے کے لئے سفید تام چینی کے بڑے تسلے میں گرم پانی لایا جاتا ہے۔ صادقین اکڑی ہوئی انگلیوں میں پھنسے ہوئے برش سمیت اپنا ہاتھ اس میں ڈالتے ہیں۔ اور پھر گرم پانی سے ٹکور کے بعد ہی اُن کی انگلیاں برش سے جدا ہوتی ہیں۔ وہ میلے کچیلے اور رنگ سے تھڑے ہوئے دامن سے اپنی گیلی انگلیاں خشک کرتے ہیں اور میں ان کی خمیدہ انگلیوں کو دیکھتی رہتی ہوں جنہوں نے برش سے ایسا عشق کیا کہ پھر کبھی آپ کی، ہماری انگلیوں کی طرح سیدھی نہ ہو سکیں۔

اور عشق تو انہوں نے در اصل کاغذ سے کیا۔ اپنی خود نوشت میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "ہمیشہ کی طرح زمانۂ طفلی میں بھی کاغذ اور وہ بھی سادہ کاغذ میری کمزوری رہا ہے۔ سادہ کاغذ دیکھ کر میری آنکھوں میں روشنی اور دل میں خوشی کی لہر اُٹھتی تھی۔ یاد نہیں مجھے کس عمر سے حرف شناسی آگئی تھی۔ مگر اس سے بھی پہلے مجھے لکھنا آتا تھا۔ یہ بات مجھے میرے اُن بزرگوں نے بتائی جنہوں نے مجھے لکھتا ہوا دیکھا تھا۔"

رضیہ فصیح احمد کے گھر کی خوشبوؤں سے چھلکتی ہوئی اور باتوں سے مہکتی ہوئی شام یاد آ رہی ہے۔ عصمت چغتائی میرِ محفل ہیں اور فضا میں ان کی باتوں کی دھنک گھلی ہوئی ہے۔ سارے ہندوستان میں دھوم مچا کر صادقین کچھ ہی دنوں پہلے پلٹے ہیں۔ اور نیپا ہوسٹل میں مقیم ہیں۔ جانے کس طرح صادقین کا ذکر نکل آتا ہے۔ عصمت آپا ٹھنک کر کہتی ہیں۔ "اللہ مارا ساری تصویریں اپنے بدن ایسی ٹیڑھی میڑھی بناتا

..۔ مجال ہے جو کسی تصویر کی کوئی کل سیدھی ہو۔"

رضیہ فصیح احمد چپکے سے کہتی ہیں :" میں آج صبح ہی صادقین سے مل کر آئی ہوں ۔ بڑا جی چاہا تھا کہ ان سے بھی کہہ دوں۔ لیکن دونوں سیر پہ سوا سیر ہیں ۔اس ڈر سے نہیں بلایا کہ دونوں میں اگر نوک جھونک شروع ہو گئی تو کون سنبھالے گا ؟"

" ارے بھی رضیہ ۔ ۔ نیپا ہے کتنی دور ۔ ۔ ۔ جا کرلے آؤ صادقین صاحب کو لطف رہے گا ۔" ایک مہمان خاتون مشورہ دیتی ہیں ۔

"اجی ہاں ' فوراً کے فوراً صادقین اُٹھ کر آنے سے رہے ۔" کوئی کہتا ہے ۔

رضیہ آپا نہایت معصومیت سے میری طرف دیکھتی ہیں اور میں فوراً اُن کی نگاہوں کے جھانسے میں آجاتی ہوں۔" صادقین صاحب ہماری بات نہیں ٹالیں گے ۔ چلئے انہیں لے کر آتے ہیں۔" میں اُٹھ کر کھڑی ہوتی ہوں ۔ نیپا ہوسٹل رضیہ آپا کے گھر سے ہی کتنی دور ہے ۔ وہاں پہنچتے ہیں تو محفل جمی ہوتی ہے ۔ عابد علی شاہ اور ان کی بیگم نازنین موجود ہیں ۔ نازنین کو صادقین نے بہن بنایا تھا ۔ اس ناتے وہ اکثر و بیشتر ان کے لئے طرح طرح کے کھانے پکا کر لاتی ہیں جنہیں وہ حسبِ عادت نہیں کھاتے ۔ اس وقت بھی وہ ان کے لئے کچھ لے کر آئی ہیں ۔

میں عرض مدعا کرتی ہوں تو وہ موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کر دیکھتے ہیں ۔" اجی بیبی کیا ہیں آپ کی عصمت چغتائی ؟"

"جی بیبی تو کچھ نہیں لیکن آپ سے بہت سینئر ہیں اور پھر بڑی افسانہ نگار ہیں ۔"

" ہوں گی ۔" وہ بد دماغی سے کہتے پھر سلطان کاظمین کو آواز دیتے ۔" میاں بھتیجے ذرا شیروانی تو لانا ۔" اور میلے دَلے کپڑوں ۔ ۔ ۔ پر سیاہ شیروانی پہن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ان کے اُٹھتے ہی محفل برخاست ہو جاتی ہے ۔ وہ عصمت چغتائی کے افسانوں کی ایسی تیسی کرتے ہوئے جون ایلیا سے جانے کیا کچھ کہہ رہے ہیں ۔

" بھئی زاہدہ گڑبڑ ہو گئی ۔ یہ مصوری کا ہمالہ پہاڑ ہیں تو وہ افسانے کی لال قلعہ ۔ کہیں بد مزگی نہ ہو جائے ۔" رضیہ آپا گھبرانے لگتی ہیں ۔

صادقین صاحب کی برات رضیہ آپا کے ڈرائنگ روم میں پہنچتی ہے تو عصمت آپا صادقین صاحب کو دیکھ کر یوں گہری سانس لیتی ہیں جیسے ابھی نتھنوں سے شعلے لپکیں گے ، اُدھر صادقین صاحب بھی کچھ بڑبڑاتے ہیں ۔ ایک سرپھرا مصور اور دوسری منہ پھٹ افسانہ نگار ۔ ایک دوسرے کے سامنے ہیں ۔ میں سوچتی ہوں جانے کس بہانے اب ان دونوں کے درمیان گھمسان کا رَن پڑے گا ۔

پھر سب ہی دیکھتے ہیں کہ سرپھرا مصور ، منہ پھٹ افسانہ نگار کے سامنے پہنچتا ہے تو اس کے برابر بیٹھنے کے بجائے یہ کہتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے کہ" عصمت آپا کی جوتیوں میں بیٹھنا کیسی بڑی سعادت ہے ۔" اور وہی عصمت چغتائی جو دس منٹ پہلے صادقین کے نام پہ ناک بھوں چڑھا رہی تھیں ، پہلے تو صادقین کو گھور کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں ۔" مجھے نہیں اچھے لگتے یہ چونچلے ۔" پھر وہ اپنی پشت پر رکھے ہوئے کشن کو اُٹھاتی ہیں اور صادقین کی گود میں ڈال دیتی ہیں ۔" چھٹانک بھر گوشت تو ہے نہیں کولہوں پر ۔ اللہ ماری زمین چبھنے لگے گی ۔ اسے ہی رکھ لو نیچے ۔" اور صادقین احسان کے دبے ہوئے کشن پر اس سعادت مندی سے بیٹھ جاتے ہیں جیسے عمر انہوں نے عصمت آپا کی جھڑکیاں سنتے ہوئے اُن کے قدموں میں بیٹھ کر گزاری ہو اور وہ دونوں جن کی اناؤں کے ٹکراؤ سے ہم خوفزدہ تھے ، نادیر سر جوڑے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں ۔

صادقین کہانی ہو چکے ۔ ان کی ادائیں ، ان کے نخرے ، ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے غمزے ' ان کی درویشی اور ان کی کجکلاہی ۔ ان کے سب ہی عالم اس وقت نگاہوں کے سامنے کھنچے ہوئے ہیں ۔

وہ اپنی بنیاد میں فطرت پرست اور حُسن پرست تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ”مظاہر قدرت میں جس چیز نے سب سے پہلے میرے ذہن وخیال کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اس میں رنگ اور شکل بدلتے ہوئے بادل ہیں اور بادلوں کے بعد طلوعِ آفتاب کا منظر تھا۔ کاغذ پرستی کے بعد آفتاب پرستی آئی تھی اور آفتاب پرستی کے لئے موسم سرمائی صبحوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ کر آنکھیں بند کرلی جاتیں۔ اس عمل کے دوران کبھی ایک دو پل کے لئے آنکھیں کھولی بھی جاتی تھیں۔ جب آنکھیں بند رہتیں تو طرح طرح کے چمکیلے رنگوں میں سورج کا عکس ایک صورت متحرک میں میرے ذہن میں اُبھرتا تھا، کبھی سرخ، کبھی سبز اور کبھی فیروزی ... میں بادلوں کو ایک محویت کے عالم میں تادیر دیکھتا اور پھر اپنی انگشتِ شہادت کو فضاؤں میں آہستہ آہستہ گھُماتا ... داغ دھبّے کہیں بھی نظر آتے تھے۔ ان میں تلاشِ حُسن وجمال غیر ارادی طور پر کرتا تھا۔“

اپنی نامکمل خود نوشت میں صادقین نے اپنی ابتدائی ”انسپائریشنز“ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تحریریں اور ان کی تصویریں دونوں ہی اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ خود اپنے استاد تھے۔ انہوں نے کسی اُستادِ فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ خطوط، زاویئے اور دائرے انہیں کسی نے نہیں سکھائے، رنگوں کی آمیزش کا سلیقہ انہیں مصوری کے کسی اسکول میں تعلیم نہیں کیا گیا۔ وہ ایک خودرو پودا تھے جو دیکھتے دیکھتے ایک جھاڑ جھنکاڑ اور پھر ثمر بار برگ وبار پیڑ بن گیا۔

اُن کے تخلیقی وجود نے انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ جس ماحول اور جس گرد وپیش میں رہے، وہاں بنجر زمین تھی اور کیکٹس کے پودے تھے۔ زمین کی یہ ویرانی اور کیکٹس کے یہ پودے صادقین کی تصویروں میں بھی اُگ آئے۔ صفدر میر نے صادقین کی اُس عہد کی تصویروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”صادقین کی ابتدائی تصویروں میں کیکٹس کے پودوں سے ڈھکی ہوئی زمین، پاکستان کی اُس وقت کی صورتِ حال کا ایک علامتی اظہار ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اس علامت کا انتخاب شعوری طور پر کیا یا وہ اس باب میں غیر شعوری تھے، تاہم یہ انتخاب اس بات کا اظہار تھا کہ وہ خود اور ان کے ناظرین تاریخ کے اس دور میں اس نوعیت کی صورتِ حال سے گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کیکٹس اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ انسان بھی کیکٹس کی طرح ہے اور نہایت نامساعد حالات اور ناخوشگوار ماحول میں بھی پروان چڑھتا ہے، زندہ رہتا ہے۔ کیکٹس موت سے بغاوت اور فطرت کے تمام عناصر سے جنگ کی علامت ہے۔“

اور پھر یوں بھی ہے کہ جب بکھرے ہوئے اور اُجڑے ہوئے پاکستان پر بہار آئی تو صادقین کی تصویروں سے کیکٹس آہستہ آہستہ رخصت ہوگئے اور ان کی جگہ عورتوں اور مردوں کی تصویروں نے لے لی۔ صادقین خود جس قدر دھان پان تھے، اس کے برعکس ان کی تصویروں کے مرد اور عورتیں قوی الجثہ اور دیو ہیکل ہیں۔ ان کی بعض تصویریں دیکھ کر تو مجھے گمان گزرا کہ یہ شاید شاہنامۂ فردوسی کے وہ تنومند اور پیل تن کردار ہیں جو سیستان میں پائے جاتے تھے۔ ان کرداروں میں اور صادقین کی تصویروں میں فرق ہے تو اتنا کہ صادقین کے بنائے ہوئے انسانوں میں سے کہیں نہ کہیں کیکٹس کے خدوخال جھلکتے ہیں اور وہ اپنی نشست وبرخواست کے انداز میں محنت کی بیٹیاں اور بیٹے نظر آتے ہیں۔

بقول فیض صاحب ”صادقین نے اپنا موضوع اُن کو بنایا جو زندہ تھے اور بغاوت کرسکتے تھے، خود وہ بغاوت کتنی ہی غیر مؤثر کیوں نہ ہو۔ انہوں نے اپنی تصویروں کا جو سماج بنایا اس میں وہ لوگ ہیں جو درد سہتے ہیں، محروم اور مظلوم ہیں، یہ وہی ہیں جو محنت اور مشقت کرتے ہیں۔ اونٹ، بیل، لکڑی کا گٹھا اُٹھانے والا، پانی سے بھرا ہوا ڈول کھینچنے والی، کیکٹس کے پودے، پتھر کے نیچے دبی ہوئی اور پھر بھی نمو پاتی ہوئی جڑ۔ ان کے یہاں گلیوں اور کوچوں کے، شہروں اور بستیوں کے، عورتوں اور مردوں کے ڈھانچے ہیں۔

ان کی تصویروں میں سرکٹے ہیں، تکلے پانیاں ہیں، رُوگیا بیتیاں ہیں۔ زنجیریں، بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ہیں۔ عورتیں ہیں کاندھوں میں گھڑی ہوئی، مرد ہیں جن کے ہاتھوں میں نیزے ہیں، پھاوڑے ہیں۔ صادقین نے انسان کے عذاب کینوس پر کا غذ اور کھال پر، سنگِ مرمر اور دیوار پر اُتارے۔ ان کا انسان کسی ایک زمین یا زمانے سے وابستہ نہیں۔ وہ تو بس انسان ہے۔ وہ کسی بھی علاقے کا اور کسی

(ڈاکٹر) سلمان عباسی
(لکھنؤ۔ بھارت)

صادقین

"جو بند تھا بوتل میں وہ جن بول رہا ہے"

جو کچھ ہے۔ بالکل غلط۔

سب جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ سفید جھوٹ....

لاحول ولاقوت۔

یہ کوئی لکھنؤ ہے۔ اس کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا گیا۔ سب جھوٹ۔

کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے۔ سب غلط۔ ارے صاحب اگر یہی لکھنؤ ہے تو لعنت ہے اس شہر پر۔ کیسے کیسے دل فریب واقعات سنے تھے یہاں کے خلوص اور اخلاق کے تعلق سے۔

گہوارۂ تہذیب و تمدن۔ شہرِ نگاراں۔ مرکزِ ہنرمنداں۔ شہرِ دوستاں۔ شہر... لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب فریب۔ بالکل فریب۔ جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔

پرسوں سے میں اس شہر میں آیا ہوا ہوں۔ قسم کھانے کو ایک آدمی بھی نہ ملا۔ فن شناس تو فن شناس۔ کوئی خود شناس تک نظر نہ آیا۔ لال بارہ دری کا ہال میرے "جگر پاروں" کا قبرستان بنا ہوا ہے۔ جہاں نہ کوئی میرے آرٹ کی قبر پر آنسو بہانے والا ہے اور نہ کوئی میری اشک شوئی کرنے والا فن۔ اور فن پاروں کی داد دینے والے تو درکنار...

انہیں سمجھنے والے تو الگ رہے۔ سمجھنے کی کوشش کرنے والا بھی کوئی نہیں۔

کیا یہی واجد علی شاہ کا اودھ ہے۔ مہاراجہ امیر حسن خاں کا یہی شہر ہے؟

بندادین اور کالکا کی حویلی اسی لکھنؤ میں تھی۔ شمبھو مہاراج، سخاوت خاں، طلعت محمود، نوشاد اور استاد بنن کا یہی وطن ہے۔؟؟

صفی، ثاقب، جلال، اسیر، یگانہ، چکبست، جوش، مجاز، اثر، سراج اور نیاز فتحپوری کا لکھنؤ اگر یہی ہے تو حیرت ہے۔ منشی شمس الدین "اعجاز رقم" کیا یہاں بھاڑ جھونکتے تھے۔؟؟

میں تو یہاں آکر پچھتایا۔ اب اگر زندگی رہی تو پھر کبھی یہاں آنے کا ارادہ نہ کروں گا۔ اتنا رُوکھا، پھیکا اور خشک شہر تو مجھے سعودی عرب کے ریگزاروں میں بھی کہیں نظر نہیں آیا۔

غلافِ کعبہ پر آیات کا ڈیزائن کرنے کے عوض مجھے شاہ خالد نے پانچ لاکھ ریال کا چیک بطور نذرانہ پیش کیا جسے میں نے شکریے کے ساتھ انہیں واپس کر دیا۔ اللہ نے مجھے بڑی دولتوں سے نوازا ہے۔ میں ٹھہرا فقیر دودی۔ کیا کرتا اتنے بہت سے پیسوں کا۔؟

مجھے اپنے وطن پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر طرح طرح سے نوازا گیا۔ ان کی نوازشوں کا بہت بہت شکریہ۔ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

میری خوش قسمتی ہے کہ یورپی، افریقی اور ایشیائی تمام خطوں کی حکومتوں اور عوام نے دولت، عزت، شہرت اور اعترافات سے مجھے مالا مال کر دیا۔

صرف خلوص کے لالچ میں ہندوستان آیا۔ لیکن لکھنو نے تو میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اب تک ایک آدمی بھی نہ ملا جسے آنکھ میں سُرمے کے طور پر لگا سکتا۔

ع: اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔ چلئے میر صاحب اپنی پگڑی سنبھالئے اور کسی دوسری جگہ کا رُخ کیجئے۔

یہ تھے "صادقین" جنہیں میں نے پہلی بار ۲۴ جون ۱۹۸۲ء کو دیکھا۔ سنا اور انکا مزاج آشنا ہوا۔ اتنا بہت سا مواد انہیں سمجھنے کے لئے بہت کافی تھا۔ بلکہ کافی سے بھی کچھ زیادہ۔

کل ہی لال بارہ دری قیصر باغ کے ہال میں "اسٹیٹ للت کلا اکاڈمی" کے زیر اہتمام ان کے نوشتوں اور طغروں کی نمائش کا افتتاح ہوا تھا۔ عام لوگوں کی طرح اخباروں میں اس کی چھوٹی سی خبر میں نے بھی دیکھی تھی۔ پہلے تو سمجھ میں یہی آیا کہ کوئی ——— صادقین صاحب ہوں گے جو فن مصوری سے تھوڑا بہت شغف رکھتے ہوں گے اور کسی منسٹر یا بڑے سرکاری عہدیدار سے سفارش در سفارش کروا کے "قابل نمائش" بن گئے ہوں گے۔ لیکن جب دو ایک دوستوں نے بتایا کہ "صاحب نمائش" کوئی "صادقین صاحب" نہیں بلکہ صرف "صادقین" ہیں تو مجھے یہ سن کر سخت افسوس اور دلی صدمہ ہوا کہ ناعاقبت اندیشوں نے اس "معصوم" کو کتنی سفاکی اور چابک دستی کے ساتھ قتل کیا ہے اور پھر معاملہ یہیں تک نہیں بلکہ ع

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

ایک ہی تیر میں دو شکار۔ سرکار چت اور صادقین پٹ

میں صادقین کے اس طویل اور درد انگیز تبصرے کو خاموشی سے سنتا رہا اور حسب ضرورت ان کی ہاں میں ہاں بھی ملاتا گیا۔ بعض جملوں پر جواب دینے کو بھی جی چاہا لیکن قطع کلام سے گریز کرتا رہا۔ مجھے ان کے الفاظ سے زیادہ ان لفظوں کے مفاہیم و معانی کے پس منظر میں اس صادقین کی بنتی بگڑتی تصویریں دکھائی دے رہی تھیں جس کے اندر کا فنکار اپنے ازلی کرب کا مظہر بن کر اس طویل مگر مبسوط تبصرے کی شکل میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس عالمی شہرت یافتہ فنکار کی لکھنو آمد اور اس کے فن پاروں کی نمائش کی نہ تو مناسب تشہیر ہی کی گئی اور نہ قدر دانوں کو کسی ذریعہ سے اطلاع پہنچانے کی کوشش ہوئی۔ یہ ہماری "اسٹیٹ للت کلا اکیڈمی" کا کارنامہ تھا جس کے سبب صادقین دو دن تک ایک اجنبی کی طرح شہر کے گوشے گوشے میں "لکھنو" کو تلاش کرتے رہے لیکن ہر جگہ مایوسی ہاتھ آئی۔ ان کو ان کا "لکھنو" کہیں نہیں ملا اور جو لوگ ملے وہ ان کی اس طلب کا متبادل بھی انہیں فراہم نہ کر سکے۔

اسی سانحے کی تلافی کے لئے میں بے حد تلاش و جستجو کے بعد صبح ہوتے ہی ان کے کمرے پر پہنچ گیا۔ وہ کل سے آج تک تین قیام گاہیں تبدیل کر کے اب ایلورا ہوٹل میں مقیم تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ اب ان تک لکھنو کا

کوئی بد ذوق، بد اخلاق یا بدترین شخص نہ پہنچ سکے گا۔ لیکن ؏

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

کے مصداق میں ان کا تختۂ مشق بنا ان کے روبرو بیٹھا تھا۔ اور ان کا بیان جاری تھا۔

"تھو۔ آخ تھو۔ لعنت ہے لکھنو پر ......"

میں نے جسارت کر کے مداخلت کرتے ہوئے کہا" بھائی صادقین یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ تم لکھنو میں ہو۔"

"تو کیا میں کوفے میں ہوں اور یزید سے ہمکلام ہوں۔ مجھے بتاؤ چپ کیوں ہو گئے"

میں نے کہا" پیارے بھائی۔ میں تم سے زیادہ دکھی ہوں۔ یہ کہانی سُن کر۔ اور اس کی تھوڑی بہت تلافی کرنا چاہتا ہوں"۔

بولے کیا تلافی کرنا چاہتے ہو۔ کچھ کسر باقی رکھی ہے تم لوگوں نے مجھے ذلیل کرنے میں کیا!"

"میں تمہیں چند لمحوں کے لئے لکھنو لے چلوں گا۔ اور بس۔ پھر تم جانو اور تمہارا دوسروں سے سنا اور کتابوں میں پڑھا ہوا لکھنو جانے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے بھی لکھنو اور اہل لکھنو کی ان شطرنجی چالوں سے رغبت نہیں ہے۔ میں خود مضافاتی ہوں لیکن میرے آبا و اجداد نے لکھنو کی جن قدروں سے متأثر ہو کر اپنے وطن سے ہجرت کر کے اسے اپنا وطنِ ثانی بنایا تھا، وہ قدریں اب بھی سب کی سب۔ بالکل ویسی ہی محفوظ ہیں۔ صادقین صاحب یہ حقیقت ہے کہ تم نے لکھنو کے باشندوں کی اکثر جھلک تک نہیں دیکھی۔ تم مہاجرین کے نرغے میں گھرے ہوئے ہو۔ تم جہاں ہو وہاں سے دُوربین لگا لگا کر بھی دیکھو تو تمہیں لکھنو نظر نہیں آسکتا۔ لکھنو اب بھی وہی لکھنو ہے جس کے سامنے مصحفی نے "امروہے" کی طرف سے آنکھیں پھیری تھیں۔ چند لمحوں کو میرے ساتھ چلو لکھنو کی طرف۔ اگر تم بھی "امروہے" کو بھول نہ جاؤ تو مجھے جو جی میں آئے کہنا۔ لیکن اس سے پہلے لکھنو کو مت کہو سو' ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

صادقین نے کہا" میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔ لیکن شام ڈھلے۔ دیکھو میرا ایک "فین" ہے مقامی آرٹس کالج میں لکچرر ہے بڑا مخلص، عمدہ، پیارا اور خوبصورت نوجوان ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور پیاری اس کی بیوی ہے۔ دراصل عورت میری کمزوری ہے وہ لکڑی کی ہو، لوہے کی یا موم کی۔ میں نسوانی جمالیات سے بہت متأثر ہوں۔ انہیں لوگوں نے مجھے شام کو بلایا ہے اپنے یہاں۔ ان سے باتیں کروں گا اور پھر کھانا بھی وہیں کھاؤں گا۔ بعد میں تمہارے ساتھ چلو نگا!"

میں نے پہلے اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو صادقین کے اندر کا فنکار جو کافی دیر سے اول فول بک کر اور لکھنو والوں کو گالیاں دے کر اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا فوراً پینترا بدل کر بولا" دیکھو مجھے عورتیں بہت پسند ہیں جوان عورتوں کا کہنا ہی کیا اور اگر خوبصورت بھی ہوں تو ... ؏ "چاندی کا ورق لگا کے منھ چومتا ہوں"۔ (شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ)۔ میں اتمام حجت کے طور پر یہ شام کا وعدہ لے کر چلا آیا۔

شام کو جب ہوٹل پہونچا تو یہ حضرت مجھے داؤ دے کر پہلے ہی نکل لئے تھے۔ میرا خون کھول گیا۔ سید صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر چل دیا۔ آرٹس کالج۔ چونکہ میں کالج میں بھی اجنبی نہیں تھا۔ میں نے ایک نامعتبر دوست کی مدد حاصل کی اور ان کے "فین" کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ عجیب و غریب تضاد آمیز ماحول تھا۔ صادقین کی شخصیت۔ بوتل، پوری، سبزی، اچار، چٹنی

پینٹنگ اور بے ربط گفتگو کا سلسلہ۔ میں چکرا گیا۔ صادقین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ لوگ صرف اُن کے فین تھے ــــ اور بس۔

مجھے دیکھ کر صادقین نے کہا" تم یہاں بھی آ گئے"۔

میں نے کہا اکیلا نہیں ایک مزدور بھی ساتھ ہے۔ میں نے اپنے نامعتبر دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بولے "یہ کس لئے ؟"

میں نے کہا" صادقین کو لکھنؤ لے چلنے کے لئے"۔

کہنے لگے "اب میں نہ جاؤں گا۔ مجھے لکھنؤ مل گیا"۔

"چلنا تو ہوگا۔ ورنہ میں اپنے مہمانوں کو کیا جواب دوں گا جو نہ جانے کب سے میرے گھر پر آپ کے منتظر ہیں"۔

بولے اگر نہ جاؤں تو۔ ۔ ۔"

میں نے کہا" اگر آسانی سے کام نہ چلا تو بورے میں بھر کر لے چلوں گا"۔

میرے خلوص کو ضد میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھ کر انہوں نے اپنے میزبانوں سے رخصت مانگی لیکن آہیں طول کھینچ گئیں۔ گھڑی کی سوئی رات کے نو سے دس اور دس سے آگے بڑھنے لگی تو میری تشویش میں اضافہ ہوا۔ سوا دس بجے ہم لوگ کسی طرح کالج کے باہر آئے تو سواری غائب۔ سواری کہاں سے آتی یہ کوئی لکھنؤ کا آباد حصہ تو تھا نہیں۔ لکھنؤ تو یہاں سے خاصہ دُور تھا اور صادقین کا لکھنؤ تو کوسوں دُور، درمیان میں گومتی ندی کا پُل جو لکھنؤ "کو لکھنؤ سے ملانے کا مقدس فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس وقت وہ بھی ایک خاموش تماشائی کی طرح بے جان اور بے سکت۔ مگر بدگمان مہمان کی غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے اس کے "بے راہ رو قدموں" سے ایک چھاتی رَوندا نے لے گئے ہمہ تن انتظار و اشتیاق۔

سواری کے انتظار کے بجائے" پیش قدمی" کی تجویز پر ہم دونوں متفق ہو گئے۔ پل پار کرتے ہی ایک سائیکل رکشہ نظر آیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اور صادقین نے چیخ کر اسے روکا۔ رکشہ والا ایک بوڑھا سا نحیف و نحیف دیہاتی شخص تھا۔ میں نے پوچھا نیا گاؤں چلو گے۔ اس نے رکشہ کی گدی پر زور سے ہاتھ مار کر اسے ہاتھ ہی سے صاف کرتے ہوئے ہم لوگوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا" پیسے بتاؤ"۔ کہنے لگا "جو جی چاہے دے دیجئے گا۔ آپ کا رکشہ ہے بیٹھ جائیے" صادقین نے ایک سرد آہ کھینچی اور رکشہ پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ۔ ۔

"اماں یہ بڈھا نشے میں ہے کیا؟"

میں نے سینہ پھلا کر جواب دیا" لکھنویت کے نشے میں چور ہے۔ اسی لئے اسے پیسوں کی بھی فکر نہیں"۔

بوڑھا آدمی حسب استقامت دھیرے دھیرے رکشہ کھینچتا رہا اور میں راستے کی عمارات کا ان سے تعارف کراتا رہا۔ بیگم حضرت محل پارک، سعادت علی خاں کا مقبرہ، سفید بارہ دری، محمود آباد پیلس، امیر الدولہ پبلک لائبریری، قیصر باغ سرکس اور پھر لاٹوش روڈ کی دو رویہ عمارتوں کے درمیان سے گزر کر نیا گاؤں۔ مجھے نیا گاؤں کی کراسنگ پر ہی ایک چھوٹا سا مجمع نظر آیا۔ قریب آکر میرا شک یقین میں تبدیل ہوگیا۔ یہ سب صادقین کے میزبان اور ان کے صحیح معنوں میں" فین" تھے۔ جنہیں میں نے وقت کی تنگی کے باوجود مجتمع کرنے میں کامیابی

حاصل کرلی تھی۔

جو لوگ سامنے نظر آئے ان میں میرے برادرِ محترم عرفان عباسی، ایک قدیم لکھنوی باشندے شبیر احمد علّن صاحب، مشہور معالج ڈاکٹر غلام ربانی خاں، نوجوان شاعر نفیس رودالی، حبیب فکری، ______ اودھ کی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ حفیظ سلمانی، طنزیہ اور مزاحیہ شاعر مشر لکھنوی اور نہ جانے کون کون۔ سب کے سب صادقین سے اس طرح چمٹ گئے۔ جیسے بھڑیں اپنے چھتے سے چمٹی ہوتی ہیں۔ سب کی زبان پر بس ایک شکوہ کہ شام سے انتظار کرتے کرتے نہ جانے کتنے دلدادگان صادقین مایوس ہوکر واپس چلے گئے۔ جلسہ گاہ ویران ہوچکی تھی۔ میں نے نظر پُرا کر دیکھا۔ صادقین کے چہرے پر اب اضطراب کے بجائے طمانیت کے آثار جھلک رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری بات رکھ لی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے اس لئے "ادارہ اُردو سماج" کے ذمہ داروں نے آپس میں طے کیا کہ اس مختصر مجمع کو دیکھتے ہوئے اب جلسہ گاہ دوبارہ آراستہ کرنے سے زیادہ مناسب ہے کہ ہم لوگ ڈاکٹر خان کے ہال میں بیٹھ کر صادقین سے ان کا زیادہ سے زیادہ کلام سنیں۔ اور بس۔ اس نشست گاہ کے باہر موجود باذوق خواتین کا بھی اصرار تھا کہ اب صرف صادقین کا کلام ہی مناسب ہے (ان بیچاریوں کو کیا معلوم تھا کہ انہیں کیا کیا سننا پڑے گا۔)

بہر حال۔ سب کے اصرار، فرمائش اور میری پے در پے درخواستوں کو صادقین کی گفتگو کا لامتناہی سلسلہ نظر انداز نہ کرسکا۔ آخر وہ گردن جھٹک کر گویا ہوئے۔ رباعی

میں نے تختی جگہ خالی تو لکھیں آیات
دیکھیں لٹیں جب کالی تو لکھیں آیات
آیات کو دیکھا تو بنائے مکھڑے
مکھڑوں پہ نظر ڈالی تو لکھیں آیات

ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ دس۔ بیس۔ پچاس۔ سو۔ ڈیڑھ سو۔ میں شمار کرتے کرتے بھول گیا۔ اور وہ اپنے والہانہ انداز میں جھوم جھوم کر اور خود اپنی رباعیوں سے لطف لے لے کر سناتے رہے۔ ان کے سامعین بلکہ "نیم" محو حیرت تھے کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی اور صادقین کی رباعیاں کسی غنیم کے لشکر کی طرح اُمنڈتی چلی آرہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جذبات و محسوسات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں اُن کے سامعین تنکوں کی طرح بہتے چلے جارہے ہیں۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ مکرر ارشاد کی تکرار بھی ان کے لہجے کی روانی اور آہنگ کی دھمک میں بے صوت و صدا ہوکر رہ گئی تھی۔

مجھ پر خود اس قدر رقت طاری تھی کہ حیرت کا مجسمہ بنا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس شخص نے تو پورا "دیوانِ غالب" مرتب کردیا۔ کوئی موضوع چھوڑا ہی نہیں اور کہیں کسی موضوع کی تکرار بھی نہیں۔ عجیب و غریب معاملہ ہے۔ وہ بھی یہی صادقین ہیں جن کے فن پاروں کی نمائش میں "بسم اللہ شریف" اور "سورہ رحمٰن" کے سیکڑوں کتبے، طغرے اور عکاسیوں کے ایمان افروز نمونے موجود رہتے۔ اور یہ بھی وہی صادقین ہیں۔ جو کل سے اپنی "جناتِ مزاجی" کا مظاہرہ کر کے لکھنو والوں کو کوس رہے تھے اور میں ان کے ہمزاد کی طرح ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت یہ تیسرے صادقین تھے جن کی رباعیوں پر اُردو کے بعض قابلِ قدر اساتذہ کا کلام نچھاور کردینے کو جی چاہ رہا تھا۔ ایک دُبلے پتلے، نحیف و نزار

اور منحنی سے شخص میں اللہ میاں نے کتنی شخصیتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔ میں کافی دیر سے اسی فکر میں غرق تھا۔ صادقین کے خاموش ہو جانے سے چونک پڑا۔ سبھی کا اصرار تھا ابھی کچھ اور سنائیے۔ لیکن اب وہ بیزار ہو چکے تھے۔ گو اُٹھ جانے پر انہیں راضی کرنا بڑا دشوار کام تھا۔ پھر رات بھی تین پہر ڈھل چکی تھی۔ حاضرین کی جماہیوں کو تو چائے پی گئی تھی لیکن صادقین کی صبوحی ان کے لئے بے قرار تھی اور سنانے کا اصرار کرنے والوں سے انہیں نجات دلانے کی میں نے وکالت کرتے ہوئے عذر پیش کیا کہ یہ بے چارے صبح سے گردش میں ہیں اور اب انہیں آرام چاہیئے لیکن ع "دل کو تھا چین تو نیند آ گئی انگاروں پر" جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے مجھے زور سے ڈانٹا "چپ رہو۔ مجھے آرام تو مل رہا ہے اور کیسا ہوتا ہے آرام"
یہ کہہ کر وہ پھر شروع ہو گئے اور دس بارہ رباعیاں جو اتنی دیر میں یاد آ گئیں مجھ پر سنا ڈالیں۔ اور آخر تھک کر گردن ڈال دی۔ لوگوں نے آٹوگراف کی فرمائشیں کیں تو بولے "میں کوئی شخصیت نہیں۔ میں کوئی بڑا آدمی نہیں۔ ہاں آٹوگراف لینا ہے تو کسی فلم کے ایکٹر سے لو۔ میرے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ میں تو خود اپنے لئے آٹوگراف ہوں۔ آٹوگراف، دست خط۔ پہچان، جو چاہو سمجھ لو۔"
میں نے اپنی ڈائری پیش کی اور ایک رباعی تحریر کرنے کی درخواست کی۔ پہلے تھوڑی دیر تک ہونٹ چبا چبا کر ہوں، ہاں کی آوازیں نکالتے رہے پھر بولے "تم کو میں تمہاری محنت کی اجرت ضرور دوں گا۔ تم ایک نیک اور مخلص انسان ہو۔ تم نے ایک تشنۂ لکھنؤ کو اس کی دردوس منزل تک پہنچانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے میں ایک نہیں دو رباعیاں لکھ کر دوں گا۔" انہوں نے اپنی صدری کی خفیہ جیب سے سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا ڈنڈا نکال کر مجھے مارنے کے انداز میں دکھا دکھا کر کہا۔ میں سمجھا واقعی پٹائی کریں گے لیکن ڈھکن کھلنے پر معلوم ہوا کہ دراصل یہ انہیں کی طرح ان کا غیر معمولی قسم کا قلم تھا۔ قلم نہیں بلکہ ... اور پھر چشم زدن میں ڈائری کے اوراق پر دو رباعیاں رقم تھیں۔ دونوں رباعیاں چندے آفتاب و چندے ماہتاب آپ بھی ملاحظہ کریں۔

اب دوسرا مرحلہ ان کی واپسی کا تھا۔ دشواری یہ تھی کہ تمام حاضرین انہیں ان کی قیام گاہ تک پہنچانے کے اور صادقین ان کو واپس کرنے پر مصر۔ اس مخلصانہ نبرد آزمائی میں پسپائی پر آمادہ صادقین نے یہ کہہ کر سبقت حاصل کر لی کہ لکھنؤ والوں میں تمہارے خلوص کو بھر پایا۔ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں ان شاءاللہ کل پھر آؤں گا۔ اس موہوم سے دلاسے پر لوگوں نے انہیں وہیں خیرباد کہہ کر رخصت کیا۔ صرف میں انہیں ہوٹل تک پہنچانے کے لئے ساتھ گیا۔ راستے میں ان کے مبہم وعدہ کو پختہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کل پھر ہم لوگ ملیں گے اور صادقین کی ان لوگوں سے پھر ملاقات ہو گی۔ جنہیں وہ تشنہ چھوڑ کر چلے آئے ہیں نیز انہیں بھی ان کی زیارت کا موقع مل جائے گا جو شام سے انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ اس وقت رات کا آخری پہر تھا۔ تین بج رہے تھے۔ صادقین نے ہوٹل کی سیڑھیوں سے مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا خدا حافظ۔ گیارہ بجے دن تک ضرور ملنا۔ میں شدت سے انتظار کروں گا۔ اور جب تک تم آ نہیں جاؤ گے میں کہیں جاؤں گا نہیں۔" میں خدا حافظ کہہ کر واپس آ گیا۔
۲۵ جون ۱۹۸۲ء کو گیارہ بجے دن میں، میں ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو چار بجے صبح ہی کمرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ سارا دن ان کی جستجو میں شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ان کے سارے ملاقاتیوں سے پتا لگانے کی کوشش کی

شیخ عزیز

صادقین: آج کا پرومیتھیوس

کسی تخلیق کار کے لئے کوئی بھی شہر، بستی یا قصبہ بڑا نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی علاقے سے وابستگی اس کی تخلیق کے لئے محرک ہوتی ہے۔ تاہم یہ تصور ہمارے ہاں زہر کی حد تک سرایت کر چکا ہے کہ بڑا فنکار بننے کے لئے بڑے شہروں میں رہنا ضروری ہے۔ نہ جانے صادقین کو اس بات کا احساس تھا یا محض اس کو جھٹلانے کے لئے یہ بات بار بار کہتا تھا کہ میری کوئی زمین نہیں اسی لئے زمین کا ہر شہر ہر بستی میری ہے غالباً اس کی بات کا کینوس ہماری سوچ سے کہیں بڑا ہے۔

صادقین چلا گیا۔ بستی بستی نگر نگر پھرنے والا مسافر چلا گیا۔ وہ بنجارہ جس کے پاس لینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ صرف دینے کیلئے تھا۔

صادقین انوکھا نابغہ تھا۔ اس لئے انوکھا نہ تھا کہ اس نے مصوری اور خطاطی کا DISCIPLINE اپنایا تھا بلکہ اس لئے کہ اس نے اس میدان میں ایسی نئی راہیں دکھائی تھیں کہ شاید ہی اس سے پہلے کوئی وہاں سے گزرا ہو۔

صادقین، مصور تھا، مجسمہ ساز، خطاط تھا یا مصوری خطاطی کا اسلوب نگار تھا یا شاعر اس کے درمیان امتیاز کا خط کھینچنا سب سے مشکل عمل ہوگا۔ غالباً یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ مختلف پتھروں کا ایک ایسا مجسمہ تھا جس کے ہر پہلو دیکھنے سے ایک نیا رُخ روشن ہوتا ہے۔ اس نے جس شعبے میں بھی قدم اُٹھایا اس میں اپنا اسلوب دیا۔ حتیٰ کہ اس میں پرفیکشن اختیار کر لی۔

صادقین نے، نصف صدی قبل، ایک خطاط خاندان میں آنکھ کھولی۔ گویا اس کی پہلی نظر فنون کے ایسے شعبے پر پڑی جس میں توازن، فارمیٹ اور آہنگ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اس کا ذاتی رجحان مصوری اور مجسمہ سازی کی طرف ہی تھا۔

فنکار کے طور پر صادقین کی زندگی ایک اہم دور میں پروان چڑھی۔ اس نے جب برش اُٹھایا تو پاکستان سمیت پوری دنیا میں رئیلزم کے بت ٹوٹ رہے تھے۔ اڈالی، اسٹینوفسن اور پکاسو نے دنیائے فن کو کیوبزم اور سوریلزم سے ہلا کر رکھ دیا۔ مصوری کے محققین اور مؤرخین اس امر کا تعین نہیں کر پا رہے تھے کہ فنون کے ایسے سنگم میں وہ کس کی طرف جھکیں اور بعض ناقدین فن دہ ہزتوان رجحانات پر سخت نکتہ چینی کر رہے تھے۔

یہ دور اس قدر انقلاب انگیز تھا کہ مائیکل اینجلو اور روبن جیسے ماسٹرز سے لے کر اب تک ایسا رجحان کبھی نظر نہیں آیا تھا کہ روسی مصور بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

پاکستان جہاں فنون لطیفہ خصوصاً مصوری اور مجسمہ سازی ابھی تک روایتی بندھنوں سے جان نہیں چھڑا سکی تھی اس کے کینوس اور بورڈ بھی متزلزل ہو رہے تھے۔ تھیم (THEME) فارم FARM اور PERSPECTIVE تینوں عناصر کی ہیئت تبدیل ہو رہی تھی۔

نوآموز مصوروں کا مشاہدہ اور تجربہ مجموعی عالمی نفسیات سے قریب تر تھا روایت پرستی میں گھٹن محسوس کر رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہمارے پاس فنون لطیفہ کے تمام شعبوں میں نو وارد فنکار نئے تجربوں کے ساتھ ساتھ سامنے آ رہے تھے۔ تردد و اتفاق کا عجیب تصادم تھا۔ روایت سے منہ پھیرنے اور بدلتی دنیا کے نئے ELEMENTS بڑے طاقتور طریقے سے نئے فنکاروں کی تخلیقات پر چھا رہے تھے۔

اس دور میں شاکر علی، حنیف رامے، احمد پرویز، زین العابدین، منصور راہی، بشیر مرزا، گل جی، جمیل نقش، آذر زوبی سب ہی اپنے اپنے

میدان میں دنیائے فن میں نئے نئے پھول کھلا رہے تھے۔ سب کے اپنے اپنے میڈیم تھے جن کا کسی بھی لحاظ سے ایک دوسرے سے موازنہ کرنا مشکل ہے تاہم ان میں ایک ایسا نام تھا جس کا نعم البدل اس جنریشن کے تمام فنکاروں میں ملنا مشکل تھا۔ اگرچہ شاکر علی اور گل جی نے پرسیپشن فارمیٹ، اور رنگوں کے انتخاب میں انقلابی قدم اٹھایا مگر جس بغاوت کا مظاہرہ صادقین نے کیا۔ وہ کسی کے حصہ میں نہ آئی۔ اس ضمن میں احمد پرویز کا نام آتا ہے مگر اس کا مکتب صادقین سے الگ ہے۔ وہ اپنے اسلوب کا ماسٹر تھا اور صادقین ایک بہت الگ فارم کا بانی تھا۔

اگر شاکر علی نے رنگوں سے سوز اور تحرک پیدا کیا تھا تو صادقین نے لائنیں اور رنگوں اور اناٹامی سے سینکڑوں تاثرات اپنے فن پاروں میں داخل کر دیئے تھے۔ اگر احمد پرویز نے کیوبسٹ فارم سے ایک کیفیت کو جنم دیا تھا تو صادقین نے اپنی فگرز FIGURES سے زندگی کی حرارت پیدا کی تھی۔

صادقین کی ایک خوبی اس کی اناٹامی ANATOMY ہے۔ غیر معمولی نئی اناٹامی استعمال کرنے سے عموماً تمام مصور احتراز کرتے ہیں۔ یہ ایسا عمل ہے جیسے موسیقی میں VIVADI کا استعمال۔ یعنی ایک سُر جس سے پوری کمپوزیشن خراب ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ماہرانہ ہاتھوں سے استعمال ہو تو اس سے حسن بڑھتا ہے۔ صادقین نے اجنبی اناٹامی کو اپنی لائن اور رنگوں سے ایسی موومنٹ دی کہ وہ تصویر کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کا حصہ بن جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے جب پہلی مرتبہ ان کا بڑا کام منگلا ڈیم کے میورل کی صورت میں آیا تو کئی ناقدینِ فن نے اس کی اناٹامی کو نکتۂ بحث بنایا مگر دھیرے دھیرے فلسفۂ حسن میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

صادقین نے آئل بھی کئے تو واٹر بھی۔ پینسل بھی کئے اور لائنیں بھی۔ اسکریپ کو لیبچ بھی کئے اور بالآخر شاعری اس کے ہر میڈیم میں ایک صادقین چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ وہ صادقین جس نے روایت کے تمام بت۔ توڑے ہے۔

کہتے ہیں جب ایک فنکار اپنے اندر REVISIONISM محسوس کرتا ہے تو وہ ایک نئے میڈیم کو تلاش کرتا ہے۔ تقریباً تمام بڑے تخلیق کاروں کی مثالیں ہیں۔ غالباً یہی وہ اندر کی URGE تھی کہ اس نے قرآنی آیات کی مصورانہ خطاطی شروع کر دی۔ وہ اس میدان میں نیا نہیں تھا۔ کم از کم اس سے پہلے طبع آزمائی کر چکا تھا۔

مگر جس حسن اور کمال پختگی سے صادقین نے یہ خطاطی کی وہ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ گل جی کے ہاں اسلوب دوسرا ہے۔ اس میں کبھی کبھار ٹھہراؤ بھی محسوس ہوتا ہے مگر صادقین کی خطاطی میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں۔ وہ مقصد کی ترجمانی ان کلمات میں فگرز کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس کے اظہار میں جستجو، تلاطم، آرزو اور محبت ہے۔ وہ ٹھہراؤ کا قائل نہیں۔ اس کے ہاں مسلسل تحرک ہے۔ دحریت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس خطاطی کو عام کینوس سے ہٹ کر اخباری صفحات کی زینت بنا کر پیش کرنے میں پہل بھی اسی اخبار نے کی۔ جب صادقین نے اس کے لئے مسدہ پینٹنگ بنائی)

اس خطاطی نے اسے ایک نیا زاویہ زندگی تو دیا۔ مگر ٹھہراؤ صادقین کی زندگی میں کبھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر پانے کی کوشش کی۔ اب کے اس نے شاعری کو میڈیم بنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک حساس اور زندگی کے معانی سے بھرا ہوا ایک نیا صادقین ہجوم میں کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ سر گزر رہے ہوتے شخص کو صادقین بن کر دیکھ رہا تھا۔ جس کے لئے عموماً وہ کہتا تھا کہ "یہ بھی رجعت پسندی کے خلاف ایک اجتہاد ہے۔" وہ ہماری دنیائے فن کا پرومیتھیوس تھا۔

صادقین کے فن پاروں کی نمائشیں پورے ملک میں ہوئیں۔ اس نے فن کی جو خدمت کی اس کے صلے میں اسے تمغۂ امتیاز بھی دیا گیا۔ مگر کیا صادقین اسی کے لائق تھا۔ صادقین پوری عمر رجعت پسندی اور جمود کے خلاف بغاوت پینٹ کرتا رہا۔ وہ انفرادی آزادی کا علمبردار اور برابری کا نقیب تھا۔ مگر ہماری سوسائٹی کے جاہلانہ نظام کا شکار ہونے سے بچ نہ سکا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں وہ کوئٹہ کے کیفے گرانڈ میں صرف چار آنے کی چائے کیلئے پریشان رہتا تھا۔ اور فن کے امین اسے پہچان نہ سکے تھے۔

توصیف احمد خاں

داتا نگر سے

بین الاقوامی شہرت کے حامل مصور خطاط، شاعر، اچھے انسان اور ہمارے ساڑھے پانچ دن کے دوست صادقین کراچی میں صرف ۵۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ انہوں نے اپنے پیچھے سوگواروں میں بیوی بچوں کے بجائے ہم سمیت صرف اپنے مداح دوست اور شناسا چھوڑے ہیں۔ صادقین نے شادی نہیں کی کیونکہ بقول ان کے ان کی تقریب عروسی ان کے فن سے نصف صدی قبل ہو گئی تھی جب وہ امروہہ کے آبائی امام باڑے کے در و دیوار پر سیاہی سے قرآنی آیات کی املیٰ سیدھی خطاطی کی کوشش کیا کرتے تھے۔

صدر مملکت سے لے کر ایک عام پڑھے لکھے شہری تک ہر ایک نے صادقین کے انتقال کی خبر بڑے دکھ سے سنی اور بلاشبہ محسوس کیا کہ پاکستان ایک عظیم سرمائے سے محروم ہو گیا جس کا بدل ملنا ممکن نہیں۔ ہم نے ان کی موت کی خبر ریڈیو پر سنی۔ پہلا ردعمل صرف یہ تھا کہ انہوں نے مرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ ۵۰ سال بڑے ہوتے ہیں کیونکہ جس نوعیت کی زندگی وہ سالہا سال سے گزار رہے تھے اس کے مطابق انہیں بہت پہلے اللہ کو پیارا ہو جانا چاہئے تھا۔ کام، کام اور صرف کام، چائے، پانی، دوستوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش، غذا نام کی چیز صرف نام کی خاطر استعمال کرتے۔ ہر دم یہ فکر رہتی کہ فلاں کام نامکمل ہے۔ اور وقت نہ جانے کیوں اتنا کم ہو جاتا ہے۔ منٹ سیکنڈوں میں گزر جاتے ہیں۔ وہ وقت کی تنگی کے بڑے شاکی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چار پانچ گھنٹے سے زائد نیند لینے کے لئے تیار نہ ہوتے۔

مرغ کی بانگ سے پہلے وہ بستر سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے تھے اور پھر وہ ہوتے اور ان کے معمول۔ جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا کہ وہ ہمارے ساڑھے پانچ دن کے دوست تھے۔ ہوا یوں کہ چار، پانچ سال قبل ایڈیٹر صاحب کا فون آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ صادقین لاہور میں ہے۔ جی پتہ نہیں معلوم کر لیتا ہوں۔ انہوں نے ہماری بات سنے بغیر حکم جاری کیا۔ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ان سے ملئے اور ہر صورت اور ہر قیمت پر یوم عاشور پر "حریت" کے لئے ان سے ٹائٹل بنوائیے اور بھجوائیے۔ یہ کام ہر صورت میں ہونا چاہئے۔ انہوں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

ہم نے اتہ پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سی ایس پی اکیڈمی کے کمرہ نمبر ۱۲ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں گئے تو صادقین کو دوستوں اور مداحوں کے ہجوم جن میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں پایا۔

ہم نے اپنا تعارف کرایا اور قالین کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے پوچھا کوئی جلدی تو نہیں۔ گھڑی دیکھی گیارہ بج رہے تھے رات کے۔ جواب دیا جی بالکل نہیں۔ صادقین قالین کے مرکز میں رات ڈھائی بجے تک گپ شپ کرتے اور چائے کی پیالی میں پانی پیتے رہے۔ کئی مرتبہ اٹھنے کی سوچی لیکن ایڈیٹر صاحب کی شکل سامنے آجاتی اور ہم گل محمد کی طرح بیٹھ جاتے۔

جب چند آدمی رہ گئے تو انہوں نے پوچھا کہ برخوردار "مدعا" کیا ہے اور اتنے صبر سے کیوں بیٹھے ہو؟ بولو بھئی لیٹ نائٹ لوگ اچھے لگتے ہیں۔ حوصلہ بڑھا اور عرض حال کر ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ کل علی الصبح آ جانا تمہارا کام کر دوں گا۔ ویسے بھی تم ادبی خاندان سے ہو۔ ان کا احترام ہے۔ ان کا مطلب بہن خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور تھا۔

سو دوسرے دن ٹھیک نو بجے اکیڈمی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمارا انتظار کر کے چلے گئے اور کہہ گئے ہیں کہ ہم ان کا انتظار کریں۔ انتظار بڑا طویل تھا کوئی ساڑھے بارہ بجے آئے۔ سیاہ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ شفاف کرتہ پاجامہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ توصیف میاں معاف کرنا کچھ دیر ہوگئی۔ ارے کھڑے کیوں ہو گئے بیٹھو۔ اور ہم بیٹھ گئے کرسی پہ۔ صادقین نے شیروانی اتاری پلنگ پر پھینکی قالین پر براجمان ہوئے اور اپنے ذاتی ملازم جس کو وہ دوست کہتے تھے مخاطب کیا۔ جٹیا کپ لاؤ ذرا ان سے نشست لوں۔

ہم کرسی سے نیچے اتر کر قالین پر آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں آرام محسوس کرو وہیں بیٹھو۔ تکلف نہ کرو۔ میں تین چار دن بعد پہلی مرتبہ ۳۵ سال بعد انڈیا جا رہا ہوں۔ وہاں تو دنیا بدل گئی ہوگی۔ میں بڑا اکسائیٹڈ ہوں۔ مگر بے فکر رہو۔ جانے سے قبل ہر صورت میں حریت کا یوم عاشور کا ٹائیٹل بنا کر جاؤں گا۔ فی الحال تم کچھ کھا لو۔ پوچھا آپ؟ بولے ابھی نہیں۔ ہم ؟ اڑ گئے تو ساتھ کھائیں گے۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق۔ ۔ ۔ انگوٹھا عینک کے دونوں شیشوں کے درمیان رکھ کر عینک صحیح جگہ فٹ کی اور غور سے ہماری شکل دیکھی مسکرائے ٹھیک ہے۔ انتظار کرو۔

اس وقت ان کا خادم اور ہم دو فرد تھے سوا انتظار حسین سے لے کر کرشن چندر تک بات ہوئی مگر حریت کے ٹائیٹل کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ ہم کو محسوس ہوا کہ وہ ہمارے صبر کا امتحان لے رہے ہیں۔ اس لئے ہم بھی ان سے اپنی سمجھ اور علم کے مطابق باتیں کرتے رہے۔ بیشتر وقت وہ بولتے اور ہم سنتے۔ یہ سلسلہ ہر روز صبح شروع ہوتا اور رات گئے ختم ہوتا۔

ویزا لے کر آئے تو شیروانی پلنگ پہ اور خود قالین پہ۔ ارے خان کیا بتاؤں ٹکٹ وغیرہ کے مسائل تو حل ہو گئے۔ ویزا بھی مل گیا۔ ایسا ویزا بھارتی حکومت نے شاید کسی کو نہ دیا ہو پڑھو انہوں نے پاسپورٹ ہمارے حوالے کیا۔ جس پر درج تھا۔ "صادقین جتنی تصاویر لے جانا چاہتے ہیں ان کو اجازت ہے۔ جہاں چاہیں جائیں اور جہاں چاہیں ان کی نمائش کریں۔ انہیں کسی پولیس رپورٹ کی ضرورت نہیں۔ وہ وی آئی پی ہیں"

صادقین بڑے خوش تھے۔ میں امروہہ جاؤں گا۔ یوم عاشور وہیں مناؤں گا۔ دیکھو ذرا کی ذرا کتنے بڑے بڑے اور عجیب اتفاقات ہو رہے ہیں۔ ان دنوں۔ اب دیکھو جس دن میری بھارت روانگی ہے۔ اسی دن صدر مملکت ضیاء الحق اکیڈمی میں شاید صد سالہ تقریب کے سلسلے میں آ رہے ہیں۔ میری روانگی دس بجے ان کی آمد گیارہ بجے۔ ادھر سے یہ فقیر اپنی تصویروں کے ساتھ جا رہا ہو گا اور ادھر صدر مملکت اپنی سیاہ لمبی کاریں آ رہے ہوں گے اور۔ ۔ مگر اس تصویر کا کیا بنے گا؟

پوچھا جی کون سی تصویر۔ ارے بھئی علامہ اقبال کا پورٹریٹ بنایا تھا۔ وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج کے پرنسپل لینے آئیں گے۔ وہ بہت بڑی ہے۔ میں نے تحفہ کے طور پر دی ہے۔ وہ پہنچانی ضرور ہے۔ ہم نے کہا فکر نہ کریں۔ صدر کی سیکورٹی کی فکر نہ کریں تصویر پہنچ جائے گی۔

چند ٹیلی فون کئے تو معلوم ہوا کہ پرنسپل صاحب اور وائس پرنسپل مصروف ہیں کسی میٹنگ میں اپنا نمائندہ بھیج دیں گے تصویریں کے حوالے کر دی جائے لاحول پڑھی سوا گلے دن ایک عام ڈاکٹر صاحب آئے بولے تصویر کیسے لے جائیں۔ وہ تو بڑی بہت ہے۔ ہم نے تجویز کیا کہ ریڑھے والے آئیں مگر خود بھی حماقت کا احساس ہوا کہ مال روڈ پہ گھوڑا چلنے پہ پابندی ہے اور پھر جب صدر مملکت آ رہے ہوں تو۔ ۔ ۔ آپ خود مسئلے کی اہمیت کا اندازہ لگا چکے ہوں گے۔

اپنا سیکورٹی کارڈ دکھا دکھا کر پولیس افسروں پہ اثر ڈالا اور لیں ایک عدد گھوڑے والا ریڑھا اور اس پہ علامہ اقبال کی قد آدم تصویر جو ڈیڑھ ماہ دن رات لگا کر صادقین نے تیار کی تھی اس پہ سوار کی اور یوں ایک طرف تصویر علامہ اقبال میڈیکل کالج اور صادقین ہوائی اڈے کی جانب روانہ ہوئے اور۔ ۔ ۔ اور۔ ۔ ۔ ہم اپنے دفتر کی جانب بغل میں حریت کا یوم عاشور کا ٹائیٹل دبائے جس کا فنشنگ ٹچ انہوں نے صبح چھ بجے دینا شروع کیا تھا۔ اس ٹائیٹل کے سلسلے میں جب ہم قطعی طور پر مایوس ہو چکے تھے۔

اشاروں کنایوں میں بات کہی یہ ان کو فکر تھی تو اپنی تصاویر اور صدر مملکت کی آمد اور فقیر کی روانگی اور اقبال کی تصویر کی۔ حرمت کا ٹائیٹل کہیں ان کے کینوس میں نہیں آ تا تھا۔ یہ ان چار پانچ دنوں میں ایک فرق پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہم کو انہوں کی طرح ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ اور ہماری سننے بھی لگے تھے۔ کیسے رپورٹر ہو۔ ایک ریڑھا گھوڑے سمیت نہیں آ سکتا۔ یہ علامہ اقبال میڈیکل کالج کے بچے بچیوں کے لئے ہے۔ اسے ہر صورت پہنچنا چاہیئے۔ آج خیال آتا ہے تو عجیب سا لگتا ہے۔ انہیں بچوں کو تحفہ دینے کی کتنی فکر تھی۔

انہوں نے ایک دن قبل ہم سے کاغذ دو پنسلیں اور چھ عدد مار کر لانے کو کہا جو ہم نولکھا مارکیٹ کی مدد سے مشکل سے آدھ گھنٹے میں لے آئے۔ انہوں نے کہا کوئیک سروس؟ عرض کیا کیا غرض۔ وہ مسکرائے عینک ناک پر فٹ کی۔ کاغذ اور مارکر دیکھے پنسل کو جانچا کپ میز کے کونے پر رکھا اور ٹائیٹل بنانے میں مصروف ہو گئے۔

ہم نے پہلے ان کے ہاتھوں کی انگلیوں میں لغزش اور تھرتھراہٹ دیکھی تھی مگر جب انہوں نے دو پنسلیں ایک چھوٹی اور بڑی چار انگلیوں کے درمیان دیکھیں تو لغزش غائب تھی۔ انہوں نے اسکیچ بنایا پھر ان میں رنگ بھرا مجال ہے جو کہیں ان کی کسی انگلی میں غلط جنبش ہوئی ہو۔ اس کے بعد خطاطی کا مظاہرہ دیکھا، وہ اللہ کی راہ میں۔۔۔ ایک ایک لفظ زیر زبر پیش کی فکر۔ بار بار کہتے قرآن دیکھو، مجھے دکھاؤ۔ کوئی ساڑھے تین بجے صبح انہوں نے ٹائیٹل ختم کیا۔ ہماری ٹانگوں میں جان نہ تھی۔ مگر وہ نوجوان تھے۔ بولے لو بھئی وعدہ پورا کر دیا۔ شکایت کی جی ہاں مگر دیر سے انہوں نے پھر عینک اپنی آنکھوں پر فٹ کی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں کتنا صبر ہے؟

ہم نے کچھ آزادی حاصل کر کے بات کی۔ صادقین صاحب آپ انڈیا جا رہے ہیں۔ امریکہ جائیں۔ ہر شہر میں نمائش کریں لیکن پانی کے ساتھ کچھ کھایا بھی کریں۔ آپ وقت سے بہت پہلے مر جائیں گے۔ وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "دیکھئے خانصاحب اس دنیا میں آنا اور جانے کا ایک وقت مقرر ہے۔ نہ ایک سیکنڈ ادھر اور نہ ایک سیکنڈ ادھر۔ جس کا فیصلہ اوپر والا کرتا ہے۔ وہ کسی پر کچھ نہ کرنے کی ذمہ داریاں بھی ڈالتا ہے۔ اس لئے میرے بارے میں تردد نہ کریں۔ زیادہ کھانے سے بہت سے لوگ مر جاتے ہیں۔ کم کھانے سے کسی کو مرتے نہیں دیکھا۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔ اور میرا فی الحال مرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے آیا سمجھ میں۔ اور ہم چپ ہو گئے۔

سوبرِ صغیر کا نامور فرزند صرف ۵۷ سال کی عمر میں مر گیا۔ پیاس تو شاید اسے کبھی نہیں لگی ہو لیکن وہ بھوک کا مزدور تھا۔ سو فن کی بلندیوں کی تلاش میں بھوکا مر گیا کہ آئندہ آنے والے اس کی بھوک کا مداوا کر سکیں۔ رہے ہم تو اپنے اس ساڑھے پانچ دن کے دوست کو شاید کبھی فراموش نہ کر سکیں۔ اتنی محبت اور اتنا خلوص اتنی پروا تو اپنے بھی نہیں دے سکتے جو صادقین ہم جیسے فقیر کو دے گیا۔ اللہ جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

صفحہ ۱۵۱ کا باقی

کس بات کے غماز ہیں میرے پاس کھڑے ہوئے ایک صاحب اپنے ساتھی سے گویا تھے کہ حکومت ملک سے فحاشی اور عریانی کو دور کرنے کے لئے طرح طرح کے بیانات جاری کرتی ہے۔ اخبارات اور رسائل کو فحش لٹریچر اور عریاں تصاویر اور مواد سے پاک کرنے کے لئے مہمیں چلائی جا رہی ہیں لیکن مصوری کے میدان میں ایسے مصوروں کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ فن پاروں کی آڑ میں جس زاویے اور جس انداز سے چاہیں عریانی اور فحاشی کو فروغ دیں اور کھلے بندوں نمائش منعقد کر کے مخرب الاخلاق اور فحش شاہکار پیش کر کے قوم کا اخلاق بگاڑیں۔ اور انہیں ذہنی طور پر بیمار کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ یہ حیرت ہے کہ پنجاب آرٹ کونسل نے اس "کوک شاستر" کی نمائش کا سرکاری طور پر اہتمام کر کے اس حکومت کو اس گند میں ڈالا ہے جو ان دنوں فحاشی کے خلاف قائدِ عوام کی زیرِ ہدایت نہایت دھوم دھام سے مہم چلا رہی ہے۔ اس کارنامہ کے لئے پنجاب آرٹ کونسل کو تو فروغِ فحاشی کا تمغہ ملنا چاہیئے۔

سلطان احمد نقوی

چچا جان

آنکھ کھولی تو گھر میں ایک ایسی شخصیت کو اپنے قریب پایا جو اپنے انداز اطوار اور رویے میں عام لوگوں سے بڑی حد تک مختلف تھی۔ دُبلا جسم ٹخنے کا پاجامہ ڈھیلا ڈھالا کرتا جس پر جھولتی ہوئی شیروانی جس کے اکثر و بیشتر یا تو تمام بٹن کھلے ہوتے یا زیادہ سے زیادہ نیچے کے دو ایک بند ہوتے۔ زندگی کے معمولات میں لاابالی پن اور بے پرواہی کا سا انداز۔ کھانے کا وقت جو مل گیا جب مل گیا جہاں مل گیا۔ زندگی کی لازمی ضرورت سمجھتے ہوئے کھالیا۔ نہ سونے کا کوئی مقررہ وقت۔ مقام، جب تک جاگا جا سکا جاگے اور جب فطرت سے مجبور ہو کر نیند کے آگے بے بس ہو گئے تو جہاں ہوتے وہیں ہتھیار ڈال دیئے اور دراز ہو گئے جس وقت آنکھ کھلی بیدار ہو گئے۔ گھر سے نکلنے کے لئے وقت کی قید سے آزاد، واپسی کی کسی پابندی سے مبّرا۔ زندگی کی پابندیوں سے آزاد۔ نہ رات کے اندھیرے کی کوئی اہمیت، نہ دن کی روشنی کی کوئی اوقات "بس" ایک زمانے کی روش جس میں دن کبھی نہ رات۔ نہ کوئی مستقل قیام کی جگہ، جہاں پہنچ گئے اور دل لگ گیا رہنے لگے۔ کچھ دن رہے اس جگہ کا قرض نئی تخلیقات کی صورت میں ادا کیا اور آگے بڑھ گئے۔ اپنے قیام کو پڑاؤ کہتے۔ فن کے نخلستانوں میں پڑاؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ مشرق و مغرب کے اکثر ممالک کو دیکھا۔ ماہرینِ فن سے دادِ تحسین حاصل کی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ مستقبل کے پکاسو ہیں۔ جب ان کا نام آرٹ کے بڑے بڑے مراکز میں روشن ہو رہا تھا تو سب کچھ چھوڑ کر اپنے ملک میں واپس آ گئے اور ایسے آئے کہ سوائے مختصر دوروں کے دوبارہ ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ لوگوں نے بہت کہا۔ "یہاں کیا رکھا ہے یورپ جاؤ۔ یورپ جاؤ۔ امریکہ جاؤ وہاں تمہاری شہرت ہو چکی ہے۔ تمہارے ذ[illegible] والوں کا حلقہ بن رہا ہے۔ دولت۔ عزت۔ نام و نمود تمہارے منتظر ہیں۔ اس ویرانے میں تمہارے لئے کیا رکھا ہے۔ یہاں کیا کرو گے" تو ہمیشہ یہی کہا۔ "یہاں آرٹ کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ ویرانی میں بہار لاؤں گا۔ اس ریگستان میں نخلستان بن کر رہوں گا۔ یہاں کے لوگوں کے شعور پہ جو مکڑی کے جالے بنے ہوئے ہیں ان کی نشاندہی کروں گا۔ یہاں جب تک لوگوں میں آرٹ نہیں ہوگا لوگوں میں ذوق اور شعور کس طرح پیدا ہوگا۔"

یہ شخصیت تھی جناب صادقین کی جو رشتے میں ہمارے چچا۔ رویّے میں ہمارے دوست اور محبت اور شفقت میں ہمارے بزرگ تھے۔

وقت اور شب و روز کی قید سے آزاد چچا میاں خود اپنی ہی تعمیر کردہ قید میں کچھ اس طرح سے مقیّد تھے کہ زندگی کے آخری سانس تک وہ اس سے آزاد نہ ہو سکے۔ وہ قید تھی زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی خواہش کی۔ اپنے خیالات کے اظہار کی۔ تصورات کو عملی جامہ پہنانے کی۔ نئی نئی تخلیقات پیش کرنے کی۔ یہی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ ان کی عمر کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو کہ جب انہوں نے اپنے اس فرض سے چشم پوشی کی ہو۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر طریقے سے بروئے کار لانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ وہ کام کے وقت اپنے وجود کی تمام تر قوت کے ساتھ اس میں لگ جاتے اور جب تک وہ کام مکمل نہیں ہو جاتا ان کی بے قراری کو قرار نہ آتا۔ جس وقت وہ عملی طور پر کسی کام میں مصروف نہ ہوتے تو بھی ان کی اُنگلیاں خلا میں اس طرح

حرکت کرتی رہتیں جیسے سامنے کینوس رکھا ہو اور ذہن میں پیدا ہونے والے تصورات اس پر منتقل ہو رہے ہوں۔ ان کے اس تخلیقی عمل کی شدت اور کرب کو شاید ہی کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہو۔

جاری ہوا اگر شدت تخلیق کا دور

مت پوچھ مری جان تو اس وقت کے طور

جو بندۂ اللہ پہ گزری وہ سب

اللہ ہی جانتا ہے ورنہ کون اور

وہ اپنی تمام زندگی کے برعکس کام کو انتہائی ترتیب اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کرتے۔ ان کی نمائشیں فن ترتیب کی بھی ایک مثال ہوتیں۔ ماحول کو زیادہ اثر انگیز بنانے کی کوشش کرتے۔ خطاطیوں یا تصاویر کی ترتیب میں گھٹاؤ کا خاص خیال رکھتے خود ان کو لگواتے اور برش رنگ اور مختلف سائز کے کینوس ساتھ رکھتے۔ اگر انہیں کوئی ایسا گوشہ نظر آتا جس کی وجہ سے نمائش کے گھٹاؤ میں فرق پیدا ہو رہا ہوتا تو اسی وقت موقع کی مناسبت سے کوئی تصویر بنا کر لگا دیتے۔ تصاویر کے علاوہ دیگر اشیاء سے بھی موقع کی مناسبت سے ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ جنگ کے موضوع پر بنائی ہوئی تصویر کے گرد مثلاً خار دار تار لگا دیتے یا منافقت کے بارے میں تصویر کے قریب کسی طریقے سے اس کا اظہار کرتے۔

خطاطی کی پہلی نمائش کے موقع پر انہوں نے آرٹس کونسل کے ہال کو محرابوں اور صفوں سے اس طرح آراستہ کیا تھا کہ وہ ایک مقدس مقام نظر آنے لگا تھا اور آنے والے کے دل میں اس ماحول کی وجہ سے بڑا احترام پیدا ہو جاتا۔

کام کے سلسلے میں جلد بازی اور اسے کم سے کم وقت میں مکمل کر لینا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ بیک وقت کئی تصاویر پر کام شروع کرتے اور ان کی منصوبہ بندی اس طرح ہوتی کہ ایک کینوس پر اسکیچ ہو رہا ہے تو دوسری پر رنگ کا پہلا کوٹ اور تیسری پر اگلا مرحلہ۔ ہر تصویر کا مکمل آئیڈیا اور خاکہ ان کے ذہن میں ہوتا۔ وقت کی تقسیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ کونسی تصویر کا کون سا مرحلہ ہے اور کون سی کب اس قابل ہوگی جو اس پر اگلا مرحلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وقت کی تقسیم اور منصوبہ بندی کی بدولت کم سے کم مدت میں زیادہ سے کام ہو جاتا۔

اس طرح جس زمانے میں رباعیات کہنے کا عمل جاری تھا بلکہ رباعیات ہی کہی جا رہی تھیں تو ان کی تخلیق، پھر انتخاب ان کو فیئر کرنے، ان کی خوش خطی اور کتاب کی ڈمی تیار کرنا یہ تمام کام ایک ساتھ جاری تھے۔ شام کو منتخب رباعیات کو خوش خط کرنا پھر رباعیات کا انتخاب ان کو فیئر کرنا اور رات کو نئی رباعیات کی تخلیق جو پو پھٹنے تک جاری رہتی۔ منہ اندھیرے ہی رات بھر میں کہی ہوئی رباعیات سناتے بھی تھے۔ ہمارا جواب سوائے "بہت اچھی" یا "جی جی" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی ناشتے میں کون شعر سن سکتا ہے پھر اگر بھت ہوتی تو تھوڑا بہت ناشتہ کر لیتے اور پھر مختصر وقت کے لئے سو جاتے یا ڈھیر ہو جاتے تقریباً سہ پہر سے یہ عمل دوبارہ جاری ہو جاتا۔ اس طرح چند ماہ میں ایک ہزار سے زیادہ رباعیات کی کتاب تیار ہو گئی۔

ان کا کام کرنے کا مقصد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا یا تخلیقی عمل کے کرب سے نجات حاصل کرنا تھا۔ رات دن کی محنت سے بنائی ہوئی تصاویر کی نمائش کے بعد انہیں یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہیں کس کے پاس ہیں اور کس حال میں ہیں جو بھی پہچاننے والا مانگ بیٹھتا اسے بخش دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں تصاویر بنانے کے باوجود ان کا اپنا کوئی کلیکشن نہیں اور سوائے ان تصاویر کے جو ان کے انتہائی قریبی دوستوں کے پاس کچھ تعداد میں محفوظ ہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟

ان کے حلقۂ احباب میں رکشہ والے اور ہسپتال کی جمعدارنی سے لے کر اربابِ حکومت، افسران، تاجر، صنعت کار

سب ہی شامل تھے۔ مگر وہ کسی کے گھر شاذ و نادر ہی جایا کرتے تھے۔ عام طور پر جس کسی کو ان سے ملاقات کرنی ہوتی وہ خود ہی آتا۔ ۱۹۵۹ء میں ایک وزیر صاحب نے ان کے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمارا گھر آج ہی کی طرح معمولی قسم کا تھا۔ ہمارے والد جو ان کے بڑے بھائی تھے نے سوچا کہ ملک کا وزیر گھر آ رہا ہے کم از کم آج ہی گھر میں "بوریا نہ ہوا" والی صورت تو نہ ہو۔ انہوں نے گھر کی صفائی کا خاص اہتمام کیا۔ میز پر نئے میز پوش بچھائے۔ تمام اشیا ترتیب سے رکھیں۔ جا بجا سگریٹ کے بکھرے ہوئے بے شمار ٹوٹے ایک طرف کرائے۔ دیگر جو بھی اہتمام ہو سکتا تھا وہ کیا مگر جب چچا خود کہیں باہر سے آئے تو یہ اہتمام دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا اور بڑی کوشش سے پہلے والی صورت حال بحال کر دی۔ اور اسی حالت میں وزیر موصوف کا استقبال کیا۔

اس کے برعکس ایک گھڑی بیرونِ ملک سے ان کے بھائی نے لا کر دی وہ اسے ہاتھ پر کیا ہی باندھتے پہلی فرصت میں اپنے دوست رکشہ والے کو دے دی۔ اسی طرح ہسپتال کی جمعدارنی کی جو تصویر ایک اخبار پر بنائی تھی اپنے کمرے کی دیوار پر اس طرح لگائی تھی کہ ہر آنے والا سب سے پہلے اسی کو دیکھتا۔ اس کی شان میں ایک رباعی بھی کہی تھی۔

گو میک بہت تھوک رہی تھی پچھمی
خدمت میں کہاں چوک رہی تھی پچھمی
ہسپتال کے اس ویرانے میں
کوئل کی طرح کوک رہی تھی پچھمی

(ممکن ہے کسی مصرع میں غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ مجھے پوری طرح یاد نہیں) ان کے رہنے کی جگہ خواہ وہ گھر ہو یا لاہور کا عجائب گھر۔ باغِ جناح کی پہاڑی ہو یا آرٹس کونسل، ضیا کا فلیٹ ہو یا جناح ہسپتال یا کوئی دوسرا مقام ان کے دروازے ہر آنے والے کے لئے کھلے ہوتے۔ آنے والے آتے اور جاتے رہتے ان میں نہ عمر کی قید تھی اور نہ مرتبہ کی۔ اسکول کالج کے طلباء سے لے کر رٹائرڈ افراد سب ہی ان میں شامل ہوتے تھے۔

لوگ فرمائشیں کرتے رہتے اور وہ پوری ہوتی رہتیں۔ کوئی آنے والا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔ بعض اوقات تو کئی وقت کا کھانا صرف اس لئے ناغہ ہو جاتا کہ آنے والوں کا تسلسل ٹوٹتا ہی نہیں تھا جو ان کی صحبت میں ایک بار شریک ہو جاتا وہ وہیں کا ہو رہتا اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ جو لوگ اس شخصیت کی قربت سے محروم رہے وہ اس گرمجوشی اور جذبے کا اندازہ نہیں کر سکتے جو ان کی طبیعت کا حصہ تھا۔

صادقین نے فن کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہر چند کہ وہ بنیادی طور پر ایک مصور تھے اور ان کی شہرت کا آغاز بھی بحیثیت ایک مصور کے ہی ہوا تھا جس کی ابتدا پاکستان میں تو پچاس کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں ہی ہو گئی تھی اور ساٹھ کی دہائی کی ابتدا ہوتے ہی ان کا نام یورپ کے آرٹ سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں سنائی دینا شروع ہو گیا تھا اور ۱۹۶۱ء میں وہ پیرس میں اپنی بنائی تصویر پر اعزاز حاصل کر چکے تھے اور ۱۹۶۷ء میں وہ جب پاکستان آئے تو یورپ اور امریکہ کے تقریباً تمام بڑے آرٹ کے مراکز میں اپنی تصاویر کی نمائش کر چکے تھے۔

خطاطی کی ابتدا بھی دراصل مصوری ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۶۸ء میں وہ کراچی میں بر راہ بنائی ہوئی تیس تصاویر کی نمائش کر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے غالب کے اشعار پر مبنی تصاویر بنائیں اور ان کے اشعار کی چھوٹی تختیوں پر خطاطی بھی کی جس کے بعد ہی انہیں یہ بھی خیال ہوا کہ کیوں نہ آیاتِ قرآنی کی خطاطی کی جائے۔ اور اگلا مہینہ رمضان کا آ رہا تھا اسی کی مناسبت سے انہوں نے خطاطی کے فن پارے تیار کئے اور یوں خطاطی کا آغاز ہوا۔

شعر پڑھنے اور لکھنے کا شوق بھی انہیں اپنی ابتدائی عمر کے ابتدائی زمانے سے تھا شروع میں وہ اپنا تخلص صدق کہ

کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی شاعری جو ضائع ہونے سے رہ گئی تھی وہ ایک مختصر کتاب "جزو بوسیدہ" کے نام سے شائع بھی ہو چکی ہے۔
۱۹۶۹ء میں انہیں باقاعدہ شاعری کرنے کا خیال آیا اور اگلے چند ماہ میں انہوں نے تقریباً پندرہ سو رباعیات کہہ ڈالیں۔
صادقین نے فن کی جس صنف میں بھی طبع آزمائی اس کا بنیادی خیال ایک ہی ہوتا تھا ان کی مصوری ہو یا خطاطی یا رباعیات وہ اپنے بنیادی خیال سے کہیں بھی نہیں ہٹے ان کی تصاویر کی ترجمانی رباعیات میں ہوتی ہے اور اسی طرح رباعیات کی ترجمانی تصاویر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں۔

ایک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

ان کا بنیادی خیال انسانی آزادی اور اس کی محنت کی عظمت، حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد اور معاشرے کے منافقانہ رویہ کے خلاف جہاد ہے اپنے اس خیال کا اظہار وہ انتہائی بھرپور انداز سے کرتے تھے اور اس کا سمجھنا اتنا آسان ہوتا ہے کہ ایک معمولی سمجھ کا شخص بھی اس کو سمجھ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت عوام میں اتنی ہوئی جو شاید کسی دوسرے فن کار کے حصّہ میں آئی ہو۔ جہاں تک خواص میں مقبولیت کا تعلق ہے اس کی وجہ تو ان کی فن شناسی یا اس کا اظہار ہو سکتا ہے جس کو وہ خود بھی سمجھتے تھے۔

زیبا نہیں خود کروں جو اپنی توصیف
آئے کوئی کہتا ہوں کہ رکھئے تشریف
گندھارا کا کارنس یہ گو تم لیکن
کرتا ہے میرے ذوقِ ہنر کی تعریف

لیکن جہاں تک عام لوگوں کا ۔ ۔ ۔ تعلق ہے انہیں نہ تو اپنے آپ کو با ذوق ثابت کرنے کا شوق ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں منافقانہ اظہار کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کی پسند اور ناپسند کا معیار صرف ان کے مسائل کی ترجمانی اور وہ رشتہ ہوتا ہے جو ایک فنکار ان کے ساتھ شامل ہو کر جوڑتا ہے اور اس کی کہی ہوئی بات عام انسان کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ صادقین نے نہ صرف معاشرے کے انتہائی پسماندہ طبقے سے رشتہ جوڑا بلکہ اسے وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط کرتے چلے گئے۔

ہم نالے یہ کاٹتے ہیں راتیں اے یارو
کیوں ہم سے یہ کر رہا ہے گھاتیں اے یارو
ہم تو ہیں اگر میں عرق ہم سے مت چھیڑ
یہ کوثر و تسنیم کی باتیں اے یارو

انہوں نے اپنے فن کے ذریعے اس ظلم و ناانصافی کی ترجمانی کی ہے جو ہمارے معاشرے میں جاری رہتا ہے۔ ان کی اکثر تصاویر میں دورِ تیہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ کہیں ظالم قوتوں نے انسان کا سر کاٹا ہوا ہے تو کہیں ان کی کھال اتار رکھی ہے اور ان کو پابندِ سلاسل کیا ہوا ہے لیکن وہ ساتھ ہی ان تمام مظالم کے خلاف ہونے والی جدوجہد میں بھی شریک ہیں۔ ان کا ہیرو سر کٹنے کے باوجود ظلم کی تلوار توڑتا ہوا نظر آتا ہے اپنے خون سے مقتل کی زمین کو سیراب کرتا ہے اور انسانیت سے محبت کا پیغام دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حق اور صداقت کی تبلیغ میں جان دیتا ہے۔

گو ہاتھ میں لرزش تھی وہیں پر لکھا
تھا خوب جلی لوحِ یقیں پر لکھا
سر کٹتے ہی اک نقطۂ محبت میں نے
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھا

مجھ ہی ابھی مقتل میں کہا تھا یارو
اک وار میں پھر خون بہا تھا یارو
سر میرا کٹا پڑا تھا لیکن پھر بھی
حق حق لب سے نکل رہا تھا یارو

صادقین نے جتنی بھی تصاویر بنائیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو لوگوں کے ڈرائنگ روم کی زینت بن کر اس کی رنگینی میں اضافے کا سبب بن سکتی ہو اس لئے کہ ان کا ذہن ہمارے معاشرے کی بے انصافیوں اور تاریکیوں سے اس درجہ متاثر تھا کہ ان میں رنگینی ظاہر ہی نہیں ہو پاتی تھی اسی سبب ان کی تصاویر میں گہرے اور تاریکی سے قریب رنگ استعمال ہوئے ہیں جو اس معاشرے کی حالت کی عکاسی کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ انسانیت کے مستقبل سے مایوس تھے۔ انہیں تصاویر میں کہیں نہ کہیں روشنی کی علامت بھی نظر آئے گی۔ وہ اسی روشنی کی تلاش میں طویل عرصے تک مصائب برداشت کرنے اور جد و جہد کرنے کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ نامساعد حالات کا وہ جگہ جگہ مذاق اڑاتے اور ان کے سامنے سینہ سپر نظر آتے ہیں۔

صحرا کی حرارت کو دکھاتا ہے مذاق
سورج کی تمازت کا بناتا ہے مذاق
ہاں ناگ پھنی چھیل کے اونچا ہو کر
موسم کے مظالم کا اڑاتا ہے مذاق

وہ ایک ایسے فنکار تھے جو اپنا تعلق زندگی کی حقیقتوں سے قائم رکھتے اور خیالات اور افسانوں کی دنیا سے ان کا تعلق کبھی کسی وقت نہیں ہوا۔ انہوں نے تصاویر میں جو کچھ پینٹ کیا یا اپنی رباعیات میں جو کچھ کہا وہ زندگی کا حقیقی ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنے فن پارے ڈرائنگ روم کی آرائش کے لیے تخلیق نہیں کئے بلکہ ان تلخ حقائق کو موضوع بنایا جن کے ذکر سے لوگ کتراتے ہیں اور ان کا ذکر ان کے لئے بد ذوقی کی علامت ہوتا۔

میں خانۂ زردار سجاؤں کیسے
افسانۂ حقیقت کو بناؤں کیسے
موجود ہیں زندہ خار آخر تصویر
ان کاغذی پھولوں کی بناؤں کیسے
بے ذوقِ جمال کو جگانے کے لئے
یہ چیز ہے دلوں میں سمانے کے لئے
کس سے کہوں تصویر نہیں ہوتی ہے
عشرت گہہ زردار سجانے کے لئے

صادقین ... اپنی فنی اور عام زندگی میں ایک کھلی کتاب تھے جو کچھ وہ سوچتے تھے اس کا اظہار وہ اپنے فن کے ذریعہ بغیر کسی لحاظ و تکلف کے برملا کرتے تھے ان میں منافقت نام کو نہیں تھی اسی لئے وہ ایک منافق کے مقابلے میں ایک کھلے کافر کو زیادہ قابلِ عزت اور سچا انسان سمجھتے تھے۔ وہ اچھائی کے متلاشی تھے برائیوں پر ان کی نظر نہیں جاتی تھی۔

کب مسلکِ کفر میں ہے کچا کافر
دیتا نہیں ایماں کا غچا کافر
میری تو نظر میں ہے بہت ہی بہتر
اک جھوٹے مسلماں سے سچا کافر

ستارہ جعفری
بمبئی

صادقین اور سردار جعفری (ایک یاد)

صادقین پاکستان کے مشہور آرٹسٹ ہیں اور شاعر ہیں۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان (جواب بنگلادیش بن گیا ہے) میں زبردست طوفان آیا تھا۔ صادقین نے دسمبر میں مشرقی پاکستان کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے اپنی تصویروں کی نمایش کی۔ اس میں قرآن شریف کے بھی بہت پرانے نسخے تھے۔ جو اُن کے باپ دادا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ خطاطی کا فن ان کو اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔ اس نمایش میں صادقین نے سورۃ رحمٰن کو بالکل ایک نئے انداز میں پیش کیا تھا۔

کراچی کے ایک بہت بڑے اور کشادہ ہال میں یہ نمایش ہو رہی تھی۔ میں بھی اس کو دیکھنے گئی۔ ہال میں علاوہ تصویروں کے ایک اڑتالیس فٹ لمبی تصویر تھی جو اُسی مناسبت سے جوڑی تھی۔ یہ ان کا بہترین شاہکار تھا۔ اس میں پورے سیلاب کو سمو دیا تھا۔ تصویر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا گویا ہم خود اس طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔ باپ پانی میں ڈوب رہا ہے اور اس نے اپنے بچے کو ہاتھوں پر اونچا کر دیا ہے۔ لیکن ظالم موجیں اس معصوم کو بھی نگل جانا چاہتی ہیں۔ ایک طرف بلند درختوں کی شاخوں پر بچے چھینکوں پر لٹک رہے ہیں۔ نیچے ایک عورت اپنے گھر کے سامان کے ساتھ بدحواس بیٹھی ہوئی ہے۔ سیلاب کا پانی سامان سے ٹکرا رہا ہے دوسری جانب درخت کی ڈالی پہ ایک بچہ ہے اور اس کے جسم کو کالا ناگ اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ پس منظر میں دیو پیکر طوفانی موجیں ہیں جو انسان کو اس سرزمین سے مٹا دینا چاہتی ہیں۔ لیکن ان طوفانی موجوں سے بھی اوپر دو ہاتھ نظر آتے ہیں جن کے اوپر قرآن شریف رکھا ہوا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ؎

آنکھیں تو کھول۔ شہر کو طوفان لے گیا

نمایش میں ایک ایک روپے کے کارڈ بک رہے تھے۔ معلوم ہوا ان پر صادقین اپنے دستخط کر دیں گے۔ پھر ان کارڈوں اور تصویروں کے بکنے سے جو آمدنی ہوگی وہ مشرقی پاکستان کے مصیبت زدوں کو بھیج دی جائے گی۔

میں نے بھی ایک کارڈ خرید لیا۔ ہال کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا میں نے دیکھا وہاں بے پناہ ہجوم ہے اور لوگ باقاعدہ لائن لگائے کھڑے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا یہیں صادقین دستخط کر رہے ہیں۔ میں بھی لائن میں کھڑی ہو گئی اور جب ان کے قریب پہنچی تو دیکھا نہایت دبلا پتلا شخص، الجھے ہوتے بال اور سیاہ رنگ کی شیروانی پہنے نہایت تھکے ہوئے انداز میں ایک ہاتھ سے سر پکڑے ہوئے دستخط کر رہا ہے۔ دوسرا آدمی اس کو اٹھا کر واپس کر دیتا ہے۔

میں نے جب اپنا کارڈ اُن کے سامنے میز پر رکھا تو انہوں نے ایک نظر میرے اوپر ڈالی اور کارڈ کی پشت پر ایک لڑکی کی تصویر بنا کر اپنے دستخط کر دیئے۔ خلافِ امید یہ پاکر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے شکریہ ادا کر کے کارڈ واپس لے لیا۔ پھر میرے دل میں خیال آیا۔ یہ شاعر بھی ہیں پھر کیوں نہ ان سے ایک شعر بھی لکھوا لوں۔ یہ سوچ کر میں دوبارہ ان کے قریب گئی تو دیکھا کچھ لڑکیاں میرے کارڈ کی تصویر کا حوالہ دے کر ان سے تصویر بنوانے کی فرمایش کر رہی تھیں۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تمہارے لئے یہی کافی ہے۔"

میرے دل میں خیال آیا کہیں مجھے بھی جھڑک نہ دیں۔ مگر ہمت کر کے کہا۔
"بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میرے کارڈ پر اپنا ایک شعر لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔"
انہوں نے گردن اٹھا کر پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔
"کارڈ پر جگہ نہیں ہے ورنہ پوری رباعی لکھ دیتا" پھر ایک شعر لکھا۔

ایک تجھ کو نظر نہیں آئے
ساری محفل میں میری تنہائی

کارڈ واپس دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا:
"آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟"
میری بھانجی نے جواب دیا "بمبئی سے۔ یہ سردار جعفری کی چھوٹی بہن ہیں"
صادقین فوراً اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔
"آپ جعفری کی بہن ہیں؟ اتنی دیر سے کھڑی ہیں۔ مجھے معاف کیجیے گا"
پھر کہا "اس نام کو سن کر تو میری آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ اور تمام تھکن دور ہوگئی۔ میں نے یہ اڑتالیس فٹ لمبی تصویر ایک ماہ شب و روز محنت کر کے بنائی ہے۔ سردار جعفری کے نام میں کتنی طاقت ہے اور مجھے ان سے کتنا پیار ہے یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اب تو مجھے بالکل تھکن نہیں لگ رہی"
"آپ کی اُن سے ملاقات ہے؟" میں نے پوچھا:
"نہیں۔ میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ بس یہ دعا ہے کہ خدا ایک مرتبہ مجھے ملا دے۔ میں جعفری کو سورۂ رحمٰن تحفے میں دے رہا ہوں۔ ان کو دے دیجیے گا"

صفحہ ۱۵۹ کا باقی

سے فارغ ہوتی صادقین کے قریب آ بیٹھتی کبھی صادقین کو اور کبھی ان کی بنائی ہوئی یا تکمیل کے مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی تصویریں دیکھتی۔
صادقین اس سے اتفاق نہیں کرتے مگر میرا خیال ہے کہ وہ اپنی تصویر بنانا چاہتی تھی اور یہ جو صادقین نے اپنی تصویر والے صادقین کے سر پہ گھونسلا اور گھونسلے کے ارد گرد سانپ بنائے ہیں اور گھونسلے میں چڑیا بٹھائی ہے یہ وہی چڑیا ہے۔ اسی لیے تو تصویر دیکھنے کے لیے وہ صادقین کے کندھے پر بیٹھی ہوئی تھی اور ان سانپوں سے بھی خوف زدہ نہیں تھی جو اس کے گھونسلے کے ارد گرد رینگ رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ تصویر صادقین نے نہیں اس چڑیا نے بنائی ہے۔ اس چڑیا نے جو صادقین کی نئی محبوبہ ہے۔ وہ محبوبہ جیسا سے صادقین کے ملنے، جبل الصادقین، سادھو کے شوالے، یا جھوک صادقین نے دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صادقین کی تازہ ترین رباعیات میں کچھ رباعیاں اس چڑیا کے بارے میں بھی ہوں گی!

صفحہ ۱۶۷ کا باقی

صادقین نے بہت مختصر زندگی گزاری اور معنوی حیثیت سے تو اس کا سفر اور بھی مختصر بن گیا۔ مگر اس پوری زندگی میں اسے ایک بات کا یقین تھا کہ اس نے اپنے فن کو تسلیم کرانے میں کوئی شارٹ کٹ استعمال نہیں کی، وہ شارٹ کٹ جو آج کے فن کا المیہ ہے۔

حسین امین

صادقین در پردہ راز

"اسلام علیکم۔ آئیے آئیے۔ یہاں بیٹھئے۔ اچھا اُدھر بیٹھ جائیے۔ یا بستر پر بیٹھئے۔"

مہین چارخانے دار سرمئی (غالباً) سینڈلوم ٹیری کاٹ کا کرتا جس پر نیلے بٹن لگے تھے اور سفید چھالٹین کے چوڑی مُہری کے پاجامے میں ملبوس، انگلیوں میں بیڑی دبائے ہوئے صادقین صدق صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور فوراً ہی اس مہمان خانے کے چھوٹے سے کمرے میں دستیاب دو تین کرسیوں اور اپنے بستر پر مہمانوں کی "تشریف" کو رکھ دینے کی فکر میں لگ گئے لیکن ہم نے ان کو اس بات کے لئے زیادہ دیر تک فکرمند نہیں ہونے دیا اور اپنی اپنی جگہ خود ہی تلاش کر لی۔

"دو دلی قومی آواز میں ایک فلاں ہیں۔"؟

"جی جی۔ ہیں تو سہی۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔ کئی ماہ قبل انہوں نے بھی ایک انٹرویو لیا تھا جو ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا!"

صادقین صاحب نے بجا طور پر اپنے دل کی ایک گرہ شروع ہی میں کھول دی۔ میں بغلیں جھانکنے لگا۔ اور پھر ان کو یقین دلایا کہ وہ بھی نکلے گا ضرور اور یہ بھی۔ پھر انہوں نے اخباری دنیا کے لوگوں سے اپنی ایک اور شکایت کی، جب میں نے ان سے اس وعدے کے ساتھ کچھ تصویریں مانگیں کہ واپس کر دونگا اس بارے میں بھی وہ اپنی شکایت میں حق بجانب تھے خود میں اپنا وعدہ مقررہ وقت سے کئی روز بعد پورا کر سکا۔

صادقین سے ملاقات ایک خوشگوار حیرت ثابت ہوئی، عام طور پر کسی بہت ہی اہم شخصیت سے خاص کر جس نے جہاں گردی کی ہو اور جس کی عالمی شہرت ہو ملاقات سے قبل ذہن میں ابھرنے والی خیالی تصویر میں تنک مزاجی۔ نخرے، گھمنڈ، ترش کلامی، خود ستائی وغیرہ کے رنگ خاصے چوکھے ہوتے ہیں لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا وہ ایک ایسے انسان کی جیتی جاگتی تصویر نکلے جس کا ظاہر اور باطن یکساں ہے۔ چنانچہ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ اور کھرے اتنے ہیں کہ نہ تو اپنی تعریف کرتے ہیں اور۔ کسی کی برائی کرتے ہیں اور سب سے خاص بات یہ کہ ان کی بات چیت میں غضب کا تنوع ہے اور اپنے مخاطب کو غیر ضروری طور پر "جب میں لندن میں تھا" یا "جب میں پیرس میں تھا" (جہاں وہ سات سال رہے ہیں) یا جب میں "واشنگٹن" یا "بغداد" یا "تہران" یا "قاہرہ" یا "انقرہ" میں تھا کے جملوں سے کبھی بور نہیں کرتے ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ ان کے خمیر میں فن اور شاعری کا تناسب ہم وزن ہے چنانچہ ان کی شخصیت آج کی اصطلاح میں "تھری اِن ون" کہلائے گی، ان کے اندر بیک وقت کئی وصف جمع ہو جانے کے نتیجے میں اکثر "اوور لیپنگ" ہو جاتی ہے۔ آپ سوال خطاط صادقین سے یا مصور صادقین سے کیجئے تو جواب شاعر صادقین دیتا ہے ویسے یہ بجائے خود ایک انوکھی بات ہے اس بات کا اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ جواب بے محل نہیں ہوتا۔

اپنی لگ بھگ تین گھنٹوں کی بات چیت کے دوران میں برابر محسوس کرتا رہا کہ صادقین صاحب کی شخصیت میں بھی اتنی ہی انفرادیت ہے جتنی کہ ان کی مصوری میں ملے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام ظاہری اور باطنی کیفیتوں میں یکساں طور پر کھلے ہوئے نظر آنے کے باوجود ایک سربستہ اسرار بھی ہیں ان کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے اور اپنے کو بہت زیادہ ظاہر کرنے سے وہ واضح طور پر کتراتے ہیں اور شاید اسی لئے خاصی پہلے دار باتیں کرتے ہیں اور ایسی کہ بس "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" اکثر چٹکلوں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں، اپنے کو سمجھنے والے کو بہلانے کے لئے انہوں نے

اپنے کم سے کم ۱۲۰ القاب رکھ چھوڑے ہیں جیسے "الجاہل، الرقیق، الراہب، الخبیث، الشقی، المحتاج، المحکوم، العاصی، الاحمق، المجروح، القتیل، المحروم، الوحشی، المقروض" وغیرہ۔

ان کے بارے میں جب میں نے ایک سوال کیا تو پہلے وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر ان کے اندر کے شاعر نے اٹھ کر ایک رباعی میں جواب دیا جو میری درخواست پر اس نے ایک کاغذ پر رقم کر دی ہے

میں حسن کی جس انجمن ناز میں ہوں
جو کچھ بھی ہوں خود اپنے ہی انداز میں ہوں
خطاط کے شاعر کے مصور کے سوا
میں اور بہت کچھ ہوں مگر راز میں ہوں

صادقین شاعری کے میدان میں کوچۂ خیام میں ایک بھولا بھٹکا مسافر کی حیثیت سے نظر آئے گا لیکن ایسا مسافر جسے برصغیر پر ہر ایک جانتا ہے ان کی رباعیوں کے تین مصور ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شاعر صادقین مصور صادقین کے شانہ بشانہ اس وقت نظر آئیگا جب ان کے اندر کا ہمدرد انسان دوسری عالمگیر جنگ کے دوران مقبوضہ فرانس میں نازیوں کے خلاف "رزسسٹنس" سرگرمیوں کے ہیروؤں کی طرف دیکھتا ہے مصور اور شاعر دونوں مل کر غالب کے ایسے اشعار تلاش کرتے ہیں جو ان کارناموں اور دلیرانہ جذبوں کی ترجمانی کر سکیں۔ اور پھر ان اشعار کو تصویر میں پیش کر دیتے ہیں، ایسے لگ بھگ ساٹھ اشعار صادقین کے موئے قلم کی جنبشوں سے تصویر بن چکے ہیں۔

صادقین یوپی کے مشہور اور مردم خیز قصبہ امروہہ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اور آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۸ء میں گریجویشن کرنے کے بعد اس ملک کو خیرباد کہا اور بقول ان کے ان کا اب کوئی گھر نہیں ہے اور اس سوال کا کہ کیا شاعری، مصوری اور خطاطی ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے یا کوئی اور بھی ذریعہ معاش ہے۔ ان کا برجستہ جواب یہ تھا ہے

تخلیق میں معتکف ہونا میرا
اب تک شب ہستی میں نہ سونا میرا
خطاطی ادھر ہے تو ادھر نقاشی
وہ اوڑھنا میرا یہ بچھونا میرا

میورل ساز :

صادقین ایک ممتاز خطاط، شاعر اور مصور ہیں۔ ان کو دیواری تصویر بنانے پر ملکہ حاصل ہے جو "میورل" کہلاتی ہے۔ ۱۹۵۴ء۔۶۰ کے درمیان ان کی دیواری تصویروں اور طغروں کی متعدد نمائشیں ہوئیں اور ۱۹۶۵ء میں مصوری کی آل پاکستان قومی نمائش میں پہلا انعام پایا اور پھر پیرس چلے گئے فرانس کے متعدد شہروں۔ واشنگٹن (امریکہ)، لندن، دوبئی، ابوظبی، جدہ، قاہرہ، بیروت، دمشق، عمان، کویت، بغداد، بخارہ، ماسکو، باکو، تاشقند، انقرہ اور تہران اور ہندوستان میں جہاں وہ انڈین کونسل برائے ثقافتی تعلقات کی دعوت پر نومبر ۱۹۸۱ء سے آئے ہوئے ہیں، حیدرآباد، دہلی، بنگلور، میسور، علی گڑھ، وارانسی اور لکھنؤ میں مختلف تنظیموں اور آرٹ گیلریوں کے زیر اہتمام ان کی دیواری تصویروں طغروں اور مخطوطات کی متعدد نمائشیں ہو چکی ہیں۔ کینبرا میں وہ آسٹریلوی حکومت کا کلچرل ایوارڈ پا چکے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ان کے مخطوطات کی ایک بڑی نمائش ہو چکی ہے۔ ابوظبی کی وزارت، آب و برقیات کی دعوت پر ام النسأ کے مقام پر واقع وہاں کے بجلی گھر کے دیوان میں ایک بہت بڑا طغریٰ لگ چکے ہیں اور ہندوستان میں ابھی تک وہ حیدرآباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری میں انہوں نے یونیورسٹی کے نصب العین کی روشنی میں کہ "عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ"۔ ایک شاندار دیواری تصویر نقش بدیوار کی ہے اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے کلاسوں کے مرکزی ہال میں

اب جب بھی کوئی داخل ہوتا ہے صادقین کا شاہکار "جستجوئے حقیقت" دیکھ کر ان کو یاد کرتا ہے۔

خطاطی کے معاملے میں انہوں نے کسی مخصوص خط سے خود کو وابستہ نہیں کیا ہے بلکہ زمانے میں تبدیلی کے اعتبار سے انہوں نے خط میں نئی جدتیں پیدا کی ہیں۔ چنانچہ ان کی خطاطی کا فن یہ ہے کہ حروف کو لفظ کے معنی کی شکل میں بنا دیتے ہیں۔ مثلاً آغوش کا "ش" کھینچ کر لکھیں گے تو گردش کے ش کو چکردار لکھیں گے۔ سورۂ رحمٰن انہوں نے اس انداز سے لکھا ہے کہ ہر آیت کا ابھری پس منظر بھی پیش کر دیا ہے۔

صادقین عام طور پر روغنی رنگ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تصویروں، طغروں اور فن خطاطی کے نمونوں کی فہرست بہت طویل ہے انہوں نے سورۂ یٰسین کا ایک طغریٰ ۲۸۰ فٹ لمبی ایک سلولائڈ کی شیٹ پر لکھا ہے اور تین فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی چالیس شیٹوں پر سورۂ رحمٰن کا طغریٰ لکھا ہے جس کے ۴۰ ٹکڑے ساتھ لائے ہیں۔ یہ دیواری طغرے فن خطاطی کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کی ایک دیواری تصویر دو سو فٹ لمبی اور ۲۸ فٹ چوڑی ہے۔

صادقین نے اس سوال کا جواب دینے میں ذرا تکلف برتا کہ ان کی انفرادیت کی چھاپ کیوں کر جانی جاسکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ انفرادیت خود ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ خود نظر آتی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں۔ بہر کیف فیض احمد فیض کے بقول صادقین نے جاندار چیزوں کی ظاہرہ شکل و صورت کی عکاسی کی ہے لیکن ان کی گہری نظر باطنی خصوصیات پر بھی رہتی ہے۔ قدرت کی غیر معمولی اشیاء میں وہ اپنا سبجکٹ ان اشیاء کو بناتے ہیں جو زندہ ہوں اور آگے بڑھنے کے لئے کوشاں ہوں وہ کوشش خواہ غیر مؤثر ہی کیوں نہ ہو، صادقین ایک سماجی نقاد بھی ہیں۔ لیکن ان کے سماج میں وہ جاندار ہیں جو مصیبت زدہ ہیں۔ کیوں کر وہی جفاکش ہوتے ہیں جیسے اونٹ۔ بیل۔ پانی بھرنے والا۔ پتھر کے نیچے دبی ہوئی جڑ وغیرہ وہ اپنی تصویر کے خطوط میں ایسی ماہرانہ تبدیلی پیدا کرتے ہیں کہ ہر شے کے جذبات ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ پیرس سے واپسی کے بعد سے وہ ایک مایوس اور مظلوم دنیا کی تصویر کشی کرنے لگے لیکن وہ امیدوں کے چراغ بھی روشن کرتے رہتے ہیں۔ صادقین کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ دور وسطیٰ کی خطاطی سے لے کر جدید پوسٹروں اور کلاسیکی اسکیچ سے لے کر جدید مصوری تک جس میڈیم میں بھی کام کرتے ہیں ممتاز نظر آتے ہیں۔

عوام پر ان کے فن کا کیا اثر پڑتا ہے؟ دنیا بھر کے اخبار والوں نے تو جو لکھا سو لکھا ہی لیکن انہوں نے یہ بھی پتہ نہیں کس جھونک میں آ کر بتا دیا کہ حیدر آباد اور دہلی میں ان کی نمائشوں کو ہزاروں لوگوں نے دیکھا جو عام طور پر دوسروں کے ساتھ نہیں ہوتا ہے دمشق میں ان کی نمائش جہاں چل رہی تھی۔ اسی کے سامنے یونیورسٹی ہے۔ افتتاح کے دوسرے دن یونیورسٹی میں آدھے دن کی تعطیل کر دینا پڑی۔

صادقین صاحب خود ہی اپنے استاد بھی ہیں۔ انہوں نے مصوری یا خطاطی یا شاعری خود ہی سیکھی اور یہ سب وہ کب سے کر رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں ؎

اک رازِ دلی کھول رہا ہوں کب سے
نظروں میں اسے تول رہا ہوں کب سے
تخلیق ہے اک زہر کہ جس میں خود کو
کچھ یاد نہیں گھول رہا ہوں کب سے

لیکن یہ انہوں نے ضرور بتایا کہ وہ اپنے فن کو عیش گاہوں۔ کلبوں اور کمرشیل گیلریوں میں بیچتے نہیں ہیں۔ وہاں آرٹ کون سمجھ سکتا ہے، چنانچہ صادقین کا فن علمی اداروں میں نظر آئے گا جہاں اس کے سمجھنے اور اس کا اثر لینے والے ہوتے ہیں۔

صادقین نے ہندوستان کے جن فنکاروں کو سراہا ان میں ایم ایف حسین شامل ہیں۔ انہوں نے ہندوستان میں فن کی ترقی کو سراہا اور اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ صنعتی آرٹ (کمرشیل آرٹ) اصل فن کو ختم کر دے گا بلکہ یہ کہا کہ سب چلتا ہے، کمرشیل آرٹ خود اپنی جگہ ایک آرٹ ہے اور دنیا کی اسکی مانگ ہے۔

صادقین صاحب ایک بڑی میں ملاقات کے دوران مسلسل الجھے رہے۔ دریافت کرنے پر انکشاف ہوا کہ یوں تو وہ سگریٹ پیتے ہیں لیکن بنارس میں گلا کچھ خراب ہو گیا تھا تو بیڑی پی جس سے گلا ٹھیک ہو گیا۔

اس سے قبل کہ ہم صادقین صاحب کا بند چھوڑتے ایک ذاتی سوال کرنے کی ہمت پڑ چکی تھی کہ یوں۔ وہ بھی ذرا بے تکلف ہو چکے تھے لیکن صاحب داقعی شاعر ہو تو ایسا یعنی ہر سوال کے لئے ایک رباعی گویا پہلے ہی کہہ رکھی تھی۔ چنانچہ اس سوال کا جواب یوں مناسب سے

وہ مطلع ہستی پہ سویرا نہ ہوتی
میں اس پہ فدا مجھ پہ وہ شیدا نہ ہوتی
میں صاحب اولاد بھی ہو سکتا تھا
اولاد کی والدہ ہی پیدا نہ ہوئی!

یہ رباعی سنی اور دنگ رہ گئے ، "اب عشق" پر بات چلی تو عشق کے مختلف معنوں اور پہلوؤں پر بحث و تکرار ہوتی رہی پھر جب اقبال کا ذکر آیا تو صادقین صاحب کی ظریفانہ رگ پھڑکی۔ کہنے لگے آپ جانتے ہیں عشق کا کیا نتیجہ ہوتا ہے نہیں ؟ تو اقبال سے معذرت کے ساتھ ان کے رنگ میں عشق کو میں نے اپنی نظر سے یوں دیکھا ہے سے

کیا کہوں تیرے شریعت میں جب آجاتا ہے عشق
پو تھڑے جزدن کے رتی پر رنگ جاتا ہے عشق

صادقین سے رخصت ہوتے وقت میرے دماغ میں بس ایک ہی فکر تھی اور وہ یہ کہ صادقین ایک ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی اتنے بہت سے صادقینوں کی تصویر کشی کرنے کے لئے تو خاصے بڑے کنواس کی ضرورت ہوگی۔

صفحہ ۱۵۹ کا باقی

بھی زمانے کا ہو سکتا ہے۔ وہ پتھر کے عہد کا نشان ہے اور وہ صنعتی عہد کا انسان ہے۔ اس صنعتی عہد میں جو کروڑ ہا انسان پتھر کے عہد میں سانس لے رہے ہیں، صادقین نے ان ہی کو زنگوں اور لکیروں میں قید کر کے امر کر دیا۔

صادقین کے منحنی سے وجود میں جانے کتنے ہیل پیکر آباد تھے ، تب ہی انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں وہ کام کیا جو کئی لوگ مل کر نہ کر سکیں۔ ان کی بے پناہ تخلیقی قوت برِ صغیر کے ان گنت شہروں کی دیواروں پر ثبت ہے، ان کی تصویریں یورپ کی آرٹ گیلریوں میں رہتی ہیں۔ انہوں نے غالب، اقبال، اور فیض کو مصور کیا، ان کی خطاطی ہزاروں گز کے طول پر پھیلا ہے، شعر کہنے کا شوق ہوا تو رباعیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

ٹھنڈ لگ جانے کے بہانے جب وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے تو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے رہے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنی تصویروں کے لئے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا انسان اور اس کی کائنات ، یہ ان کا محبوب موضوع تھا اور شاید اس لئے وہ اس میں اتنے ڈوبے کہ خود کائنات کی لاانتہا پہنائیوں میں گم ہو گئے۔ سفر انہیں محبوب تھا اور چلتے رہنا ان کا دل پسند مشغلہ، اسی لئے انہوں نے آخری سفر پر جانے میں بھی جلدی کی۔

صفحہ ۱۶۵ کا باقی

کہیں سراغ نہ ملا۔ ہاں صرف یہ احساس باقی رہ گیا کہ وہ بادِ سموم کے ایک تیز و تند تھپیڑے کی طرح ملتے تھے اور صبا کے نرم و نازک جھونکے کی طرح نگارِ لکھنؤ کی زلفوں کو چھو کر روانہ ہو گئے بالکل ناریل کے پھل کی طرح اوپر سے نہایت سخت اندر سے انتہائی نرم کومل اور شیریں ...!!

جاوید صدیق

صادقین سے بات چیت

"اس کے قلم یا برش کی ایک جنبش کے ساتھ پوری فطرت اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ متحرک ہو جاتی ہے" ایک غیر ملکی نقاد نے ان الفاظ میں پاکستان کے عظیم مصوّر، خطاط اور شاعر صادقین کو خراج تحسین پیش کیا ہے صادقین اپنی زندگی میں ہی اپنے فن کے حوالے سے ایک LEGEND بن گیا ہے۔ حال ہی میں وہ بھارت میں چودہ ماہ گزارنے کے بعد واپس پاکستان آیا ہے۔ وہ بھارتی حکومت کی دعوت پر وہاں گیا تھا اور اس نے مختلف بھارتی شہروں میں وہاں کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے لئے مصوری اور خطاطی کی۔ صادقین کا کہنا ہے "اگر میں ہندوستان نہ جاتا تو میرا مشاہدہ اور تجربہ نامکمل رہ جاتا" ہندوستان سے واپسی پر "حرمت" نے صادقین سے بھارت میں اس کے تجربات و مشاہدات کے علاوہ اس کے فن کے بعض پہلوؤں اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر سے متعلق ایک انٹرویو کیا جس میں عصرِ حاضر کے اس اہم ترین مصوّر نے کہیں کھل کر اور کہیں محتاط انداز میں اظہارِ خیال کیا یہ انٹرویو صادقین گیلری اسلام آباد میں "حرمت" کے ڈپٹی ایڈیٹر جاوید صدیق نے کیا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ تجارتی ذہن صرف تجارتی انداز میں سوچتے ہیں تجارت کے علاوہ وہ محبت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں نے ہندوستان میں جتنے کام کئے اور یہاں بھی جو کام کرتا ہوں ان کی بنا محبت پر ہوتی ہے اور فی سبیل اللہ کرتا ہوں۔ ہمارا سودا سکوں کی جھنکار میں نہیں دلوں کی دھڑکنوں سے ہوتا ہے۔ فن کی تجارت اپنی فنکارانہ شریعت میں قطعاً ناجائز ہے میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے انسانوں میں دس لاکھ بسم اللہ تقسیم کر چکا ہوں۔

س:۔ صادقین آپ خاصا عرصہ بھارت میں گزار کر آتے ہیں آپ کے خیال میں فن کی ترویج اور اس کے فروغ کے لئے ماحول پاکستان میں زیادہ مناسب ہے یا بھارت میں؟

ج:۔ ہر جگہ کی اپنی بات ہوتی ہے اپنی اپنی شان ہوتی ہے میں جہاں بھی گیا ہوں فنکارانہ طور پر متاثر ہوا ہوں خواہ وہ کیلی فورنیا کے جنگلات ہوں یا عربستان کے ریگزار ہر جگہ کا اپنا حُسن ہوتا ہے۔ ہندوستان کے حوالے سے میں یہ بات کہتا چلوں کہ میں سطحی تعصبات کا قطعاً قائل نہیں ہوں۔ میں تمام تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان گیا تھا۔ میں نے وہاں دل کھول کر دماغ روشن کر کے اور آنکھوں کو کھول کر مشاہدہ کیا حتی الوسع جتنا کچھ ممکن تھا میں نے اسے اپنے وجود میں جذب کیا۔

س:۔ آپ کے خیال میں بھارت میں خطاطی کا مستقبل کیا ہے؟

ج:۔ خطاطی وہاں پہلے بھی ہو رہی تھی لیکن میرے جانے کے بعد وہاں خطاطی کا رجحان بڑھ گیا ہے میرے جانے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں خطاطی کا شعبہ قائم کیا گیا اور اس شعبہ کا افتتاح میں نے کیا۔ خطاطی میں نوجوان مصوروں کی دلچسپی اب بہت زیادہ ہو گئی ہے حتیٰ کہ ہندو لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی خطاطی شروع کر دی ہے۔

س: آجکل پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور عدم جارحیت کے معاہدہ کے لئے بھی گفت وشنید ہو رہی ہے آپ کے خیال میں فنکار اس ضمن میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ج:۔ دونوں ملکوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے فنکار ہی بہترین کردار ادا کر سکتے ہیں بلکہ میرے نزدیک تو یہی بہترین طریقہ ہے کہ فنکاروں کو دونوں ملکوں کے دورے کرنے چاہئیں۔ ویسے ہم فقیروں کی تخلیقات عموماً سیاسی بادلوں سے اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں۔

س: صادقین آپ ہندوستان میں چودہ ماہ گزارنے کے بعد وطن واپس آئے ہیں ہندوستان میں قیام کے دوران آپ نے وہاں کے مختلف شہروں میں خطاطی کی اور تصویریں بنائیں آپ نے اپنے فن میں سے ہندوستان کو کیا دیا؟

ج: پہلے تو میں عرض کر دوں کہ اگر میں ہندوستان نہ گیا ہوتا تو میرا مشاہدہ زندگی نامکمل رہ گیا ہوتا مجھے ہندوستان کی حکومت نے دعوت دی تھی اور حکومت پاکستان کی اجازت سے میں وہاں گیا۔ ہندوستان میں میرے قیام سے متعلق انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے جو پروگرام تشکیل دیا تھا اس پر عمل نہیں کیا جا سکا کیونکہ پروگرام ایک طرح کی منصوبہ بندی تھی اور اپنی شاعرانہ و بے چین روح منصوبہ بندی کے شکنجے میں آنے والی نہیں۔ لہذا انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (آئی سی سی آر) نے مجھے آزاد چھوڑ دیا۔ دہلی میں میرے فن کی نمائشیں ہوئیں اس کے بعد وقت کی ایک رو مجھے اپنے ساتھ بہا کر علی گڑھ لے گئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ماٹو "MOTTO" ہے "علم الانسان مالم یعلم" یونیورسٹی کی لائبریری میں میں نے اسی ماٹو کی خطاطی کی اور شعبہ جغرافیہ کی بیرونی دیواروں پر علم جغرافیہ سے متعلق مختلف دھاتوں میں نقاشی کی اس کے علاوہ میں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے تعلیمی اداروں کے لئے خطاطی کی اور ان اداروں کے لئے تصویریں بنائیں بنارس یونیورسٹی اور غالب اکیڈمی کے لئے حصول علم کے موضوع پر تصویریں بنائیں۔ یہ تصویریں کیسے بنیں میرے خیال میں قدرت نے ایسے اسباب مہیا کر دئیے تھے جن کے باعث یہ تصویریں بن گئیں۔

س:۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ آپ نے ہندوستان میں جو نقاشی کی اور تصاویر بنائیں۔ ان میں آپ نے ہندو ثقافت اور اساطیر کو مصور کیا ہے۔

ج:۔ میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آدمی کی جتنی عقل اور جتنی اسکی بصیرت ہوتی ہے اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکتا۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں ان کی بساط فکر بھی اتنی ہی ہے وہ اس سے آگے نہیں سوچ سکتے میں نے ہندوستان میں کون سی تصویریں بنائیں اس کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں۔

س:۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ان تصویروں کا بھاری معاوضہ آپ نے بھارتی حکومت سے لیا ہے؟

ج:۔ ہندوستان کرۂ ارض پر وہ واحد ملک ہے جہاں میں نے صرف پیسہ خرچ کیا ہے اور یہ پیسہ کسی غیر قانونی طریقے سے نہیں بلکہ حکومت پاکستان کے توسط سے پیسہ منگوا کر وہاں خرچ کیا یہ پیسہ میں نے اپنی بود و باش اور اپنے فن پر صرف کیا۔

س:۔ اب آپ جب اس مقام پر ہیں کہ آپ کے فن کی ساری دنیا معترف ہے اور شہرت کے اعتبار سے بھی آپ نقطۂ عروج چھو چکے ہیں تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

ج :- غالب کا ایک شعر ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ شعر میرے حسب حال نہیں، میری کوئی آرزو یا تمنا ایسی نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو اس کی ایک سیدھی سی وجہ تو یہ رہی ہے کہ میں نے کبھی کسی چیز کی تمنا نہیں کی جو میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہو لیکن بہت سی ایسی چیزیں جنہیں میں اپنے دائرۂ اختیار سے باہر سمجھتا تھا قدرت نے میرے بائیں ہاتھ میں ڈال دیں مجھے ناقدری کا بھی کوئی شکوہ نہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قدرت جب کسی کو جوہر سے نوازتی ہے تو قدرت فروغ جوہر کے اسباب بھی خود مہیا کر دیتی ہے یہ میں آپ کو اپنی زندگی کے تجربے کا حاصل بتا رہا ہوں قدرت نے مجھے فروغ جوہر یعنی فروغ فن کے اسباب بھی مہیا کر دیئے تھے اور سامان تضیع اوقات بھی فراہم کر دیا تھا یعنی ساز و سامان گناہ بھی دے دیا تھا۔ اب ان دونوں سے مجھے انتخاب کرنا تھا چنانچہ میں نے تخلیق فن کا راستہ اختیار کیا اور اپنے فن کو آگے بڑھانے کیلئے جتنا میری بساط میں تھا اتنا کام کیا خطاطیاں میلوں کے حساب سے کیں اور تصویریں مربع ایکڑوں کے حساب سے بنائیں میرا عقیدہ یہ ہے کہ جوہر خداداد ایک آسمانی امانت ہوتا ہے اور اسے بروئے کار لا کر مخلوق خدا کو جمالیاتی تسکین بہم پہنچانا ایک فریضہ ہے میرے نزدیک فن سے مخلوق خدا کو فیض یاب کرنا اعلیٰ درجے کی عبادت اور ایسا نہ کرنا آسمانی امانت میں خیانت کے مترادف ہے۔

س :- آپ کو کوئی پچھتاوا بھی ہے۔

ج :- جی مجھے زندگی میں کسی بات کا پچھتاوا نہیں۔ یعنی زندگی کے تمام تر تجربے کے ساتھ اگر مجھے ایک مرتبہ پھر بیس سال کا کر دیا جائے اور میں اپنی زندگی کا از سر نو آغاز کر دوں تو میرے خیال میں اب تک جو میری زندگی گزر چکی ہے میں اس سے بہتر زندگی نہیں گزار سکتا لہٰذا مجھے نہ تو کوئی پچھتاوا ہے اور نہ ہی کوئی شکوہ ہے۔

س :- اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ تقدیر پرست یا FATALIST ہیں؟

ج :- میں زندگی کی ایک ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی تنظیم پر ایقان رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی منصوبہ بندی نہیں کی یعنی اپنے وجود کو وقت کی لہروں پر ڈھیلا ڈھالا چھوڑ دیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں میں مختلف سمتوں میں بہتا رہا بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ کہ زندگی میں مجھ سے سرزد ہوا وہ کہیں بنا بنایا پہلے سے وقت کی تہوں میں موجود تھا اور جب اس کے رونما ہونے کی ساعت آئی تو وہ رونما ہو گیا کبھی کسی دوسرے ملک میں نمائش کی شکل میں اور کبھی تصویر کی شکل میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی ایک ماورائی تنظیم ہے اور واقعات کی ایک مابعد الطبیعیاتی ترتیب ہے یعنی سوچنے کی یہ منزل مجھ پر بہت پہلے آ چکی تھی کہ جو کچھ مجھ سے سرزد ہو رہا ہے وہ میرے پردے میں کوئی ادا کر رہا ہے دور کے واقعات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو مجھے اپنے دورۂ ہندوستان سے صرف دس روز قبل معلوم نہیں تھا کہ میں ہندوستان جانے والا ہوں حتمی طور پر میں ہندوستان جانے کو دائرۂ امکان سے باہر سمجھتا تھا لیکن پھر حکومت ہندوستان نے مجھے دعوت دی اور حکومت پاکستان نے مجھے جانے کی اجازت دی میں چودہ ماہ ہندوستان میں گزار کر آیا ہوں لیکن وقت کی اضافیت کے حوالے سے مجھے یہ بھی احساس نہیں کہ میں نے چودہ سیکنڈ یا چودہ دن ہندوستان میں گزارے ہیں۔

س :- آپ کے فن کے حوالے سے ایک سوال میرے ذہن میں یہ ہے کہ بعض حلقے کہتے ہیں۔ آپ نے اپنے فن سے واقعیت پسندی یا REALISM کو منہا کر دیا ہے کیا یہ درست ہے؟

ج :- حقیقت یہ ہے کہ ایسا کہنے والے واقعیت پسندی یا حقیقت کا ادراک ہی نہیں رکھتے حقیقت یا REALITY کیا ہے اکثر

سطحی سوچ رکھنے والے چیزوں کو ایک ہی رخ یا زاویے سے دیکھ کر فتویٰ دے دیتے ہیں کہ حقیقت وہ ہے جو انہیں نظر آ رہی ہے حالانکہ حقیقت وہ نہیں ہوتی کچھ اور ہوتی ہے حقیقت پسندی کا مطلب محض چیزوں کی ایک جہت کو پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ میں حقیقت یا REALITY کو اپنی تمام تر جہتوں کے ساتھ لوحِ قرطاس پر منتقل کرتا ہوں میں فوٹوگرافی نہیں کرتا، مصور ہوں، تصویریں بناتا ہوں۔

س:۔ جناب آپ خطاط بھی ہیں مصور بھی ہیں۔ اور شاعر بھی آپ کے ان تینوں فنون کا باہمی رشتہ کیا ہے؟

ج:۔ میرے یہ تینوں فنون ایک دوسرے کے تابع ہیں۔ میری مصوری خطاطی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ خطاطی شاعری کی طرف بڑھ رہی ہے اور پھر شاعری مصوری کی طرف بڑھ رہی ہے اس طرح میرے ان تینوں فنون کا دائرہ دار عمل ظہور پذیر ہوتا ہے میری مصوری سے شاعری تخلیق ہوتی ہے۔ مثلاً میری ایک رباعی ہے۔

مکھڑے کی تو تنویر سے باتیں کی تھیں
اور زلف کی زنجیر سے باتیں کی تھیں
کل اک تری تصویر بنا کر میں نے
پھر کچھ تری تصویر سے باتیں کی تھیں

یہ ایک مثال پیش کر رہا ہوں کہ شاعری کے لئے مصوری کا تجربہ ضروری ہے۔ ذیل کی رباعی خطاطی کے تجربہ سے طلوع ہوتی ہے۔

پہلے تھی جگہ خالی تو لکھیں آیات
دیکھیں لٹیں جب کالی تو لکھیں آیات
آیات کو دیکھا تو بنائے مکھڑے
مکھڑوں پہ نظر ڈالی تو لکھیں آیات

بے شمار دوسری مثالیں دے سکتا ہوں میں نے اکثر رباعیاں کہیں اور پھر ان پر مشتمل تصویریں بنائیں اور پھر تصویروں کی بنیاد پر شاعری کی۔ اس طرح میرے تمام فنون باہمی طور پر مربوط ہیں وہ ایک دوسرے سے پھوٹتے ہیں اور ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہیں وہ INTERLINKED ہیں۔

س:۔ ایک ناقد کا یہ خیال ہے کہ آپ کا فن مسلمانوں کے ماضی اور موجودہ معروضی حالات سے پھوٹا ہے یعنی وراثت اور ماحول آپ کے فن کی اساس ہیں۔ آپ اس ضمن میں اظہارِ خیال فرمائیں گے۔

ج:۔ جہاں تک مسلمانوں کے ماضی یا MUSLIM PAST کا تعلق ہے تو یہ میری تخلیق میں براہ راست آتا ہے۔ خطاطی تو سراسر یہی ہے اسلامی پس منظر میری تصویروں میں بھی موجود ہے میں تحریری مصوری کرتا ہوں تو اس کے اجزائے ترکیبی میں بھی عربی خطاطی کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک موجودہ ماحول کا تعلق ہے تو ہر آرٹسٹ اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتا ہے ایک زمانے میں کراچی میں سمندر کے کنارے رہتا تھا جہاں ہر طرف ناگ پھنی کے پودے ہوتے تھے تو ناگ پھنی کا یہ پودا شعوری اور لاشعوری طور پر فن پر اثر پذیر ہو رہا تھا۔ CACTUS یا ناگ پھنی کے اس پودے سے ایک طرح کی افہام و تفہیم ہو چکی تھی۔ مختلف اشکال میں میرے ہاتھ سے لوحِ قرطاس پر اُبھر آتا تھا چونکہ یہ پودا موسم کے انتہائی خلاف لڑ کر بھی زندہ رہتا ہے اور ارتقاء پذیر رہتا ہے چنانچہ میری تصویروں میں یہ پودا موسم اور ماحول پر فتح کی علامت کے طور پر سامنے آتا تھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گرد و پیش میں جو بھی ہوتا ہے وہ فنکار کو متاثر کرتا ہے۔

س:۔ بعض ناقد آپ کو اسلامی آرٹسٹ کہتے ہیں آپ اپنے اس تشخص سے مطمئن ہیں۔

باقی صفحہ ۷ پر

مجاہد لکھنوی

کراچی

صادقین اپنے گھر میں

دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی حوالہ سے شہرت یافتہ افراد جس قدر اپنے مداحوں، قدردانوں اور چاہنے والوں میں قبولِ عام حاصل کرتے ہیں، اپنے گھر سے اپنے اہلِ خاندان سے اُن کا رابطہ اتنا ہی کمزور ہوجاتا ہے۔ زیرِ نظر "طلوعِ افکار" کے "صادقین نمبر" کی تیاری میں ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرا۔ اس دوران ایک بڑی تعداد میں ایسے افراد سے ملاقات اور گفتگو کی گئی جو کسی طرح بھی صادقین سے قربت رکھتے تھے۔ ان تمام لوگوں میں نمایاں ہستی صادقین کے بھتیجے جناب سلطان احمد کی تھی جو بیشتر مواقع پر ہمارے ساتھ موجود رہے اور صادقین کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں جو خالص گھریلو انداز کی اور اُن کے خاندان کے افراد سے متعلق تھیں۔ یقیناً یہ گفتگو قارئین کے لئے خصوصی دلچسپی کی حامل ہوگی۔

مجاہد: سلطان صاحب! آج کی اس گفتگو میں ہم وہ باتیں نہیں دوہرائیں گے جو صادقین کے بارے میں دیگر مضامین کے ذریعے سے قارئین تک پہنچ رہی ہیں یا لوگ اُن سے پہلے ہی واقف ہیں۔ ہم صرف اُن کی گھریلو اور نجی زندگی پر بات کریں گے۔ سب سے پہلے آپ صادقین کے خاندان کے بارے میں بتائیے۔

سلطان احمد: یہ تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ اُن کا تعلق امروہہ کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ اُن کے والد کا نام سید سبطین احمد نقوی تھا۔ صادقین سمیت اُن کے تین بیٹے تھے۔ تینوں بھائیوں میں ہمارے والد کاظمین احمد نقوی سب سے بڑے تھے۔ اُن سے چھوٹے حسنین احمد تھے جن کا انتقال عالمِ جوانی میں ۱۹۵۵ء میں ہوگیا تھا۔ اس طرح صادقین اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

مجاہد: صادقین کی شہرت کو اصل عروج تو پاکستان میں ہی ہوا۔ اس سے قبل ہندوستان میں اُنہیں کیا مقام حاصل تھا؟

سلطان احمد: قیامِ پاکستان کے وقت نہ اُن کی عمر اتنی زیادہ تھی نہ ہی اُن کا کام اتنا نمایاں ہوا تھا جو بحیثیت فنکار شہرت حاصل ہوتی لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ امروہہ کی ایک جانی پہچانی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دہلی اور فن کے دیگر مراکز کے علمی و فنی حلقوں میں پہچانے جاتے تھے۔ معروف رسائل و جرائد مثلاً آجکل (دہلی) اور مخزن (لاہور) میں اُن کی نظمیں اور تصویریں شائع ہونی شروع ہوگئی تھیں۔

مجاہد: کیا تقسیمِ ہند کے بعد وہ تنہا پاکستان آئے تھے؟ یہاں آکر اُن کا ذریعہ معاش کیا رہا؟

سلطان احمد: جی نہیں! قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سب اہلِ خاندان نے امروہہ سے ہجرت کی تھی۔ یہاں آکر وہ ۱۹۵۰ء تک سکرنڈ کے زراعتی کالج میں کام کرتے رہے۔ اسی کالج میں اُن کے بھائی حسنین احمد بھی ملازم تھے۔ پھر کچھ عرصہ

عرصے کے لئے ریڈیو پاکستان میں بھی کام کیا۔ ۱۹۵۱ء کے بعد سوائے مصوری، خطاطی اور شاعری کے اور کچھ نہیں کیا۔

مجاہد: آپ کی اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صادقین نے اپنے فن میں مہارت اور شہرت کی منزلیں بہت کم وقت میں اور بہت تیزی کے ساتھ طے کر لیں۔

سلطان احمد: جی ہاں۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کی ایک نمائش کا افتتاح جناب حسین شہید سہروردی نے کیا تھا جو اُس وقت پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ بلکہ اس نمائش سے قبل سہروردی صاحب نے ایک خصوصی اجتماع اپنے گھر پر کیا تھا جس میں کچھ منتخب معزز حضرات کو صادقین کے فن پارے دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

مجاہد: کیا یہ صادقین کی پہلی نمائش تھی؟

سلطان احمد: جی نہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی نمائشیں ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو، اخبارات اور رسائل کے ذریعے صادقین کو خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔

مجاہد: شاید ہم اپنے موضوع گفتگو سے ہٹ رہے ہیں۔ یہ بتائیے کہ صادقین کا اپنے گھر کے افراد کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟

سلطان احمد: اس سوال کا جواب مختصراً دینا بہت مشکل ہے اور تفصیل کے لئے پورا ایک مضمون چاہیئے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ایک روایتی، مشرقی، گھریلو شخص تھے۔ کسی وقت بھی گھر کے مسائل سے نہ صرف یہ کہ بے خبر نہیں رہتے تھے بلکہ اُنہیں حل کرنے میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ اگر کراچی سے باہر ہوتے تو روزانہ فون کر کے نام بہ نام سب کا حال دریافت کرتے تھے۔ اسی طرح جب ملک سے باہر جاتے تو ہر ہفتہ دس دن کے بعد گھر والوں کو ایک خط ضرور لکھتے تھے۔ یہ خطوط وہ باری باری ہم بہن بھائیوں کے نام لکھا کرتے تھے۔

مجاہد: گھر میں اُن کے روزانہ کے معمولات کیا تھے؟

سلطان احمد: معمولات نہ کہئے۔ صرف ایک ہی عمل تھا جس میں وہ مصروف رہتے تھے۔ روزانہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک وہ کوئی نہ کوئی فنی کام کرتے تھے۔ کام سے فرصت ملتی تو کچھ تھوڑا بہت کھا لیتے۔ اسی طرح سونے کے لئے اُن کے پاس بہت کم وقت ہوتا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے بستر پر لیٹتے اور اُٹھ کر پھر کام شروع کر دیتے۔

مجاہد: صادقین کے عادات و خصائل کے بارے میں کچھ بتائیے؟

سلطان احمد: میں کہوں گا کہ عادات و خصائل کے اعتبار سے وہ ایک منفرد شخصیت تھے۔ سوائے مے نوشی کے اُن کی ذات سے کوئی ایسی بات یا عمل وابستہ نہیں تھا جس نے اُن کے کردار کو متاثر کیا ہو۔ اس کے علاوہ اُن کی فنکاری کو بھی میں اُن کی عادت ہی کہوں گا۔ جس وقت وہ تصویر کشی یا خطاطی میں مصروف نہیں ہوتے تھے اُس وقت بھی اُن کی انگلیاں اس طرح حرکت کرتی رہتی تھیں جیسے کینوس پر کام کر رہے ہوں۔

مجاہد: دوست احباب اور میل مراسم کے حوالے سے صادقین کی شخصیت پر کیا تاثر تھا۔

سلطان احمد: اُن کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا جس کی پہلی بڑی وجہ تو اُن کی مہربان شخصیت اور اخلاق تھا۔ وہ ہر ایک سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ہر ایک کی فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس طرح جو اُن سے ایک بار مل لیتا تھا وہ اُن کا دوست بن جاتا تھا۔ ایسے افراد کی بہت بڑی تعداد موجود ہے جن کے گھر صادقین کی تصاویر کی گیلری بنے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ تو اُن کے پاس آتے ہی صرف اسی لئے تھے کہ کچھ دیر بیٹھیں گے، شوق کریں گے اور چلتے چلتے ایک آدھ تصویر بھی لیتے جائیں گے۔

مجاہد : آپ کے خیال میں اُن کے احباب زیادہ تر خود غرض اور مطلبی قسم کے لوگ تھے۔

سلطان احمد : جی زیادہ تر۔ ویسے کچھ ایسے بھی ملیں گے جن سے بڑے گہرے مراسم رہے۔ طویل عرصہ تک بلکہ آخری دم تک دوستی قائم رہی مگر اُن کے گھر میں آپ کو صادقین کی بنائی ہوئی تصویر تو درکنار، اُن کا دستخط شدہ ایک کارڈ بھی نہ ملے گا۔ میں یہ عرض کرتا چلوں کہ جب بلدیہ عظمیٰ کراچی نے "گیلری صادقین" بنائی تو امید تھی کہ اُن کے وہ احباب جو اُن سے بے شمار تصاویر تحفتاً لے گئے ہیں، کچھ اس گیلری کو ضرور پیش کریں گے مگر ابھی تک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

مجاہد : کبھی ایسا ہوا کہ صادقین گھر والوں سے ناراض ہو گئے ہوں۔ غصہ میں کسی کو سخت سست کہا ہو۔

سلطان احمد : غصہ نام کی چیز تو شاید اُن کی فطرت میں تھی ہی نہیں اس لئے ناراض ہونے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر اتفاقاً کبھی وہ اپنی دانست میں کسی کے خلافِ مزاج کوئی بات کہتے بھی تھے تو کسی نہ کسی طرح اُس کی تلافی فوراً کر دیتے تھے۔ گھر والے یا دوست تو دور کی بات ہے، وہ ایسے اشخاص سے بھی ناراض نہیں ہوتے تھے جن کے بارے میں اُنہیں یقین ہوتا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ نوکروں سے بھی کبھی گرم آواز سے بات نہیں کرتے تھے۔

مجاہد : صادقین نے شادی نہیں کی۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟ میرا مطلب ہے کوئی عشق و رومان وغیرہ اور اس میں ناکامی؟

سلطان احمد : میرا خیال ہے ایسی کوئی وجہ نہیں تھی۔ شادی اسی لئے نہیں کی ہوگی کہ اُن کی آزادی متاثر ہوگی اور پھر وہ اضافی ذمہ داری کے باعث اپنے فن پر پوری توجہ نہ دے سکیں گے۔ رہی بات عشق و رومان کی تو وہ شاعر بھی تھے اور مصور بھی۔ جسکی بنیاد ہی حُسن پرستی ہے۔ اُن کی لاتعداد رباعیاں ہیں جن کا موضوع ہی عشق اور حُسن ہے۔ لیکن میرا خیال ہے اُنہیں صرف اپنے فن سے عشق تھا۔

مجاہد : یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے کہ جب صادقین کے والد پیرس پہنچے تو اُنہیں بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اس لئے کہ کاغذ کا وہ پُرزہ جس پر صادقین کا پتہ لکھا ہوا تھا کہیں ضائع ہو گیا اور چونکہ وہ انگریزی یا فرنچ نہیں جانتے تھے اس لئے کسی کو اپنی منزل کا پتہ نہ بتا سکے۔ کافی دیر کے بعد اُنہیں یاد آیا کہ انگریزی میں باپ کو "فادر" کہتے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایئرپورٹ کے عملہ کی ایک خاتون سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر صرف دو الفاظ کہے۔ "صادقین۔ فادر۔" یہ سنتے ہی مسئلہ حل ہو گیا اور عملہ نے فوراً اُنہیں صادقین کی قیام گاہ پر پہنچا دیا۔

(یہ سُن کر سلطان احمد صاحب کافی دیر ہنستے رہے پھر جواباً کہا)

سلطان احمد : ہرگز نہیں۔ کسی نے اپنی دانست میں صادقین کی شہرت میں اضافہ کرنے کے لئے یہ واقعہ گھڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دادا جنہیں ہم سب اباجی کہتے تھے ہمارے خاندان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے اور یہ تعلیم اُنہوں نے علی گڑھ میں حاصل کی تھی۔ بلکہ اُن کا ارادہ ایم۔بی۔بی۔ایس کر کے ڈاکٹر بننے کا تھا جس کے لئے اُنہوں نے علی گڑھ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آگرہ کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا لیکن جیسا کہ اُس زمانے میں زمیندار خاندان کے نوجوانوں کا مزاج ہوا کرتا تھا وہ اپنی تعلیم پر سنجیدگی سے توجہ نہ دے سکے اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مجاہد : بہرحال صادقین کے والد کے پیرس جانے کا واقعہ صحیح ہے۔

سلطان احمد : جی ہاں۔ ۱۹۶۷ء میں چچا جان پیرس میں تھے اور اُنہوں نے اباجی کو اپنے پاس بُلا لیا تھا کہ یورپ کی سیر کرائیں گے اور واپسی میں اُن کی خواہش کے مطابق عراق میں کربلا اور نجف کی زیارت کراتے ہوئے واپس لے آئیں گے۔ لیکن وہاں

پہنچ کر ہمارے دادا کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کے علاوہ اُنہیں پیرس کا ماحول بھی پسند نہیں آیا۔ چنانچہ چچا جان نے جو کافی عرصہ سے پیرس میں رہ رہے تھے فوراً واپسی کا پروگرام بنالیا اور اباجی کی خواہش کے مطابق اُنہیں عراق لے گئے اب آپ اسے معجزہ سمجھ لیں یا اباجی کا عقیدہ کہ کہاں تو وہ پیرس میں چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن کربلا پہنچتے ہی وہ بالکل تندرست ہوگئے اور تمام زیارتیں بجالائے۔ (کچھ لمحات کا وقفہ) میں آپ سے یہ عرض کردوں کہ میرے علاوہ ہمارے گھر کے تمام افراد یورپ اور دوسرے ممالک کا سفر کرچکے ہیں۔

مجاہد: یہ بات تو صادقین خود اپنی ایک رباعی میں کہہ گئے ہیں کہ اُن کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ آپ یہ بتائیے کہ انہوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا کہ نہیں۔

سلطان احمد: جی نہیں۔ نہ اُن کا کوئی استاد تھا اور نہ شاگرد۔ البتہ اُن کے انتقال کے بعد نقال بہت سے پیدا ہوگئے ہیں۔ اُن کی ڈرائنگز کی نقلیں بڑی تعداد میں تیار ہو رہی ہیں اور ایک بڑی بد دیانتی یہ ہے کہ اُن پر صادقین کے جعلی دستخط بھی کردیئے جاتے ہیں پھر بھاری قیمت پر اُنہیں فروخت کردیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو آرٹ گیلریز میں اس قسم کی تصاویر کی نمائشیں بھی ہو رہی ہیں اور لوگ صادقین کے پرستاروں کو دھوکہ دے کر ناجائز پیسے کما رہے ہیں۔

مجاہد: کیا یہ صحیح ہے کہ صادقین اپنے فن کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے؟

سلطان احمد: معاوضے کے سلسلہ میں پہلے یہ وضاحت کردوں کہ وہ سارے کام بلا معاوضہ نہیں کرتے تھے۔ ہر کام کے لئے اُن کی اپنی مرضی کو اوّلیت حاصل ہوتی تھی۔ اُن کا دل چاہتا تو بڑے بڑے کام بلا معاوضہ بھی کردیتے تھے اور مرضی نہ ہوتی تو کوئی خزانہ بھی سامنے رکھ دیتا تو قبول نہ کرتے۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو صرف پیسے کی خاطر اپنے آپ کو فروخت کردیتے ہیں۔ دوسری کمزوری اُن کی یہ تھی کہ کبھی کسی کام کا معاوضہ پہلے سے طے نہیں کرتے تھے جس کے نتیجہ میں کبھی کبھی کام مکمل کرنے کے لئے اُنہیں اپنے پاس سے رقم بھی لگانی پڑتی تھی۔ جو سالوں میں وصول ہوتی تھی۔ اُنہوں نے کبھی شخصی اداروں کا کام نہیں کیا۔ ہمیشہ پبلک اداروں کا کام کرتے تھے۔ اسی طرح فلاحی اور تعلیمی اداروں سے وہ کسی بڑے سے بڑے کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

مجاہد: نمائش میں جو اُن کی تصاویر رکھی جاتی تھیں، اُن کی قیمت لیتے تھے یا نہیں؟

سلطان احمد: اُنہوں نے کبھی اپنی کوئی نمائش کاروباری نظریے سے نہیں کی۔ مشرق وسطیٰ کی ایک نمائش کے دوران ایک دولتمند شیخ نے اُن کی ایک خطاطی کی قیمت پوچھی تو اُنہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ فروخت کے لئے نہیں ہے۔ شیخ بہت حیران ہوا اور منہ مانگی قیمت دینے کا وعدہ کیا لیکن صادقین پھر بھی انکار کرتے رہے۔ شیخ کے چہرے پر شکستگی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ دولت سے دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے مگر صادقین نے اُس کے اس غرور کو توڑ دیا تھا۔ اور صادقین اس کی اس حالت پر فتحمندانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے اپنی اس کامیابی کو دوآتشہ کرنے کے لئے وہ خطاطی اٹھائی اور تحفہ کے طور پر اُسے پیش کردی۔

مجاہد: حکومت پاکستان نے صادقین اور اُن کے فن کی سرپرستی کے لئے کیا اقدامات کئے؟

سلطان احمد: سرکاری سرپرستی کی اُنہیں ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ تو عوامی آدمی تھے۔ بلکہ وہ جو پروگرام بناتے تھے۔ سرکاری ادارے خود اُس میں شریک ہوجاتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے اُن سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ ہر حکومت کے قریب ہوجاتے ہیں تو جواب میں اُنہوں نے کہا تھا کہ یوں کہیئے کہ جو حکومت آتی ہے وہ خود میرے قریب ہوجاتی ہے۔

مجاہد : کیا وہ حکومت کے ان اقدامات سے مطمئن تھے؟

سلطان احمد : وہ طبعاً ایک مطمئن شخص تھے۔ اُنہیں اس قسم کے اقدامات کی ضرورت تھی نہ پرواہ

مجاہد : صادقین کو پرائڈ آف پرفارمنس کا اعزاز بھی تو دیا گیا تھا۔ اس کا اُن پر کیا ردِعمل تھا؟

سلطان احمد : کچھ بھی نہیں۔ اس اعزاز کے مقابلہ میں وہ اُن چند الفاظ پر زیادہ فخر کرتے تھے جو ملک میں اور ملک کے باہر عام لوگ اپنے خلوص و محبت کے جذبہ میں کہہ دیا کرتے تھے۔ ورنہ یوں تو ان کو تمغۂ امتیاز، ستارۂ امتیاز اور متعدد غیر ملکی لیکن بین الاقوامی شہرت کے اعزازات بھی ملے تھے۔

مجاہد : رباعیات کے علاوہ کیا صادقین نے دوسری اصناف میں بھی شعر کہے ہیں؟

سلطان احمد : جی ہاں۔ ابتدائی دور میں کچھ غزلیں اور نظمیں وغیرہ بھی کہی تھیں جو اُن کے مجموعہ "جزو بوسیدہ" میں شائع ہوئی ہیں۔

مجاہد : رباعی کی طرف رجحان اور دلچسپی کی کوئی خاص وجہ تھی؟

سلطان احمد : وہ خود کو فقیروں اور درویشوں کی صف میں شمار کرتے تھے۔ سرمد سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس قبیلے کے لوگوں کی پسندیدہ صنفِ سخن رباعی تھی اس لئے اُنہوں نے بھی رباعی میں طبع آزمائی کی۔

مجاہد : صادقین شاعر ہوتے ہوئے کبھی مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟

سلطان احمد : دراصل وہ شہرت کے لئے کسی SHORT CUT کے قائل نہیں تھے۔ جب وہ ہندوستان گئے تھے تو وہاں اُن کے اعزاز میں شعری محفلیں منعقد ہوئی تھیں۔ وہاں اُنہوں نے شرکت بھی کی اور اپنا کلام بھی سنایا۔ اس کے علاوہ جہاں تک مجھے یاد ہے پاکستان میں اُنہوں نے ساداتِ امروہہ کے پاک و ہند مشاعرے میں صرف ایک بار شرکت کی تھی جو فیض کی یاد میں منعقد ہوا تھا۔

مجاہد : صادقین ساری دنیا میں جانے پہچانے جاتے تھے اور تقریباً ہر ملک میں اُن کے مدّاح اور پرستار تھے۔ اس حوالے سے وہ کس ملک میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے؟

سلطان احمد : بنیادی طور پر وہ بین الاقوامیت کے قائل تھے اور اپنے آپ کو پوری دنیا کا شہری تصور کرتے تھے لیکن وہ اپنے معاشرتی ماحول سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اُنہیں ایسے کئی مواقع ملے کہ یورپ یا امریکہ میں بس جاتے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ سن ساٹھ کی دہائی میں اُنہوں نے یورپ کے کئی پھیرے کئے مگر کبھی بھی چند ماہ سے زیادہ قیام نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۸۱ء میں جب ہندوستان گئے تو وہاں چودہ مہینے گزار دیئے کیونکہ بنیادی طور پر وہاں اُن کا اپنا معاشرتی ماحول تھا جو کہ پاکستان سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مجاہد : کیا ساری دنیا گھومنے کے بعد اُن کے نظریات و خیالات میں کوئی فرق پیدا ہوا تھا۔ کس ملک یا کہاں کے لوگوں سے زیادہ متاثر تھے۔

سلطان احمد : متاثر ہونے والی تو وہ شخصیت ہی نہیں تھے۔ پھر نظریہ اور خیال بدلنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے جو بھی کام کیا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور جداگانہ تھا۔ ان کی مصوری کے انداز کو دنیا کے کسی SCHOOL OF ART سے متاثر نہیں کہا جا سکتا۔ خطاطی کا اُنہوں نے اپنا الگ اسلوب ایجاد کیا۔ البتہ وہ ملک و قوم کی اخلاقی، تہذیبی اور فنی ترقی کے قائل ضرور تھے۔ اس سلسلہ میں وہ فرانس کو سب سے بہتر سمجھتے تھے کیونکہ وہاں فنکار

کی حیثیت سب سے زیادہ بلند سمجھی جاتی ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہمارے ملک اور ہماری قوم میں بھی ایسا ہی شعور پیدا ہو جائے۔

مجاہد : "صادقین آرٹ گیلری" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سلطان احمد : یہ ہماری بلدیۂ عظمیٰ کراچی کا ایک بڑا مستحسن اقدام ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ بلدیۂ عظمیٰ کی قیادت کے باشعور ہونے کا ثبوت ہے۔ اصل میں قومیں اپنے تہذیبی ورثے کی وجہ سے ہی تو پہچانی جاتی ہیں اور آرٹ اس ورثے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کو جتنا محفوظ کیا جائے، عام لوگوں کو اُس کے دیکھنے کے لئے جتنے مواقع فراہم کئے جائیں اور جتنی زیادہ اس کی تشہیر کی جائے اتنا ہی یہ پھلے پھولے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس جانب بہت کم توجہ دی گئی۔ بلدیۂ عظمیٰ کراچی، پاکستان کا پہلا ادارہ ہے جس نے فن کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے اس کے لئے ہم سب کو اس ادارے کا شکر گزار رہنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہتا چلوں کہ بلدیہ کو تو جو کرنا تھا اُس نے کر دیا۔ بہترین گیلری بنا دی، مگر فنی طور پر ابھی گیلری "صادقین" مکمل نہیں ہوتی ہے۔ صادقین جیسے فنکار کی فنکاری کے جتنے نمونے اس گیلری میں ہونے چاہئیں۔ وہ وہاں نہیں ہیں۔ اب یہ کام ہمارا اور صادقین کے اُن دوستوں کا ہے جن کو انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار تصاویر، کسی کو تحفتاً اور کسی کو امانتاً دی تھیں وہ تعاون کریں اور اپنے گھروں میں آویزاں ان تصاویر میں سے ایک دو تصویریں گیلری کو پیش کریں تاکہ یہ گیلری صادقین کے نام اور فن کے شایانِ شان بن سکے۔

مجاہد : صادقین کی کوئی ایسی خواہش جو اُن کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی ہو۔

سلطان احمد : آپ کے اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ایک قناعت پسند شخص تھے۔ دوم جو عزت، شہرت، دولت اور محبوبیت اُنہیں حاصل تھی اُس کے بعد مزید کسی خواہش کی بھلا کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ اُنہوں نے اپنے لئے کبھی کسی چیز کی آرزو ہی نہیں کی۔ وہ تو خود ہزار زحمتیں اُٹھا کر دوسروں کو خوش کرنے والے انسان تھے۔

مجاہد : صادقین کی کوئی وصیت؟

سلطان احمد : جی ہاں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو شاید چند لوگوں کو ہی معلوم ہو۔ اُنہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ اُنہیں دفن کرنے کے بجائے دریا بُرد کر دیا جائے۔ اس کی وجہ بھی اُنہوں نے خود ہی بیان کر دی تھی کہ وہ زمین کی انفرادی ملکیت کے اس درجہ خلاف تھے کہ زندگی تو زندگی، مرنے کے بعد بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا دو گز کا ٹکڑا اُن کے نام ہو اور وہ اُس پر قابض رہیں۔

مجاہد : کیا صادقین کی اس وصیت پر عمل کیا گیا تھا؟

سلطان احمد : جی نہیں۔ یہ ہمارے بس میں نہیں تھا، اُنہیں سخی حسن کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

مجاہد : بہت بہت شکریہ سلطان احمد صاحب! آپ نے اپنا قیمتی وقت طلوعِ افکار کے صادقین نمبر کے لئے دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ آج کی یہ گفتگو قارئین کے لئے دلچسپی اور معلومات میں اضافے کا باعث ہوگی اور وہ صادقین کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو سے واقف ہوں گے جو دیگر اہلِ قلم حضرات کی تحریروں میں واضح نہیں ہوا تھا۔

حسنین جاوید

صادقین کا نیا رُوپ

ملک کے مختلف سماجی اور مذہبی حلقوں کے شدید احتجاج اور طلبہ کے زبردست مظاہرے کے بعد شیطان صفت مصورصادقین کی فحش مصوری کے شاہکار اب اس بے ہودہ اور غلط پروپیگنڈے کے ساتھ پنجاب کونسل آف آرٹس سے غائب کر دیئے گئے ہیں کہ یہ عریاں شاہکار تو نمائش کے لئے پیش ہی نہیں کئے گئے تھے اور یہ محض مخالفوں کا صادقین کے خلاف پروپیگنڈہ ہے ۔مکروہ صورت اس مصور کی پینٹنگز کی نمائش گاہ کی حالت اب یہ ہوگئی ہے کہ مین دروازے سے ”لو کر چکا صادقین ترک اسلام“ والا بورڈ اس طرح غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔اس کی جگہ اب

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کا بورڈ اس بات کا مظہر ہے کہ صادقین نے اپنا اصلی چہرہ چھپانے کی ٹھان لی ہے۔ اب ”نفاست بوسہ“ ”طہارت بوسہ“ اور ”نزاکت بوسہ“ کے عنوانات کی تین تصویریں بھی اس طور پر غائب کر لی گئی ہیں کہ ایک نئی تصویر کے نیچے یہ تینوں عنوان سجا دیئے گئے ہیں جبکہ موضوع کے اعتبار سے تصویر اور عنوانات میں کسی طور کوئی مماثلت نظر نہیں آتی ۔ اسی طرح دوسری عریاں تصاویر کی جگہ بھی نئی تصاویر آویزاں کر کے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

ترکِ اسلام کے بعد پاکستانی عوام اور خصوصاً نئی نسل کو اپنی عریاں اور فحش تصاویر کے ذریعے ذہنی طور پر جنس اور فحاشی کے میدان میں گھسیٹ کر تباہ کرنے کی سازش کرنے والا یہ مصور جس طریقے سے بہروپ بدل رہا ہے اور اپنے شیطانی چہرے کو مختلف نقابوں سے چھپا رہا ہے ۔ وہ قابلِ مذمت فعل ہے لیکن عوام کو بار بار دھوکہ نہیں دیا جا سکتا اور وہ شیطان کو لاکھ پردوں میں بھی پہچاننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ تصاویر تو پنجاب آرٹس کونسل کے ہال سے غائب کر دی گئیں ۔ مصلحتاً یا کسی نیک دل افسرِ اعلیٰ یا حاکم کے حکم پر لیکن سرکاری خرچ پر فحاشی کو فروغ دینے والی کونسل کے سربراہ کے خلاف، حکومت کیا کارروائی کر رہی ہے ؟ عوام اس خبر کے منتظر ہیں۔

ایک نمائش صادقین کے فن پاروں کی ان دنوں پنجاب آرٹس کونسل کے تہ خانے میں کچھ اس طور سجی ہے کہ جو بھی اس تہ خانے سے تخلیقات کا معائنہ کر کے باہر نکلتا ہے چہرے پر پسینے کے قطرے اور دانتوں میں انگلی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یا تو تہ خانے میں گرمی کچھ زیادہ ہی ہے یا پھر وہاں کوئی ایسی گرما گرم تخلیقات ہیں کہ جنہیں دیکھتے ہی اہلِ نظر کے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں اور انگلی بے اختیار دانتوں میں دبائے وہ اس تہ خانے سے شرمندگی کے جذبات کے ساتھ برآمد ہوتے ہیں ۔ایک وقت تھا کہ صادقین کا نام سنتے ہی ذہن ان قرآنی آیات کی طرف مبذول ہو جاتا جنہیں صادقین نے نہایت مہارت اور خوبصورتی سے مصوری اور خطاطی کے سہارے زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب بنا کر عوام اور خواص کے سامنے پیش کیا اور خوب خوب دادِ تحسین حاصل کی۔ انہی فن پاروں کی وجہ سے صادقین کا نام بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ وہ صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی اپنی تخلیقات کی وجہ سے ممتاز ہوئے اور اپنے مداحوں میں غیر ملکیوں اور خصوصاً اسلامی ملکوں کے باشندوں کو بھی شامل کر لیا ۔ وہ پاکستان سے نکلے تو دنیا

نذرِ فنکار

رئیس امروہوی، راغب مراد آبادی، ساحر لکھنوی
محسن احسان، قدرت نقوی، حسین انجم،
نجمہ خان، مسلم شمیم اور وقار فاروق۔

رئیس امروہوی

مرزا غالب ـــ اور ـــ صادقین

مرزا غالب سے گفتگو اپنی
عالمِ خواب میں ہوئی کل رات

اسد اللہ خان غالبِ وقت — اللہ اللہ وہ رندِ خوش اوقات
دیکھتا کیا ہوں حوضِ کوثر پر — شاعروں کے وہ قبلۂ حاجات
غرقِ دریائے کیف ہیں بلکہ — غرقِ دریائے کیف و کیفیات
وہ تماشا، جہاں تماشائی — مرزا نوشہ تو اہلِ ذوق برات
دل تھا مغلوبِ غالبِ مرحوم — میں نے بعد از ادائے تسلیمات

اسد اللہ خان غالب سے
اِس طرح کی گذارشِ حالات

شوقِ بیتاب کھینچ لایا ہے — کعبۂ شوق و قبلۂ حاجات
کہیے باغِ بہشت میں کیا ہیں؟ — آپ کے صبح و شام معمولات
صادقین آپ سے ملے ہوں گے؟ — وہ مرقع نگارِ محسوسات
وہ مصوّر کہ موقلم جس کا — درحقیقت تصورِ جذبات
وہ قلندر صفت کہ جس کا وجود — رونق افزائے جلوہ گاہِ حیات
وہ رباعی نویس و نظم نگار — جس کی ہر ایک بات میں اِک بات
آپ کے ذوقِ فن سے صادق تھا — صادقین آہ رندِ نیک صفات
پیر و مرشد! مریدِ کہنہ سے — کچھ تو ارشاد بلکہ ارشادات

سُن کے بسمل سی گفتگو میری
ہنس دیئے غالبِ ستودہ صفات

مرزا نوشہ نے مجھ سے فرمایا — ہم نے سُن لیں تمہاری معروضات
تم نے چھیڑا ہے صادقین کا ذکر — ہے بہشتِ بریں میں وہ دن رات
اُس سے رضواں نے یہ گذارش کی — خُلد کو وجہِ ناز آپ کی ذات

موقلم کا دکھایئے اعجاز
کیجیے خُلد کو بہشت صفات

اِس کے نقش و نگارِ کہنہ میں — پھونکیے موقلم سے رُوحِ حیات
آج کل صادقین کا معمول — آج کل صادقین کی عادات

بس یہی ہیں کہ جنتِ تازہ
جلوہ گر ہو بصد جمال و صفات

راغب مراد آبادی

رُباعیات

طلوعِ افکار کے صادقین نمبر کے لئے

تھا ذہنِ رسا بہرِ رسا یہ نفظ کُن کا
یکتائے زماں تھے صادقین اے راغب
مشکل ہے بیان، اُن کے اک اک گُن کا
بے مثل و نظیر مُوقلم تھا اُن کا

آیاتِ الٰہی کی جو خطّاطی کی
تھا سُورۂ ن وَالقلم ہی کا یہ فیض
طرزِ تحریر بھی الگ سب سے رہی
مسرور ہوئی روحِ رسولِ عربی

امروہے کی خاک ہی سے تھا اُن کا خمیر
کہئے اُنہیں کیوں مانی و بہزاد کا مثل
لاریب، مصوّر تھے وہ بیدار ضمیر
حقّا تھے صادقین آپ اپنی نظیر

اعجازِ مصوری کی، دُنیا میں تھی دُھوم
وہ زندۂ جاوید ہیں، راغب، بخُدا
فن پر اثر انداز تھے، عظمت کے نجوم
کیسے کہوں صادقین کو میں مرحوم

سیّد تھے صادقین، امروہے کے
شاعر بھی تھے صادقین، اک معیاری
میرے اُن کے پیار کے تھے رشتے
رُوحِ خیام تھی بہت خوش اُن سے

کیا کچھ نہ تھے صادقین، غم خوار پڑھیں
خطّاط، مصوّر اور فن کار پڑھیں
اور شکر ادا کریں حسین انجم کا
پڑھنے کی طرح "طلوعِ افکار" پڑھیں

ساحر لکھنوی

قلم اور موقلم

قلم تخلیقِ حرفِ "کُن فکاں" ہے — قلم فکرِ مشیت کی زباں ہے
ازل میں کاتبِ تقدیر نے بھی — اسی سے لوح پر تقدیر لکھی
یہی ہے کاشفِ رازِ حقیقت — یہی ہے کاتبِ احکامِ قدرت
دبیرِ بزم آرائے فلک ہے — انیسِ فن کو بھی اس کی للک ہے
پیمبرِ کاروانِ علم و فن ہے — عصائے موسیٔ طورِ سخن ہے
نشاں ہے خسروِ علم و ہنر کا — علم ہے لشکرِ اہلِ نظر کا
ادب کو زندگی ملتی ہے اس سے — حیاتِ دائمی ملتی ہے اس سے
اسی سے میر و غالب سب ہیں زندہ — مرے سو سال پہلے، اب ہیں زندہ
قلم کا ایک جلوہ موقلم ہے — یہی صورت گرِ ہر کیف و کم ہے
وہ کلکِ کاتبانِ خوش رقم ہے — مصور کا قلم یہ موقلم ہے
دھنک کے رنگ ہیں اس کی جبیں میں — کھلاتا ہے یہ گل بنجر زمیں میں
رنگوں کا ایک سیلِ بیکراں ہے — جو اس کی خوش خرامی سے رواں ہے
کھلاتا ہے یہ فن کے لالہ و گل — بناتا ہے یہ تصویرِ تخیل
کرے مشاطگی کے جب ارادے — تو کاغذ کو عروسِ نو بنا دے
ملے جو ڈوب کے رنگِ ہنر میں — سماں گلشن کا پھر جائے نظر میں
جو رنگ اپنا جما دے کینوس پر — نظر والے بھی دھوکا کھائیں اکثر
جو کاغذ پہ بنائے صورتِ گل — تو اس پہ مستقل منڈلائے بلبل
جو منظر عام نظروں میں ہوں سادے — یہ فن کار ان کو بھی رنگیں بنا دے
قلم کا کام کرنے پہ جو آئے — قلم کو سب کی نظروں سے گرائے
یہ جب لکھتا ہے آیاتِ الٰہی — خراجِ فن اسے دیتی ہے شاہی
مصور اس سے خطاطی کرے جب — تو حرف اس کی زباں سے بول اٹھیں سب
کھِل اٹھیں دائرے جو یہ بنائے — کشش کافِ کرم کی گنگنائے
جو اعجازِ قلمکاری دکھا دے — تو ساحر کی طرح جادو جگا دے
اگر یہ سورۂ رحمان لکھ دے — تو گویا اپنی ہی پہچان لکھ دے
اسی کی شوخیٔ رفتار کا رنگ — زمانہ دیکھتے ہی ہو گیا دنگ
تھے نازاں مانی و بہزاد اس پہ — فدا چغتائی سا استاد اس پہ
قلم اور موقلم ایسے حشم کا — قلم تھا صادقینِ حق رقم کا

"قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
بدستِ صادقینِ جانِ جانم"

محسن احسان

صادقین

رنگ کھاتا رہا، لفظ پیتا رہا
زندگی
تیرے چہرے میں وہ
تازگی اور تابندگی کی رمق دیکھنے کی تمنا لیے
کتنی تاریک اندھی گپھاؤں میں جیتا رہا
آرزوؤں کے سب چاک
اور خواہشوں کے دریدہ گریبان سیتا رہا
زندگی
تو نے دیکھا نہیں
اُس کی سب انگلیاں
تیری زلفوں کے پیچاک میں
چند نوخیز بیلے کی کلیاں سجاتے ہوئے
مُڑ گئیں
زندگی تو نے دیکھا نہیں
رُوح اس کی توانائیوں کے گلستاں کی وہ نُور پَرور
ہَوا تھی کہ جس میں
کئی مہ لقاؤں کے اَبر و صبا سے
ملائم بدن بھیگتے تھے
کوئی رس میں ڈوبی ہوئی پدمنی
کوئی مست الھڑ حسیں کامنی
کوئی انگڑائی لیتی ہوئی راگنی
کوئی [illegible]

کوئی چمپا کلی
کوئی آہوئے دشتِ خطا
کوئی بدہوش و سرشارِ بنتِ حیا
کوئی کافر گھٹا
کوئی آوازِ نازو نمو
کوئی شمشادِ آئینہ رُو
کوئی شامِ شگوفہ و صبحِ گہرتاب کی اوّلیں آرزو
اور کوئی موجِ صہبائے کہنہ کا رقص و غنا
کوئی شبنم بدن
کوئی جادُو نگاہ
کوئی شہ پارۂ مہر و ماہ
اس کی نوکِ قلم سے
خانۂ کم و کیف میں ڈھل گیا
اُس کا جادُو
فقیہانِ یزداں در آغوش پر چل گیا
زندگی تو نے دیکھا نہیں
زندگی تو نے دیکھا نہیں

قدرت نقوی

نذرِ صادقین

جاذبِ قلب و نظر، پرکشش و رُوح کشاں
طیفِ رنگین بصد رنگ، درخشاں تاباں

ہر کشش، ہر کشش و مایۂ فکرِ انساں
دائرہ، قوس نما، نصف کشیدہ جولاں

آسماں، اوجِ تصوّر، پئے تصویرِ نہاں
ذوق انگیز، بصد جلوہ، زمین آساں

جنبشِ موقلمِ رنگ فشاں، دستِ رواں
صادقینِ عمل اندازِ جلی و شاداں

فنِ خطاطی منقوش و مشجر، نازاں
حسنِ زینت، پئے آیاتِ کلامِ یزداں

حسین انجم

قامت و زلفِ بتاں پیمود و رفت
مدحتِ شعلہ رخاں فرمود و رفت
کرد دوبیتی برائیشش انتخاب
دولتِ حسنِ بیاں افزود و رفت

اُس پہ خدا کا فضل و کرم انتہا کا تھا
شاعر غضب کا اور مصوّر بلا کا تھا
تھا سجدہ گاہِ فرض گزارانِ اہلِ حق
دامن جو اس فقیرِ درِ مصطفیٰ کا تھا
وہ معتقد تھا حضرتِ سرمد شہید کا
ادنیٰ غلام بادشۂ کربلا کا تھا
غالبؔ کے وہ کلامِ بلاغت نظام کا
صورت گرِ مطالب و معنیٰ بلا کا تھا
وہ تھا سخن طرازِ رباعی کی صنف میں
عاشق جنابِ جوشؔ کے طرزِ ادا کا تھا
صورت گری ماہ رخاں تھی کمال کی
عاشق وہ چشم و عارض و زلفِ دوتا کا تھا
وہ مردِ حُر اسیر تھا زلفِ دراز کا
مقتول وہ جری نگۂ سرما سا کا تھا
مثلِ شمیمِ گل اِدھر آیا اُدھر گیا
وہ گلشنِ حیات میں جھونکا صبا کا تھا
عقبیٰ میں کیوں نہ نقش نگاری ہو اس کا کام
دنیا میں خوش نویس، کتابِ خدا کا تھا
انجمؔ تھا صادقین عجب رندِ باصفا
تھا جنتی اگرچہ وہ پتلا خطا کا تھا

نجمہ خان

مصورِ انسانیت

ایک انسان جو
عظمتِ آدمی کا نشاں ہو گیا
خونِ دل سے سدا
مصحفِ زیست کی سب تصاویر میں
رنگ بھرتا رہا
سب حقیقت کے رنگ
اور صداقت کے رنگ
حرفِ الفت کے رنگ

ایک انسان جو
ترجماں ہو گیا
پیار کے سارے بے نام جذبوں
اور فکر کی روشنی کے نئے رنگ سے
جس کے سحرِ قلم نے
زیست کے زرد چہرے کو رشکِ نگاراں کیا
تیرہ و تار شب میں چراغاں کیا
ایک انسان جو
راز داں ہو گیا
روح کے کرب کا، درد کا
اور زخموں پہ مرہم لگاتا رہا
تشنگی بھی لبوں کی بجھاتا رہا
نازِ انسانیت کے اٹھاتا رہا

ایک انسان جو
کہکشاں ہو گیا
آسمانِ محبت کی
اور
جس کے افکار سے
حرف و اشعار سے

دلنشیں ایک نغمہ بکھرتا رہا
ایک دلکش سا منظر ابھرتا رہا
یوں رُخِ زیست ہر دم نکھرتا رہا
ایک انسان جو
کامراں ہو گیا
یوں بظاہر لگا جیسے مدہوش تھا
کتنا باہوش تھا
اس کو احساس تھا
قرضِ انسانیت کا جو بارِ گراں اس کے کاندھوں پہ تھا
اور وہ خاموش تھا

ایک انسان جو
جاوداں ہو گیا
میری ارضِ وطن کا مصور بھی تھا
وہ مغنی بھی تھا
ایک فنکار تھا
ایک قلم کار تھا
دستِ فطرت کا وہ ایک شہکار تھا
خونِ دل سے سدا
مصحفِ زیست کی سب تصاویر میں
رنگ بھرتا رہا

مسلم شمیم

صادقین

"انگلیاں فگار اس کی۔ خامہ خوں چکاں اس کا"
حسن نور کی صورت آسمان سے اُترے
حرف روشنی ٹھہرے
بحر بیکراں غم کا، بس گیا رگ و پے میں
درد بیکرِ شب میں کہکشاں تصور میں
نقش بن کے اُبھرے ہیں صفحۂ تخیل پہ
صفحۂ تخیل پہ خونِ دل کی تحریریں
خونِ دل سے اُبھری ہیں فکر و فن کی تصویریں
"انگلیاں فگار اس کی خامہ خوں چکاں اس کا"
عرش کے مکینوں میں گفتگو قلم کی ہے
تذکرہ جنوں کا ہے
ذکر رنگِ خوں کا ہے
عرش کی فضاؤں میں غلغلہ سخن کا ہے
مہر و ماہ گردش میں، مہر و ماہ دامن میں
مہر و ماہ آنکھوں میں اس کی جگمگاتے ہیں
خواب چشمِ بینا کا، خواب چشمِ حیرت کا
خواب اس نے دیکھے بھی خواب اُس نے بانٹے بھی
خواب خوبصورت خواب آگہی کی رفعت کا
خوب تر سفر کا خواب
خوب تر جہاں کا خواب
حسنِ خوب تر کا خواب
نقشہائے رنگارنگ
روشنائی اشکوں کی مشعلوں کی لَو بن کر
چہرۂ محبت کو تابناک کرتی ہیں
زندگی کی راہوں میں روشنی کی محرابیں
"انگلیاں فگار اس کی۔ خامہ خوں چکاں اس کا"
شاعری کا سرمایہ۔ فکر و فن کا سرچشمہ
نوکِ خامہ سے اس کی چاندنی ٹپکتی ہے
روشنی نکھرتی ہے، تیرگی سمٹتی ہے
خامہ خوں چکاں اس کا اک جہانِ معنی ہے
انگلیاں فگار اس کی
خیر و شر کی دنیا میں خیر کی علامت ہیں
انگلیاں فگار اس کی روشنی کی قندیلیں
کرب کی ہیں تصویریں،
جبر کی نفی جن سے جہل کی نفی جن سے
کفر کی نفی جن سے صبح و شام ہوتی ہے
وہ سفیرِ دانائی، وہ نقیبِ بینائی
خامہ خوں چکاں اس کا حسن کا مصور ہے
عشق کا مفسر ہے،
زیست کی صداقت کا وہ امین و پیغمبر
وہ صحیفۂ غم کا معتبر مصنف ہے
"انگلیاں فگار اس کی خامہ خوں چکاں اس کا"

وقار فاروق

صادقین اک فسوں گر ہے

(گیلری صادقین دیکھ کر)

یہ پھول ہیں کتنے خوب صورت
یہ پھول کیسے مہک رہے ہیں
انہیں نہ توڑو
انہیں نہ سونگھو۔۔۔۔
وہ اک حسینہ
مہکتے پھولوں کی کیاریوں میں
جھکی ہوئی ہے
مہین ملبوس
اس کے الہڑ شباب کی
پُر غرور قوسوں کو
اور بھی کچھ نمایاں کرکے
ہوس کو ترغیب دے رہا ہے
مگر رُکو تو
تم اس کے نزدیک بھی نہ جانا
نہ اس کو چھونا
نہ مسکرانا نہ اس کو کوئی اشارہ کرنا
اُدھر تو دیکھو
وہ اک سپاہی
جو اسپ تازی کی باگ تھامے
کڑکتی وردی میں
اکڑی گردن لئے
جو اس سمت آ رہا ہے
چمکتی تلوار
اس کے اک ہاتھ میں ہے
اور ڈھال پُشت پر ہے
ڈرو نہ اس سے
کہ یہ حقیقی تو لگ رہا ہے
مگر حقیقی نہیں ہے یہ بھی
نہ وہ حسینہ نہ اس کا ملبوس
نہ وہ کیاری نہ پھول کوئی
یہ ہے مُرقع
عظیم فن کار کا مُرقع
کہ جس کے فن سے
کرامتِ مُوقلم سے جس کی
ہر ایک شئے زندہ ہوگئی ہے
صادقین اک فسوں گر ہے
صادقین ایک ایسا فن کار ہے
کہ جس نے
ہر ایک خط کو
ہر ایک نقطے کو زندہ جاوید کر دیا ہے
جو قوس ہے بولتی ہوئی ہے
جو رنگ ہے وہ مہک رہا ہے
جو نقش بھی ہے چہک رہا ہے

بقلمِ فنکار

مقالہ، مقدمہ، خودنوشت، سفرنامہ اور مکاتیب

از

صادقین

صادقین صدق

ہندوستانی مصوری

غرض و غایت، معنوی خصوصیات اور تاریخی پس منظر

زمانۂ قدیم کے باشندوں کے رسم ورواج، تہذیب اور تمدن، مذہب اور عقائد سے ہم کو کس طرح واقفیت ہوئی۔ اس طویل سوال کا جواب نہایت مختصر ہے۔ یعنی یہ صرف قدیم زمانے کے لوگوں کا فن تھا جس کے ذریعے سے اُن کے معیارِ زندگی، طرزِ معاشرت اور خیالات کو آنے والی نسلیں سمجھ سکیں۔ قدیم ہندوستان کا تمدن، دنیا کے قدیم ترین تمدنوں کی سب سے اگلی صف میں ہے اور یہ ملک کی دیرینہ عظمت اور شان و شکوہ کا مکمل ثبوت ہے۔ عہدِ قدیم کی جو اشیاء اور یادگاریں آج برآمد ہو رہی ہیں، وہ اُس زمانے کے لوگوں کی صرف تاریخ ہی کا پتہ نہیں دے رہی ہیں بلکہ ان فنکارانہ صلاحیتوں کے تکمیل شدہ ہونے پر مُہرِ تصدیق بھی ثبت کر رہی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے باشندے اونچے پہاڑوں کو پار اور وسیع سمندروں کو عبور کرتے ہوئے دور دراز ممالک میں گئے اور وہاں کے باشندوں کو نہ صرف اپنے خیالات سے وابستہ کیا بلکہ اپنے تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا حصہ بھی ان کو دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام جنوب مشرقی ایشیا خصوصاً اور شمالی اور مغربی ایشیا کے ہندوستان سے نزدیک علاقے عموماً اُس عہد کی اکثر اُن اشیاء سے بھرے ہوئے ہیں جن کو ہندوستانی فنون کا ایک عکس کہا جا سکتا ہے جن کے ذریعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے ایک ایسی زندگی بسر کر رہے تھے جس میں حرکت تھی۔ اُن کی حکمتِ عملی جمود شکن تھی۔ انہوں نے اطراف کے تمام ممالک کو دولت وفن سے مالا مال کر دیا تھا۔ فنِ عمارت اور سنگ تراشی کے اکثر حیرت انگیز نمونے ان علاقوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔

ہندوستانی مصوری کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی فن کی غرض و غایت کا جائزہ لیں۔ قدیم ہند کے تمام فنونِ لطیفہ کے پس پُشت اُس عہد کے باشندوں کے مذہبی تصورات اور اعتقادات ہیں جن کا نمایاں اثر ہم قدیم اور جدید دونوں ہی ہندوستانی فنون میں دیکھتے ہیں۔ مصوری، موسیقی، سنگتراشی وغیرہ بیان تصورات اور اعتقادات کا گہرا اثر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فن کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ہندوستانی مذہب کو بھی سمجھیں کیونکہ دونوں میں ایک گہرا ربط ہے۔

آریہ لوگ بڑی بڑی قوتوں کی عبادت قربانیوں کے ذریعے سے کرتے تھے۔ اُن کے یہاں مندر اور مورت بنانا ممنوع تھا۔ برخلاف اس کے برہمنوں کے یہاں عبادت کا یہی طریقہ تھا۔ وہ بڑی بڑی قوتوں کو انسانی شکل میں ڈھال کر عبادت کرتے تھے۔ اچھائی اور برائی کی قوتوں کی عبادت کرنے کے لئے ان کے یہاں اصنام تراشنا عام تھا۔ ایک زمانے میں قدیم یونان میں بھی یہی رواج تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی بڑی بڑی ذمہ دار کتابوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دیوتاؤں کی شبیہہ بنانا روح کو بلند تر کرتا ہے اور دیوتاؤں کے ملک تک لے جاتا ہے۔

غرض ہندوستانی فن کے پس پشت یہی عقیدے کارفرما ہیں جن کی نوعیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے مذہبی ماحول میں فن جس قدر بھی ترقی کرتا رہا وہ کم تھا۔ کیونکہ اسی کو اس دور کے انسان نے اپنی نجات کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا تھا۔ بُدھ مذہب کے رواج پانے کے بعد سے فنِ سنگتراشی نے جو کچھ حیرت انگیز ترقی کی اس کا اندازہ ہندوستانی فنِ عمارت سے ہو سکتا ہے۔ گوتم بُدھ کی شخصیت کی تصویر

اور مورت بنانا بہت زیادہ عام ہو گیا اور یہی جذبہ ہندوستانی سنگتراشی اور مصوری کا سنگِ بنیاد بن گیا۔

تاریخ

ہندوستانی مصوری، ہندوستانی سنگتراشی کے مقابلے میں بہت غریب ہے۔ ہندوستان میں مٹی اور پتھر سے مورتیں بنانا ایک مدتِ نامعلوم سے جاری ہے۔ اور اسی غیر معلوم مدت سے اب تک کی سنگتراشی میں ایک نہایت گہرا تسلسل پایا جاتا ہے لیکن مصوری میں یہ گہرا تسلسل مفقود ہے جس کی متعدد مقامی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس زمانے کے لوگوں کے پاس مصوری کا ساز و سامان اس قدر عام نہیں تھا جس قدر سنگتراشی کا تھا۔ دوسرے سنگتراشی کی طرف راغب ہونے کی وجہ ان کا مذہب بھی تھا۔ دیوتاؤں کی شکل مورتوں میں آسانی سے ڈھالی جا سکتی تھی اور اس کے دوش بدوش یہی مورت ان لوگوں کو ہموار سطح پر بنی ہوئی تصویر کے مقابلے میں، ان کی عبادت کے سلسلے میں زیادہ مطمئن بھی رکھ سکتی ہے کیونکہ اس میں لمبائی چوڑائی کے علاوہ موٹائی بھی ہوتی ہے اور اس میں انسانی شکل کی شباہت بھی ہوتی ہے اسی وجہ سے اصنام تراشی کے فن کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ یہ حقیقت سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے بہ نسبت فنِ مصوری کے جس کی سطح ہموار ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کا قدیم ماحول مصوری کے لئے اتنا موزوں نہیں تھا جس قدر بت گری کے لئے موافق تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدیم ہندوستان میں مصوری سراسر مفقود تھی۔ ان تمام امور کے باوجود ہندوستان کی قدیم مصوری دنیا کے اور ممالک کی مصوری کے رو برو ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ بدھ مذہب کے ابتدائی زمانے میں جس وقت گپت خاندان ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا، فنِ مصوری کی جو کچھ ترقی اور پرورش ہوئی وہ اجنتا کے غاروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے اس طرح اجنتا کے شاہکار ہندوستانی فنِ مصوری کے ایک بہت بڑے خلاء کو پُر کر دیتے ہیں اور آنے والے مصوروں کے لئے مصوری کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اجنتا کے غاروں کی تصویریں، ہندوستانی فنِ مصوری کی سب سے پہلی چیزیں ہیں۔ درحقیقت ہندوستان میں فنِ مصوری کا آغاز اس سے پیشتر ہی ہو چکا تھا جس کا کافی ذخیرہ ہم تک بھی پہنچا ہے اور باقی ماندہ یا تو ابھی انتظارِ تلاش میں موجود ہے یا وقت کے ہاتھوں ہی پامال ہو چکا ہے۔

ہندوستانی فنِ مصوری کو تاریخی اعتبار سے حسبِ ذیل حصوں میں بہ آسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

نیولوتھک زمانہ جس کو تاریخ سے پیشتر کا زمانہ مانا جاتا ہے اس کے بعد دریائے سندھ کی وادی کا تمدن جو ۳۰۰۰ قبلِ مسیح میں موہنجوداڑو اور ہڑپا میں تھا۔ اس کے بعد موریہ عہد اور اس کے پیشتر کا زمانہ آتا ہے جس کا اختتام ۲۰۰ قبلِ مسیح میں ہوا۔ اس کے بعد کشن اور اندھرا زمانے کا فن ہے جو پہلی اور تیسری صدی قبلِ مسیح میں جاری تھا اور پھر گپتا عہد کے فن کا نمبر آتا ہے جو چوتھی صدی عیسوی تک جاری رہا۔ گپتا عہد کے بعد قرونِ وسطیٰ کے فن نویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک جاری رہے اور پھر ان کی جگہ جدید فن نے لے لی۔

نیولوتھک عہد

ہندوستان میں مصوری کا آغاز کب ہوا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تاریخ نہیں دے سکتی۔ قدیم ترین زمانے کے مختلف شاہکار ملک کے عرض و طول میں دستیاب ہوتے ہیں۔ قدیم ترین عہد کے نمونے اسی قسم کے ہیں جس طرح کے مغربی ایشیا اور یورپ وغیرہ میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ طرز و طور کے لحاظ سے دونوں مقامات سے برآمد ہونے والے یہ نمونے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کا پتہ جنوبی مشرقی ایشیا میں بھی ملتا ہے۔ قدیم ہسپانیہ اور قدیم ہند کے ان نمونوں میں ایک گہرا ربط ہے۔ شمالی اور مشرقی ہندوستان کے بیشتر مقامات پر اسی قدیم عہد کی تصاویر قدرتی غاروں میں سے برآمد ہوئی ہیں جن کو نیولوتھک کا عہد قرار دیا گیا ہے۔ ان کے نشانات ضلع مرزاپور، ہوشنگ آباد اور سنگان پور میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوہ کیمور کے علاقے میں بھی ایسی تصویریں پائی گئی ہیں۔ قدیم ہندوستانی مصوری کے ان نمونوں میں مختلف قسم کے جانور دکھائے گئے ہیں جن میں کے بعض موجود زمانے میں پائے بھی نہیں جاتے۔ ان تصویروں میں صرف جانور ہی نہیں بلکہ انسان بھی ہیں۔ ایک تصویر میں کسی جانور کا ایک آدمی بلم کے ذریعے سے شکار ہی کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

موہنجو داڑو اور ہڑپا:۔ دریائے فرات اور اس کے معاون دجلے کا تمدن جب وقت اپنے عروج پر تھا عین اُسی زمانے میں دریائے سندھ اور اس کے معاون ستلج پر دو اہم تمدنی مرکز موہنجو دارو اور ہڑپا نامی ترقی کر رہے تھے۔ یہاں کے باشندوں کے دیگر فنون کو نظرانداز کر کے یہاں اُن کے فنِ نقاشی کا مختصر حال بیان کیا جائے گا۔

موہنجو دارو اور ہڑپا کے تمدن کی جہاں اور بہت سی یادگاریں دستیاب ہوئی ہیں وہاں اُن لوگوں کے فنِ نقاشی کے نادر نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں زیادہ تر جانوروں کی تصاویر شامل ہیں لیکن انسانی شبیہیں بھی بر آمد ہوئی ہیں جہاں تک ان لوگوں کے فنِ نقاشی کا تعلق ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ نہایت ہنرمند تھے جس کا ثبوت ہاتھی دانت کی وہ مہریں دیتی ہیں جن پر قسم قسم کے جانوروں کی تصویریں کندہ ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے نقش و نگار بھی ہیں۔ فی الحال فنِ مصوری کے سلسلے میں یہاں سے بر آمد ہونے والے برتنوں کو دیکھا جا سکتا ہے جن کی سیاہ یا سرخ سطح پر سرخ یا سیاہ نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ بعض برتنوں پر لکیر، مربع، مثلث اور دائروں کی مدد سے ایک خوشنما "ڈیزائن" بنا ہوا ہے۔ بعض پر جانوروں کی تصویریں ہیں اور بعض پر پھول بنائے گئے ہیں۔ جب دریائے سندھ کا یہ تمدن اور زیادہ وسیع ہوا اور بلوچستان تک پہنچا تو ان لوگوں کا ہنر اور زیادہ ترقی کر گیا۔

موریہ شنگھا اور اندھرا عہد میں فنِ نقاشی نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ مورتیاں بنانا، مندروں پر طرح طرح کے نقش و نگار کندہ کرنا اُس عہد کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ معلوم ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن لوگوں کو اس فن میں کس قدر مہارت حاصل تھی۔ لیکن اس عہد میں فنِ مصوری کی وہ شان نہیں تھی جو گپت عہد میں اِس فن کو حاصل ہوئی۔

ہندوستانی مصوری کی تاریخ میں گپت زمانہ سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے کی

اجنتا، باغ اور بادامی

مصوری کے خاص خاص مرکز اجنتا، باغ اور بادامی ہیں۔ ان سب تصویروں میں داستان سرائی ہے اور مذہبی قصّوں کا تصاویر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے صرف اُن لوگوں کے ہنرمند ہونے ہی کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ تصویریں اُن کے رسم و رواج کا بھی آئینہ ہیں۔

ہندوستانی فنِ تصویر میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل یہی تصویریں ہیں جو اجنتا کی دیواروں پر بنائی گئی ہیں۔ اِن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے باشندے تصویر نگاری میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ اگر ہم ان دلفریب تصاویر کو ہندوستانی مصوری کی روحِ رواں نہ کہیں تو یہ حقیقت سے انکار ہوگا۔ آج بھی ہماری مصوری کا سرچشمہ یہی تصاویر ہیں اور ہمارے موجودہ مصور انہیں سے "انسپائریشن" لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ ہندوستانی مصوری کا ایسا بڑا سرمایہ ہیں جن پر ملک ناز کر سکتا ہے۔

اجنتا اور باغ کی تمام تصاویر گپت عہد کی یادگاریں ہیں۔ اجنتا میں متعدد غار ہیں جن کی دیواروں کو ان تصویروں سے مزیّن کیا گیا ہے۔ اجنتا کی تعمیر یک وقت تسلسل کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ عیسائیت کی ابتداء سے شروع ہو کر ساتویں صدی عیسوی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ان تصویروں میں جو رنگ استعمال کئے گئے ہیں وہ معدنیات سے تیار کئے گئے تھے۔ ان رنگوں میں چمک ہے۔ سبز، زرد، سُرخ، سیاہ، نیلا اور کتھئی رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک حد تک قریب کی چیزوں کو بڑا اور دور کی چیزوں کو چھوٹا دکھانے کے اصول پر بھی عمل کیا گیا ہے۔ تاہم اس اصول کو اس حد تک نہیں برتا گیا جس قدر قرونِ وسطیٰ کے مغربی مصوروں نے اس پر عمل کیا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کے مصوروں کے سیکڑوں سال پیشتر کی تخلیق ہے۔

گپت عہد میں ہندوستان کے طول و عرض میں بدھ مذہب پھیل چکا تھا جس طرح بدھ مذہب سے پیشتر ہندوستانی فنکار اپنے

مذہبی عقائد کو اپنا سب سے بڑا "انسپائریشن" بناتے رہے ہیں۔ اسی طرح اُس زمانے میں بھی جب ہندوستان میں بُدھ مذہب کا دور دورہ تھا فنکاروں کا سب سے بڑا مقصد اپنے فن کے ذریعہ سے بُدھ مت کی تبلیغ کرنا تھا۔ بُدھ مذہب نے سنگتراشی پر جس قدر گہرا اثر ڈالا ہے اُس کی مثالیں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا کے متعدد علاقوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اجنتا کی دیواروں پر جو تصاویر ہیں اُن کو بُدھ مذہب کی تبلیغ اور پرچار کے سلسلے کی ایک کڑی ماننا حقیقت کے عین مطابق ہوگا۔ تمام تصاویر بُدھ نظریات پر مبنی ہیں۔ گوتم بُدھ کے حالاتِ زندگی کا تصاویر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اجنتا کے مصوروں نے اپنے شاہکاروں میں عورت کو ایک خاص جگہ عنایت کی ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے اجنتا میں عورتوں کی تصاویر عالمگیر شہرت کی مالک ہیں۔ زیادہ تر تصویریں عورتوں کی تصویروں پر مبنی ہیں جن کو مختلف اشغال میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ ان میں شہزادیاں بھی ہیں، اور کنیزیں بھی جو کہیں آرائشِ حسن میں مصروف ہیں تو کہیں عالمِ رقص میں۔ کہیں گا رہی ہیں تو کہیں اُن کے جلوس نکل رہے ہیں۔ باغ اور اجنتا کا بیشتر حصہ گپت عہدِ سلطنت کے زوال کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ اس بات سے ہندوستان کے اُن قدیم باشندوں کی قدرِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ گپت سلطنت تو ضرور زوال کر گئی لیکن گپت مصوری ترقی کرتی رہی۔

جین مذہب کے مقلدوں کی بنائی ہوئی اسی قسم کی تصاویر جنوبی ہند کے ایک مقام ستانا واسل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اجنتا کے بعد ترو ملائے پورم میں برہمنوں کے تخیلات سے وابستہ تصاویر ہیں جو ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کی یادگاریں ہیں۔ برہمنوں کے زمانے کی قدیم تصویریں کیلاش ناتھ مندر کی دوسری منزل کے دروازے کی چھت پر اب تک باقی ہیں جو آٹھویں صدی میں بنائی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں پانچویں صدی عیسوی کی اُس مصوری کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو لنکا میں سگریا کے مقام پر اب تک موجود ہے۔ گیارھویں صدی میں ہندوستانی مصور تنجور کی دیواروں کو منقش کرتے رہے۔ آٹھویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک ہندوستانی مصوری کا ایلورا میں سلسلہ جاری رہا۔ بارھویں صدی میں لنکا میں بُدھ مذہب پر چلنے والے لنکا کے باشندوں نے پولن ناروا میں اِس کے تسلسل کو جاری رکھا۔ اس کے بعد جا نگر کے زمانے میں مصوری پروان چڑھتی رہی۔ تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک گجراتی مصوری کا دَور دَورہ رہا۔ سولھویں صدی کے بعد سے راجپوت اور مغل مصوری نے ہندوستانی مصوری کی اُنیسویں صدی عیسوی تک نمائندگی کی اور جدید مصوری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

نویں صدی عیسوی کے مشرقی اسکول میں ڈھیمن اور بیت پالو دو اہم ترین مصور تھے۔ اس اسکول کی توجہ صرف سنگتراشی ہی کی طرف نہیں بلکہ مصوری کی طرف بھی مبذول رہی تھی۔

پالا اسکول گیارھویں اور بارھویں صدی کا اہم ترین اسکول تھا جس کی شہرت ممالکِ غیر میں بھی ہو چکی تھی۔ گیارہویں، بارھویں اور تیرھویں صدی کی اکثر یادگاریں بنگال اور نیپال سے دستیاب ہوئی ہیں۔ تاڑ کے پتوں پر اکثر بُدھ مذہب کے متعلق تحریریں ہیں جن کو لکڑیوں کی تختیوں کے ذریعے سے ڈھکا گیا ہے۔ لکڑی کے ان تختوں پر مصوری کی گئی ہے یہ تصویریں بعد میں آنے والی گجراتی تصویروں کے طرز و طور سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف برما کے اُسی زمانے کے مصوری کے شاہکاروں سے جو پاگن میں ہیں ملتی جلتی ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں ہندوستان کے مصور تاڑ کے بڑے بڑے پتوں پر اپنا شاہکار بنایا کرتے تھے۔ اس زمانے کی ان تاڑ پر بنی ہوئی تصویروں میں شکلیں کافی اچھی بنائی گئی ہیں اور باریک نوکدار ناکیں اور لمبی لمبی آنکھیں ان تصویروں میں عام ہیں۔ تصویر میں شکل کے علاوہ دوسرے حصّوں کو سُرخ یا نیلے رنگ سے بھر دیا گیا ہے۔

اِن تمام مذکورہ بالا امور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خیال کہ ہندوستانی مصوری ساتویں صدی عیسوی پر بالکل ختم ہوگئی اور اس کے بعد مغلوں

کے آنے پر اس میں از سرِ نو جان ڈالی گئی۔ بالکل غلط ہے۔ ہندوستانی مصوری کا تسلسل کم سے کم تعمیر اجنتا کے بعد سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ عہدِ متوسط میں مصوری اعلیٰ پیمانے پر جاری اور سنگتراشی کے دوش بدوش چلتی رہی۔

مغل اور راجپوت مصوری:۔ سولھویں صدی کے نصف سے سرزمینِ ہند پر ایک خاص مصوری کے طرز کا آغاز ہوتا ہے جس کو راجپوت مصوری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی جائے پیدائش راجپوتانہ تھی۔ یہ مصوری اپنے زمانہ میں ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اس کو ایک حد تک گجراتی مصوری کا جانشین بھی کہا جا سکتا ہے۔

راجپوت مصوری پر ایرانی اور مغل مصوری کا جو کچھ اثر پڑا ہے وہ دونوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ راجپوت مصوری میں ایک بڑی حد تک مغل عناصر پائے جاتے ہیں اور چند ہی تصویریں ایسی ہوں گی جن پر مغل مصوری کا نمایاں اثر نہیں ملے گا۔ لیکن پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ راجپوت مصوری نے اپنی انفرادیت کا دامن چھوڑ دیا۔ مغل مصوری کا راجپوت مصوری پر وہی اثر پڑا جو چینی مصوری کا ابتدا کے زمانے میں ایرانی مصوری پر پڑا تھا۔ ایرانی مصوری نے چینی مصوری سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن اپنے انداز و طرز کے رسم و رواج کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایرانی مصوری زندہ رہی اور ترقی پذیر ہوئی۔

ایرانی، مغل اور راجپوت مصوری میں تکنیک کے لحاظ سے کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ یہ تینوں اسکول ایک ہی قسم کے قواعد و قوانین پر عمل پیرا رہے۔ مثلاً قریب اور دُور کی چیزوں کو برابر بنانا، اپنی تصویروں میں صرف بالائی حصے کی ایک پٹی میں آسمان کا دکھانا، تأثرات اور دن میں کوئی نمایاں فرق نہ رکھنا، ان سب کے یہاں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔

جب راجپوت یا مغل مصور کسی منظر کو بناتا ہے تو اپنے مقام کو اس قدر بلندی پر فرض کر لیتا ہے کہ اُس کے منظر کی ایک ایک شے حدِ نظر میں آ جائے۔ کوئی شے کسی شے کے پس پشت رہ کر نظر سے اوجھل نہ ہو جائے اور ہر شے جو کچھ حقیقت رکھتی ہے اُسی کے مطابق بنائی جائے یعنی اگر کوئی انسان نزدیک کا بنایا اور کوئی درخت دور کا دکھایا ہے تو دونوں کو اُن کی جسمانی حیثیت کی نسبت سے برابر ہی بنائیں گے تاکہ دیکھنے والا دونوں چیزوں کی اصل حیثیت کو سمجھ لے۔

مضامین بھی زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ عام طور پر عشق و محبت کے متعلق تصویریں ہر جگہ کی مصوری میں عام ہیں اور یہ صفت ایرانی مغل اور راجپوت مصوری میں عام ہے۔ ناچتی اور گاتی ہوئی لڑکیاں بنانا ان تینوں اسکولوں کے مصوروں کا کام رہا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ملک کے حالاتِ گزشتہ کی نقاشی کرنا اسکولوں کے مصوروں کا اہم ترین "انسپائریشن" رہ چکا ہے۔ ایرانی مصوروں نے شاہ نامے کو مصور کیا۔ اسی طرح راجپوت مصوروں نے رامائن اور مہابھارت کے متعدد واقعات کو جامۂ تصویر میں ملبوس کیا۔ گذشتہ دور کے مشہور واقعاتِ عشق و محبت کو مصور کرنا بھی ان مصوروں کا اہم مشغلہ رہا ہے۔ جس طرح ایرانی مصنفوں کا خاص مضمون لیلیٰ مجنوں، شیریں اور خسرو کی تصاویر بنانا رہ چکا ہے اُسی طرح راجپوت مصوروں نے اکثر مقامات پر کرشن کو گوپیوں کے ساتھ کھیلتا ہوا دکھایا ہے۔ رادھا اور کرشن کی اکثر تصاویر میں رومانی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے دیگر راجپوت مصوری میں ناچ گانے کے مناظر دکھائے گئے ہیں اور اس طرح موسیقی کا ماحول پیدا کر کے راگوں اور راگنیوں کو دکھایا گیا ہے۔

مذہب نے اِن تینوں مصوری کے اسکولوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مذہب سے متعلق اکثر و بیشتر تصاویر راجپوت مصوری میں ملیں گی۔ ایرانی مصوری میں بھی، اسلام آنے سے پیشتر، انسانی اشکال کے بنانے کا رواج تھا لیکن اسلام آنے کے بعد انسانی اشکال کا بنانا مذہبی پیشواؤں نے ممنوع قرار دے دیا جس کی بدولت ایرانی مصوروں کی توجہ دوسرے مناظرِ قدرت کی طرف مبذول ہو گئی اور اپنی مذہبی کتابوں کے پہلے ورق کو نہایت حسین اور دیدہ زیب نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ کرنے لگے اور اس کام میں اُن کو ایک زبردست مہارت حاصل ہو گئی۔

مُغل مصوری، جو درحقیقت ایرانی مصوری کی ایک شاخ ہے اس روش سے بے نیاز رہی۔ مغل مصوروں کا سب سے اہم بلکہ واحد کام صرف انسانی شکل کا بنانا تھا جس کے سلسلے میں وہ دوسری اشیاء کو بھی اپنی تصویریں میں دکھاتے تھے۔

راجپوت مصوروں کے زیادہ تر کارنامے راجپوتانے کے اکثر محلوں کی دیواروں پر دیکھے جا سکتے ہیں کیونکہ راجپوت مصوری کی ابتدا سے کافی زمانے کے بعد تک کاغذ بہت زیادہ عام نہیں تھا۔ اس لئے وہ لوگ دیواروں پر اپنے کارنامے دکھانے کے لئے مجبور تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے پر تصویر بنانے کا رواج بھی تھا لیکن جیسے جیسے کاغذ ہندوستان میں آیا انھوں نے کاغذ کا استعمال شروع کر دیا۔

کنگڑا اسکول

راجپوت مصوری کے تحت اگر کنگڑا اسکول کی بیش بہا خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ سخت ناانصافی ہوگی، کیونکہ اسی اسکول کے تحت راجپوت مصوری نے حیرت انگیز ترقی کی اور جدت کی طرف قدم اٹھایا۔

راجپوت مصوری کا یہ اسکول، اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف میں راجہ سنسار چند کی قیادت میں قائم ہوا۔ اس زمانے میں اس سے ملحق اور اسکول بھی موجود تھے۔ انیسویں صدی میں اس اسکول کا زوال ہوا لیکن اس کی متعلقہ شاخیں بنگال اور اڑیسہ میں باقی رہیں۔

راجپوت مُصوری پر مغلیہ اثر کی وجہ

شہنشاہ اکبر جہاں اور فنون کا دلدادہ تھا وہاں فنِ مصوری کا بھی پرستار تھا۔ اُس نے مصوری کی بڑی سرپرستی کی۔ بسا اوقات خود اپنی تصویر کھنچوانے کے لئے مصوروں کے روبرو بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے دربار میں سَو سے زیادہ مصور تھے۔

عہدِ اکبری میں ہندو اور مسلمانوں میں جو کچھ اتفاق اور اتحاد تھا وہ تاریخ ہند میں بے نظیر ہے۔ اس کے یہاں بغیر امتیاز مذہب و ملت فنکاروں کی بڑی عزت تھی۔ خاص طور سے راجپوتوں سے اُس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راجپوت مصوروں پر مغل مصوروں کا گہرا اثر پڑا۔

راجپوت اور مُغل مصوری میں مضامین کا فرق ہے۔ راجپوت مصوری کے لئے راگوں، راگنیوں کی بڑی اہمیت ہے اور انہیں سے راجپوت مُصوری کا پیدائشی تعلق ہے۔ برخلاف اس کے مُغل مصوری ایک خالص درباری فن کہی جا سکتی ہے۔ اہلِ دربار کی تصویریں بنانا مغل مصوری کا کام تھا۔ یا اہلِ دربار کی گذشتہ تاریخ سے متعلق تصاویر بنانا اُن کی مصوری کا محدود مضمون تھا۔ مضمون کی نوعیت سے راجپوت مُصوری کافی وسعت رکھتی ہے۔

اکبر، جہانگیر اور شاہجہان، شہنشاہانِ مغلیہ میں مُصوری کے سب سے زیادہ پرستاروں میں سے تھے۔ ان کے زمانے میں مُغل مصوری اپنے عروج کی منازل میں قدم رکھ چکی تھی نیز جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے میں مُغل مصوری نے بڑی ترقی کی۔ لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں مذہبیت اور تعصب اور رجعت پسندی کی وجہ سے مُغل مصوری کا زوال ہو گیا اور اس طرح زوال ہوا کہ مغل مُصوری پھر نہ اُبھر سکی۔ اس کے بعد جس قدر بھی تصاویر بنائی گئیں اُن میں گذشتہ تصویروں کی سی خوبیاں نہ پیدا ہو سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مصوروں کے حالاتِ زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ عہدِ مغلیہ کے خاص خاص مصوروں کے نام ضرور معلوم ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے دربار کا خاص مصور عبدالصمد تھا۔ جہانگیر کے عہدِ سلطنت میں ابوالحسن نام کا مصور مخصوص درباری مصور تھا۔ شاہ جہاں کے دربار کے تمام مصوروں میں سب سے اعلیٰ مُصور محمد فقیر اللہ خاں تھا۔ تمام درباری مصور اسی کے تحت کام کیا کرتے تھے۔ فقیر اللہ خاں ایک اور درباری مُصور میر ہاشم کے ساتھ کام کیا کرتا تھا جو خاص طور پر انسانی تصاویر بنانے میں ماہر تھا۔

جدید مصوری

جدید ہندوستانی مصوری، اختلاطِ مغرب و مشرق کا نتیجہ ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ہندوستانی مصوروں نے اپنی قدیم روش اور اپنے قومی انداز کو قطعاً ترک کر دیا۔ کیونکہ کلکتے میں رابندر ناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتن

کے ذریعے سے خالص مشرقی فنون کی پرورش کی۔ اس کے علاوہ مغربی مصوری نے ہندوستانی مصوری پر اچھا اثر ڈالا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی مصوری میں ازسرِنو ایک تازہ رُوح پھونک دی گئی اور اس سلسلے میں چغتائی کے ساتھ ساتھ بیول کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔

اب ہندوستانی مصوری، وقت اور ماحول کے لحاظ سے بالکل صحیح راہ پر چل رہی ہے۔ موجودہ دُنیا میں صنعتی مصوری ہر ملک کی ترقی، فلاح وبہبود کا سب سے بڑا راز ہے۔ ہندوستان میں خالص مصوری کے ساتھ ساتھ صنعتی مصوری کے اکثر و بیشتر شہروں میں مغربی طرز پر ادارے بیسویں صدی میں قائم ہوئے جن کی زیرِ سرپرستی اچھے اچھے مصور پیدا ہو رہے ہیں اور ہندوستانی مصوری ترقی کے ساتھ ساتھ پھل رہی ہے۔

ہندوستانی مصوری کی ترقی کا دارومدار تمام تر حکومت پر ہے۔ ملک میں مصوری کی صلاحیت رکھنے والے لوگ موجود ہیں اگر اُن کو اُن کی صلاحیت کے مطابق تعلیم دی جائے تو وہ بہت آگے نکل سکتے ہیں اور ہندوستانی مصوری کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ دورِ حاضر میں ممالک غیر کی مصوری کے سامنے ہندوستانی مصوری کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہو جائے۔

ہندوستانی مصوری کا مقصد

صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام مشرقی ممالک کی مصوری کی تاریخ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس کا مقصد جمالِ در و بام نہیں، اس کی غرض انسان کی نظر کو لبھانا نہیں بلکہ اور ہی کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اور متوسط ہندوستان کے مصور اپنے شاہکاروں میں کسی شے کی شباہت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہندوستانی مصور کسی شے کو اس طرح نہیں بناتا جس طرح کہ وہ اس کو دیکھتا ہے بلکہ اس طرح بناتا ہے جس طرح کہ وہ کسی شے کو محسوس کرتا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مصوروں نے روح پر جسم کو ترجیح نہیں دی کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی مصور کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس شے کو دیکھتا ہے اُس شے کی روح کو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس شے کے اندرونی معنی کو بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس طور پر کسی تصویر کا مقصد یہ نہیں کہ وہ ایک شاہکار کی حیثیت اختیار کرے اور مادی حیثیت میں اصل سے مل جائے۔ ہندوستانی مصور کا نصب العین کسی بات کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ حُسن کو ظاہر نہیں کیا جاتا بلکہ تصویر کے پردے میں پنہاں کر دیا جاتا ہے۔ اس نظریے کے باوجود ہندوستانی مصوروں اور سنگتراشوں کے کارنامے ایک مادی خوبصورتی رکھتے ہیں اور انتہائی دیدہ زیب بھی ہیں۔

مشرق کا مصور جب کسی منظر کی تصویر بنانا چاہتا ہے تو وہ اُس منظر پر نظر ڈال کر یہ نہیں سوچتا کہ کہاں درخت ہے؟ کہاں گھاس ہے کہاں دریا ہیں؟ کہاں پہاڑ ہیں؟ آسمان پر بادل کس طرح چھائے ہوئے ہیں؟ ہوا کس سمت درختوں کو جھکا رہی ہے بلکہ وہ اُس منظر کو دیکھ کر یہ کوشش کرتا ہے کہ اُس منظر کی رُوح کو سمجھ لے اور اُس میں چھپی ہوئی خوبصورتی کا سُراغ لگائے اور جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے اُس کے بعد اُس کی تصویر بنانی شروع کرتا ہے جس میں منظر کے مادی حُسن کو نظرانداز کر کے منظر کے روحانی حُسن کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اس نقطۂ نظر کے مطابق اُسی مصور کو اعلیٰ سمجھا جا سکتا ہے جو کسی شے کی روح کو تصویر میں ظاہر کرے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ مصور اپنے کام میں بہت زیادہ مہارت رکھتا ہو، اُس کے برش میں قوت ہو اور اُس کے رنگ اچھے ہوں، بلکہ شرط یہ ہے کہ مصور ذہین ہو اور اعلیٰ خیالات کا حامل ہو تا کہ کسی شے کی روح کو سمجھ سکے اور اس کے بعد اپنے احساس کے مطابق اس کو تصویر میں منتقل کر دے۔

یورپ اور ہندوستانی مصوری کا اختلاف و اتحاد

اس کے برعکس مغربی مصور کا کچھ اور ہی نصب العین ہوتا ہے یعنی جب وہ کسی شے یا منظر کو دیکھتا ہے تو اس کو بالکل اُسی

طرح بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ نقل کو اصل سے ملا دیتا ہے تو اس کا شاہکار کامیاب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مصور اشیاء یا مناظر کے ہر مادی پہلو پر عمیق نظر ڈالتا ہے اور اپنے کو زمان و مکان کی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ اگر رات کے وقت تصویر بناتا ہے تو اپنی تصویر میں رات کے وقت کا ہی سماں کھینچ دینے میں اس کی کامیابی ہے۔ قریب کی چیز بڑی اور دور کی چیز چھوٹی بنانے کے اصول پر سختی سے عمل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مشرق اور مغرب کی مصوری کے درمیان ایک وسیع خلیج دیکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے مصوروں کا مشن ایک دوسرے کے برعکس ہے۔ مغرب میں کسی شے کی مادی شکل نہایت اہم ہے اور مشرق میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ مغرب میں مصوری کا مقصد جمالِ در و بام ہے اور انسان کے ذوق و نظر کو لبھانا ہے۔ برخلاف اس کے مشرق میں مصوری کو ایک تعلیمی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی عقائد کو عوام تک پہنچانا ہندوستانی مصوری کا مقصد اولین رہ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قدیم مندر ملتے ہیں ان میں طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے عوام سبق حاصل کریں۔ قدیم زمانے میں کیونکہ کوئی خط ایجاد نہیں ہوا تھا اس لئے کسی واقعے کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لئے وہ لوگ اس بات پر مجبور تھے کہ نقش و نگار کے ذریعے سے مقصد کو حاصل کریں اور غالباً مصوری کی دنیا عالمِ وجود میں بھی اسی طرح آئی ہے۔

ہندوستانی مصوری کا جو کچھ مقصد اور مدعا ہے، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ای۔ بی ہیول اپنی کتاب میں رقمطراز ہے۔

"ہندوستانی مصوری کے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی دلیل اس امر سے مل سکتی ہے کہ ہندوستانی کاشت کار باوجود اس بات کے کہ وہ مغربی نظروں میں جاہل ہے پھر بھی دنیا کے باقی ماندہ کاشت کاروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تمدن یافتہ ہے۔"

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستانی مصوری نے اس کو مذہب اور معاشرت کی اتنی تعلیم دے دی ہے کہ وہ اپنے عقائد میں پکا رہ سکے اور یہی ہندوستانی مصوری کی کامیابی کی محکم دلیل ہے۔

ہندوستانی اور مغربی مصوری میں اختلافات کے دوش بدوش اتفاقات بھی ہیں۔ عہدِ وسطیٰ کے اکثر مغربی مصوروں کے شاہکار مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کے اوپر مبنی ہیں جس طرح ہندوستانی مصور اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کی تصاویر یا مورتیں بناتے رہے ہیں۔ اسی طرح یورپ میں بھی ایک زمانہ وہ تھا کہ وہاں کے مصور اپنی مذہبی روایات کی تصویر بنایا کرتے تھے لیکن زمان و مکان کی قیدوں سے آزاد ہو کر نہیں لہٰذا وہ بنیادی اختلافات جو مشرق اور مغرب کی مصوری میں ہیں۔ اپنی جگہ مسلّم ہیں۔

جس طرح ہندوستانی صنّاع اور حکمراں ارتباطِ باہمی سے اپنے مندر بناتے رہے ہیں اسی طرح عہدِ وسطیٰ کے مغربی مصوروں، مصّاموں اور سنگ تراشوں نے اپنے عبادت خانوں کو شان و شکوہ بخشنے میں اشتراکِ عمل اور مساوی شوق کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں مائیکل انگلو اور ریفائل کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ پوپ جولیس دوم نے مائیکل انگلو کو ایک عبادت گاہ کی چھت میں میناکاری کرنے کے لئے روم میں بلایا تھا۔ اس کام کو اس نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے انجام دیا کہ دنیا آج بھی محوِ حیرت ہے اور اس کا یہ شاہکار انسانی کاریگری کی ایک زبردست مثال ہے جس کو ایک معجزے کی حد تک پہنچا دیا گیا ہے، جس کو مصور نے چار سال کی محنت کے بعد لیٹ کر انجام دیا تھا۔ اس میں انجیل کے مطابق تمام روایات بیٹھیں کو تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ کس طرح دنیا وجود میں آئی، کس طرح انسان کا کرۂ ارض پر نزول ہوا۔ کس طرح نوحؑ کا طوفان آیا وغیرہ۔ اسی جذبے کے تحت بنائے گئے ہیں جس جذبے کے تحت ہندوستانی مصور رامائن اور مہابھارت کے قصوں کی تصویریں بناتے ہیں۔

ہندوستانی مصوری کی مغرب میں پسندیدگی

سالِ گذشتہ "رائل اکیڈمی آف آرٹ" کی طرف سے ہندوستانی فن کی نمائش ہوئی تھی جس نے ہندوستان کے ماضی کی تمدنی عظمت کا ثبوت دیا تھا۔

مغرب والوں کے لئے ہندوستانی مصوری بالکل نئی چیز تھی لیکن اس کے باوجود اُن لوگوں نے ہندوستانی مصوری کی معنوی خصوصیات کا اندازہ کیا جس کا ثبوت "آرچر ڈ" کے ناقدِ فن کے قول سے ملتا ہے۔

"ہندوستانی فن، حیرت انگیز حد تک اس دنیا کا فن معلوم ہوتا ہے اور جتنی جتنی ہماری نظر اس کی خوبصورت شکلوں سے مانوس ہوتی جاتی ہے، ہم خوشی کے ساتھ زندگی کی اعلیٰ اور توانا محبت کا اس کی ہر شکل میں احساس کرتے ہیں۔"

خاتمہ — آخر میں اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان۔ طویل و عریض ملک۔ صبحِ تمدّن کے پہلے لمحے سے لے کر اب تک تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس زمین پر نہ جانے کتنے انقلاب آئے، ان کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنی قومیں آئیں، کتنی نسلیں آئیں اور کتنے مذہب آئے؟ اور ان سب آنے والوں کے علوم و فنون میں خلط ملط ہوتے چلے گئے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس ملک نے کتنے زمانوں کا فن دیکھا لیکن صبحِ تمدّن کے پہلے لمحے سے لے کر اس وقت تک جو بھی علم یا فن کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور بلوچستان سے لے کر آسام تک اس سرزمین میں پروان چڑھا اُس کو ہم منطقی طور پر ہندوستانی فن کہنے کے لئے مجبور ہیں۔ خواہ وہ فن بحرِ اسود اور بحرِ کاسپین کے علاقوں سے آنے والے آریوں کے ہاتھوں پلا ہو، خواہ وہ فن شمال مغرب کے راستوں سے آنے والے مغلوں کے آغوشِ سلطنت میں پروان چڑھا ہو یا سات سمندر پار کر کے آنے والے سفید و سرخ لوگوں کے زیرِ سایہ پھلا پھولا ہو لیکن اس کو ہم ہر حالت میں ہندوستانی فن کہیں گے کیونکہ جس قوم یا نسل کے لوگ یہاں آکر فن کاری کریں گے وہ سرزمینِ ہند ہی سے "انسپائریشن" (الہام) حاصل کریں گے، ان کو ہندوستانی ماحول سے متاثر ہونا پڑے گا اور ان کا فن ہندوستانی ماحول کی تصویر ہوگا۔

میتھیو آرنلڈ کا قول ہے "ادب ماحول کا آئینہ ہے۔" یہی کلیہ مصوری پر بھی صادق آتا ہے۔ ہندوستان میں مصوری خواہ کسی کے ہاتھ سے انجام پائی ہو لیکن ہر طرح کا جغرافیائی، تمدنی، تہذیبی تعلق وہ ہندوستان سے رکھتی ہوگی تو اس کو ہندوستانی مصوری کہنا پڑے گا۔ اور یہی اصول دیگر مذاہب پر بھی صادق آتا ہے۔

ہندو مصوری، جین مصوری وغیرہ سب سرزمینِ ہند پر انجام پائی ہوئی کسی مصوری کو اس طرح منقسم نہیں کر سکتے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہندو زمانے میں ہندوستانی مصوری یا بدھ زمانے کی ہندوستانی مصوری کیونکہ یہ سب ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی باشندوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

لہٰذا وہ مصوری جو کسی قوم سے وابستہ اور ایک ماحول سے متاثر ہو اُس کو اُس قوم اور ملک کی ہی مصوری شمار کرنا حقیقت کے عین مطابق ہوگا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہندوستانی مصوری میں ایک ایسی قوت موجود ہے کہ یہ دیگر مقامات کی مصوری کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد بھی اپنی انفرادیت کو جانے نہیں دیتی۔ عیسائیت کی ابتداء کے بعد سے یہاں کتنی قومیں اور نسلیں آکر حکومت اور اپنے فنون سے ملک کو مالا مال کر چکیں لیکن ہندوستانی مصوری اس کے باوجود کچھ سے کچھ نہیں ہو سکی۔ بیسویں صدی عیسوی کی مصوری دیکھئے اور پہلی صدی عیسوی کی مصوری دیکھئے۔ دونوں میں ماحول اور وقت کا تو ضرور فرق نظر آئے گا لیکن اور کسی قسم کا فرق نہیں ملے گا۔ موجودہ مصوری کا شجرۂ نسب بہت آسانی کے ساتھ انہیں شاہکاروں سے جا کر مل جائے گا جو ہم کو اجنتا کی دیواروں پر دکھائی دیتے ہیں۔

صادقین

مقدمہ رباعیاتِ صادقین

آجکل کی زندگی میں، اور بالخصوص شہری زندگی کی ہڑبونگ اور بھاگ دوڑ میں آدمی کے پاس وقت کم ہے اس کے پیش نظر ذیل کی سطور پر نظر ڈالنے والے سے میری یہ التجا ہوگی کہ صرف اُس وقت جب کوئی اور ضروری کام نہ ہو اور وقت ہی گزارنا ہو تو ان سطور پر بھی کہیں کہیں نظر ڈالی جاسکتی جن کی بے راہ روی اور بے ترتیبی کا مجھے خود بھی احساس ہے اور گزارشِ احوالِ واقعی کے ساتھ ساتھ اِن سطور میں غیر ضروری اور بے موقع باتیں بھی گھس آئی ہیں اور بہت سی کام کی باتیں تحریر بھی نہیں ہو پائی ہیں۔ اِن کو فرصت کے اوقات ہی میں نظر سے گزارا جائے ورنہ مجھے سخت ندامت ہوگی کہ میں قوم کا قیمتی وقت ضایع کر رہا ہوں مسودہ، جس کی میں یہاں نقل کر رہا ہوں بڑی افراتفری میں لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ دورانِ نقل کچھ بیشی اور کمی کی صورت واقع ہو جائے۔ یہ بات کہہ دینی اس لئے ضروری تھی کہ خدانخواستہ کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ میں نے یہ سطور براہِ راست یہیں لکھ دی ہیں، مسودے کو اٹھا کر ان سطور میں رکھا جا رہا ہے، اگرچہ رسم الخط کی صورت زبانِ حال سے اِن سطور کے ماضی کے بارے میں یہ جھوٹ بھی بول سکتی ہے کہ اِن کو براہِ راست یہیں لکھا گیا ہے تو خیر اُس لکھے لکھائے مسودے کی اِس بیاض کے اوراق میں ایک نپے تلے انداز سے نقل کی جا رہی ہے، دورانِ نقل اگر کسی جملے میں کوئی اور ہی شوشہ لگ جائے تو مجھے فی الحال اُس کا علم نہیں ہے۔

ظاہر بظاہر خاکہ کشی، خوشخطی اور شاعری کے فنون کے مسالوں سے رباعیات کی طباعتِ دوئم کی یہ کھچڑی کی ہنڈیا تیار کی گئی ہے، لیکن اس پردے میں اس یقین اور بھروسے پر کہ روشن خیال مُفتیانِ فن نئے تجربات کرنے پہ کوئی قدغن نہیں لگاتے بعدہٗ فتویٰ صادر کرنے کا اختیار رکھتے ہیں کیوں کہ تجربے کے بعد ہی اُسکی کامیابی یا ناکامیابی کا تعین کیا جاسکتا ہے لہٰذا یہ فنِ کتاب سازی میں کوشش کی گئی ہے، پتہ نہیں کہ کتاب سازی فن ہے کہ صنعت ہے کہ حرفت بہرکیف جس طرح مذاقِ لطیف رکھنے والی قوموں نے کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کے فعل کو بھی فنونِ لطیفہ کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے میں کتاب سازی کو بھی اُن ہی سرحدوں کی طرف لے جانے کی اپنی جیسی اپنی بساط کے مطابق کوشش کر رہا ہوں۔

ویسے کتاب سازی اپنے بچپنے کے زمانے کا مخصوص کھیل تھا، اپنی ایٹلس، دیگر کتابیں اور حد یہ ہے کہ ڈکشنری بھی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی قلمی ہوا کرتی تھی اور پھر ان کی جلد بھی خود ہی باندھی جاتی تھی اور لکھنے کے دوران لکھے ہوئے اوراق کو پلٹ کر نہیں گنتا تھا، کاپی کے باقی ماندہ سادے اوراق کا شمار البتہ کر لیتا تھا، وہ بھی شاذ و نادر۔

اوراق پر نفسِ مضمون کی رعایت سے واسطہ یا بلاواسطہ لگّا کھاتے ہوئے منقّش حاشیے اور دیگر فنی ٹیپ ٹاپ کو دیکھ کر اگر یہ فتویٰ لگا دیا جائے کہ اس نے اپنی لنگڑی رباعی گوئی کو خطاطی اور نقاشی کی بیساکھیاں دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے تو اس فتوے میں تھوڑی سی بہت صداقت شاید ہوگی لیکن مکمل نہیں کیونکہ میں نے اپنی اُسی وقت کی رواں خوشخطی جب یہ رباعیاں کہی گئی تھیں اُسی کو یہاں استعمال کیا ہے۔ اور پرانے گھسے پٹے خاکوں کی اُلٹ پھیر اور کانٹ چھانٹ کر کے کچھ اُسی پٹے پٹائے ڈگر پہ مزید نفسِ مضمون کی رعایت سے اور خاکے بھی بنا کر اس میں شامل کر دیئے ہیں ہاں رباعیات کی طباعتِ اول میں جو ترتیب تھی وہ طباعتِ دوئم میں تحریر و تصویر میں حتی المقدور مطابقت بٹھانے کے چکر میں بھینٹ دی گئی ہے اور حاشیے اور مضمون کا رشتہ قائم کرنے کی کھینچا تانی اور کاٹ چھانٹ میں رباعیوں کے انتخاب میں کوئی کسی قسم کی احتیاط نہیں برتی گئی ہے، خاکوں کو رباعیوں پر منڈھنے میں اکثر جگہوں پر جھول ہے، اوراق کا لباس کہیں کہیں ڈھیلا ہے اور کہیں کہیں تنگ، اگر لباس ڈھیلا ہو تو

کاٹ کر اُس کو موزوں کیا جا سکتا ہے لیکن اگر لباس جسم سے چھوٹا ہو تو اس صورت میں جسم کی تراش خراش کرنا مشکل ہے لہٰذا مجبوری کے طور پہ اکثر جگہوں لباسِ اوراق جسمِ مضمون پہ بہت زیادہ پھنسا ہوا ہے یعنی مربع مضمون و حاشیۂ اوراق کے فشار میں خاکوں کے اجسام اور اُن کی نشست و برخواست پچک گئی ہے۔

خاکوں کے بارے میں ایک بات اور کہتا چلوں، جس طرح کوئی کتاب ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اسی طرح خاکوں کا انداز اور طریقۂ کار مسلسل ایک سا چلا گیا ہے، اس میں یہ بھی ہوا کہ میں جس انداز کے انسانی اشکال و اجسام بناتا ہوں اُن کے مختلف النوع تیور اور پینترے اِس جلد میں یکجا ہو گئے ہیں، کام میں مسلسل یک رنگی چلی گئی ہے اور یہ نقاشی کے خط کی یک رنگی ہے، اِس یک رنگی کو میں نے متفرقات کے باب میں کچھ مضامین کے مختلف النوع ہونے کی وجہ سے مجبوراً توڑا اور کچھ بظاہر تجریدی شوشوں سے حاشیہ آرائی کی، یک رنگی سے جو اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اِس طرح مجبوراً اُسکا مداوا بھی ہو گیا لیکن لکیروں کا تانا بانا وہی رکھا تاکہ رسم الخط کی یکسانیت میں فرق نہ آنے پائے ساتھ ہی ساتھ آنگن کی ٹیڑھ کا بھی ذکر کرتا چلوں یہ کام طول و عرض کے لحاظ سے جس قد و قامت کا آپ کے سامنے ہے اسکی قلمی کارروائی بھی رول کی شکل میں ہوتی ہے اور رول کو سیدھا کرو تو پھر اُس میں واپس گھوم کر مُڑ جانے کی، گول ہو جانے کی توانائی ہوتی ہے۔ کونوں پہ اگر چھوٹی کیلیں لگا دی جائیں تب بھی تختی پر چپاں نہیں ہوتا ایک آدھ سوت ابھرا رہتا ہے، کبھی کبھی نوکِ قلم اُس پہ تیرتی ہے، نب سے اگر دباؤ تو وہ پھول کر اور ابھر کر نب کو اِدھر اُدھر بھٹکانے کی طاقت رکھتا ہے، میں کلائی اور بازو سے کام کرنے کا عادی ہوں، یعنی جغرافیائی اعتبار سے طویل و عریض کام کرنے کا مزاج ہے، یہ کام کیوں کہ جغرافیائی طور سے اسکی لمبائی چوڑائی بہت ہی مختصر تھی تو یہ کام مجھے مجبوراً انگلیوں سے کرنا پڑا جس کا میں عادی نہیں ہوں۔ اور وہ بھی قلم پہ جو گولائی میں واپس مُڑ جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نوکِ قلم اور قلم کے اس مزاج میں یک گونہ نوک جھونک رہتی ہے، اِسکا کوئی علاج بھی ہوتا ہی ہو گا لیکن بے سروسامانی سے کام کرنے کی افتادِ طبع ہے لہٰذا کام یونہی ہوتا چلا گیا۔ لیکن جہاں قلم کا یہ پہلو ہے اُس کے ساتھ ساتھ اِس کے بہتر پہلو زیادہ ہیں یعنی اِس پر عکس بآسانی اتارا جا سکتا ہے اور "دمِ تصویر" اگر سیاہی کا ڈوبا گر جائے تو بآسانی اُسے چھیل کر صاف کیا جا سکتا ہے، بہر کیف قلم پر پہلی ہی مرتبہ کام کرنے کا تجربہ کفایت کے خیال سے کیا گیا ہے اور پھر نئے شیشوں کے "بائی فوکل" عینک اور اپنی آنکھ اور گردن کے زاویوں میں رشتۂ تعاون ابھی محکم نہیں ہو پایا ہے جس کی وجہ سے اُن کی آن میں ذرا سا نیچا اور اونچا کرنے میں خاکے موجود و موہوم کے درمیاں معلق نظر آتے ہیں۔ خیر تو یہ آنگن کی ٹیڑھ کی بات تھی غیر ضروری ہوتے ہوئے بھی گوش گزار کرانی تھی۔

ایک رات آدھی رات بھیگ چکنے کے بعد عالمِ سرخوشی کی ابتدائی خوبصورت ساعتوں میں، میں سوچ رہا تھا کہ اگر خیام جیسے شاعر کی رباعیاں، یاقوت جیسے خطاط نے خوشخط لکھیں اور پھر مانی جیسے مصوّر نے اُن پر مشتمل تصویریں بنائیں تو یہ مجموعہ ہو گا تو بڑا عظیم الشان لیکن "گروپ شو" ہو گا، اُسی وقت "رباعیات" کی طباعتِ دوئم کا نقشہ ذہن میں بجلی کی طرح کوند کر ایک جھلک نہ خانۂ خیال کے گھپ اندھیرے میں دکھا گیا، عالمِ سرخوشی کی درمیانی منازل تھیں۔ اور پھر میں نے ایک رباعی لکھی۔

رنگوں کی حدود میں دکھاؤں گا وہ شے　　خاکوں کی قیود میں دکھاؤں گا وہ شے
جو کچھ کہ عدم میں دیکھتا ہوں میں آج　　کل تم کو وجود میں دکھاؤں گا وہ شے

چوکی پہ ایک ہی نشست اور ایک ہی رَو میں فنی اعتکاف شروع ہو گیا، چالیس راتوں اور انتالیس دنوں سے زیادہ کا یہ چلّا کھنچتا ہی چلا گیا، کام منزلِ تکمیل میں داخل ہو گیا، کتاب کسی کے نام منسوب کرنے کی بات اپنی نظر میں ہلکی سی بات ہے (میں تو اپنے نمائش کا بھی کسی سے افتتاح نہیں کراتا ہر شخص ہی اپنی نمائش میں مہمانِ خصوصی ہوتا ہے) مگر سوچا کہ اِس مرتبہ یہ کام بھی ہو جائے دور دراز کے بزرگ جن کا تصور تقریباً اتنا ہی دھندلا خیال میں آتا ہے جتنا کہ دیومالاؤں کے دیوتاؤں کا تصور۔

لہٰذا انتساب کے طور پہ ایک رباعی لکھی:

جب پایۂ تکمیل کو پہنچا کل شام　　دل میں یہ کہا میں نے اُٹھا کر اک جام
منسوب، مرا ماہِ گذشتہ کا یہ کام　　خیام کے، یاقوت کے، مانی کے ہے نام

اور پھر یہ بھی سوچا کہ فنِ کتاب سازی میں یہ اپنی جیسی کوشش جس اوقات کی بھی ہے کم از کم اگر اور کچھ نہیں ہے تو "گروپ شو" بھی نہیں ہے بلکہ "ون مین شو" ہے اور بس۔

اِس عمل کے دوران اکثر باتیں ذہن میں آتی تھیں، منجملہ اُن کے ایک بات یہ بھی آتی تھی کہ ایک اعتراض یہ بھی صادر کیا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ خوش آواز ہوتے ہیں اور اُن کی شاعری جس میں کوئی بھی گہرائی نہیں ہوتی اُن کے ترنم کے زور پر چلتی ہے، ایسے ہی کہیں میرے اوپر بھی یہ اعتراض کر دیا جائے گا کہ یہ اپنی یونہی سی شاعری کو اپنی خوشخطی اور نقاشی کے زور پر چلا رہا ہے، تو میں پہلے ہی عرض کر دوں کہ میں اپنی رباعی گوئی کو شاعری کب کہتا ہوں۔

یہ تو میرے ذاتی محسوسات ہیں، ذاتی نظریات اور اعلانات ہیں جو میں نے ویسے ہی کہنے کی بجائے بحرِ ہزج کے اخرم اور اخرب کے اوزان میں لکھ دیئے ہیں۔ مضمون کی نفاست، الفاظ کی لطافت اور خیال کی رعنائی اِس میں کہاں ہے جو کہ شاعری کی بنیادی شرطیں ہیں، اِس میں تو زندگی سے متعلق معاشرے کی طرف اپنے سیدھے سادے رویہ کی بات ہے اور اگر یہ کسی بحر میں منظوم ہے تو اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ شاعری ہے۔

پھر ایک بڑا اور جائز اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِس نے اپنے یونہی سے محسوسات کو اتنے آراستہ طریقے پر، اِس لُوک پلک کے ساتھ، اِس اہتمام و التزام کے ساتھ کیوں طبع کرایا اور اتنے بڑے بڑے شاعروں کی شہزادیِ افکار کی آئینہ خطاطی میں شانۂ نقاشی سے مشاطگی کرنے کی بجائے یہ اپنی ہی تک بندی کی لنگڑی لولی لونڈی کا بناؤ سنگھار کر رہا ہے تو اُس کا جواب پہلے ہی اِس بات میں آچکا ہے کہ یہ "ون مین شو" ہے "گروپ شو" نہیں ہے۔

خیر اس سلسلے میں ایک بات اور بھی کہتا چلوں کہ غریب کے یہاں فاقے ہیں لیکن مرغیاں پلی ہوئی ہیں، یہ تو میں نے اپنی ننگی بھوکی پلی ہوئی مصوری کی مرغی کاٹ کر خوشخطی کے تیل میں پکا کر کھلائی ہے، یہ عیاشی تزئین و اہتمام نہیں ہے یہ تو نہوت کی بات ہے، مجبوری کا نام شکر کی صورتحال ہے، کا تنکے دانہ ہوتا۔

بہر کیف اِس "ون مین شو" کی کھینچا تانی کی کوشش میں نقاشی کی ٹانگیں خطاطی اور رباعی گوئی کی ٹانگوں سے باندھ دی گئی ہیں، اور پھر اِن تینوں سے کہا گیا ہے کہ رقص کرو، ظاہر ہے کہ درمیان میں جو فن ہوگا اُسے صرف اچھلنا اور کودنا ہی پڑے گا، لہٰذا یہ حاشیوں کے خاکے جو ہیں یہ لیلائے مصوری کا خرامِ ناز نہیں بلکہ صرف اچھل کود ہے۔

جب کتاب کی صورت اپنی تکمیل کے آخری مدارج میں تھی تو مجھے ایک فنی تحریک جس پر یورپ میں تجربے کئے جا رہے تھے معاً اُس کا خیال آیا۔ جہاں اور کچھ ہو رہا تھا ایک یہ تجربہ بھی کیا جا رہا تھا کہ مختلف فنون کے ملاپ سے ایک تخلیقی وحدت تیار کی جائے۔ بڑے بڑے مفتیانِ فن اِس تجربے کی پشت پناہی میں منبرِ اجتہاد سے وعظ کر رہے تھے اور بڑے بڑے عظیم و جید لوگ اِس سلسلے میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ فنون کے ملاپ سے یا مختلف فنون کو شیر و شکر کی طرح گھول کر ایک کرنے کی ایک معمولی سی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک مجسمہ بنا دیا اور چہرے پہ خد و خال اور جسم پر خطوط مُوقلم سے بنا دیئے تو گویا یہ مصوری کے فن اور مجسمہ سازی کے فن کا ملاپ ہو گیا۔ اسی طرح دو سے زیادہ فنون کا ملاپ کیا گیا۔ خیر تجربے بالعموم بھونڈے پن کی زد میں آکر ناکام ہی ثابت ہوئے۔

صدی کے گذشتہ عشرے کے آغاز میں اِس تحریک کا فنِ مصوری کی راجدھانی عروس البلاد پیرس میں ذکر سنا تھا اور شن کر محو بھی کر دیا تھا لیکن اب جبکہ یہ جلد تیاری کے آخری مراحل میں داخل ہو گئی ہے اور میں خوشخطی، رباعی گوئی اور نقاشی کے فنون کو آپس میں بھینٹ کر

میں جلد کی وحدت میں دیکھ رہا ہوں تو مختلف فنون کے ملاپ سے ایک فنی عدد تیار کرنے کی تحریک کو اپنے ہی روایتی اور ثقافتی پس منظر میں بہت زیادہ ناکام نہیں پا رہا ہوں رباعی اور خوشخطی ہمارے ثقافتی پس منظر کی نمایاں علامات میں سے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر مجھے رباعی گوئی کا شوق یا تکلیف بہرحال ہے کیوں تو اس کا جواب مجھے خود ٹھیک طریقے سے نہیں معلوم ہے، پھر بھی جواب میں صرف اتنا سوال کروں گا کہ عرفی کو مصوّری کا شوق کیوں تھا؟:

تصویر میں ساحری کی سوجھی کیوں تھی — عُرفی کو مُصوّری کی سوجھی کیوں تھی
کل میں نے بھی کہہ لئے تھے دو اک مصرعے — کل مجھ کو بھی شاعری کی سوجھی کیوں تھی؟

یہاں اس سلسلے میں تھوڑی سی سنجیدگی کے ساتھ عرضِ حال کرلی جائے، یعنی اپنی رباعی گوئی کے بارے میں جس گرد و پیش میں آنکھ کھولی اُسکی ثقافتی علامات کی تفصیل میں بغیر پڑے اتنا عرض کروں کہ منجملہ اور علامات کے رباعی بہ حیثیت ایک صنفِ سخن کے اپنے گرد و پیش کی ثقافتی علامت تھی اور ایامِ طفولیت میں حمدیہ، نعتیہ رباعیاں، اخلاقی اور رثائی نوعیت کی رباعیاں یاد کرائی جاتی تھیں، تصویریں نہیں بلکہ مخطوطات اور بالعموم اعلیٰ درجے کی خطاطی کی ہوئی رباعیاں آرائشِ دیوار و در کے لئے لگائی جاتی تھیں۔ یہ رباعیاں اکثر تختیوں پر بھی لکھی ہوتی تھیں۔

میں خود بھی ایامِ طفولیت میں تختی پر رباعیاں لکھنے کا شوقین تھا، چاروں مصرعوں پر مشتمل رباعی کی ساخت پہچان میں آجاتی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ شعر، غزل یا نظم کا لفظ بھی نہیں سُنا تھا اور کیوں کہ رباعی پڑھنے کا بھی ایک خاص انداز ہوتا تھا تو ہر رباعی میں صوتی زیر و بم کی یکسانیت کا بھی اُسی زمانے سے احساس ہو چلا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صنفِ رباعی سے اپنی محبت بچپن سے ہے، نہ جانے کیوں اس میں ایک خاص حسن و جمال ایک خاص متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے اور پھر یہ کہ اگر لکھی جاتی ہے تو خطاطی کے نقطۂ نظر سے اور اصنافِ سخن میں ایک خاص قد و قامت کی وجہ سے تختی پر بہت زیادہ گٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے باقاعدہ رباعیاں کہنی شروع کر دی تھیں، اُن کے چند قلمی نسخے بھی بنتے تھے، بہت سے ضایع بھی ہو گئے۔ کچھ کھو دیئے اور کچھ خود ہی نذرِ آتش بھی کر دیئے مگر کچھ چھوٹی چھوٹی قلمی کتابیں نکلیں جو اپنی اُس وقت کی شاعری پر مشتمل ہیں، اِن میں دو مجموعے (نسخے) رباعیات کے بھی ہیں، خیر تو اُس زمانے میں بزرگوں نے اوّل تو شعر گوئی کے سلسلے میں کافی روکا اور پھر رباعی کے بارے میں یہ بتایا کہ شاعر کو چالیس برس کی عمر سے پیشتر رباعی پر طبع آزمائی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ زبان و بیان و خیال پر جس حد تک رباعی کہنے کے لئے قدرت ہونی چاہیئے وہ سالہا سال کے شاعرانہ ریاض کے بعد سن بلوغت پر پہنچ جانے کے بعد ہی ہوتی ہے، خیر شاعری واعری تو خود بخود ہی چھوٹ گئی چوں کہ میں اپنے بنیادی شوقِ مصوری میں محو ہو گیا، ویسے بیچ میں کبھی کبھی معاملہ بندی کے طور پر کچھ نہ کچھ ہوا فرود۔

مئی ۱۹۶۹ء میں غالب کے اشعار پر مشتمل ایک نمائش کی تھی اُس کے کچھ زمانے بعد لاہور چلا گیا اور وسط ۱۹۶۹ء میں ایک محفلِ مہ وشاں میں پروفائل بناتے بناتے تفریحاً کچھ رباعیاں کہی گئیں، لطیفوں کے طور پر اور اُن کا انگریزی میں ترجمہ کرکے اہلِ محفل کو سنایا کیونکہ حسینانِ محفل کو انگریزی اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے خوش قسمتی سے اردو نہیں آتی تھی، یعنی شاعرانہ عیب پردے ہی میں رہا۔ خیر تو یہ سلسلہ تفریح دو چار روز جاری رہا۔ اور بالآخر میں رباعی گوئی کے جال میں پھنس گیا۔ ستمبر بلکہ اواخر اگست ۱۹۶۹ء سے جنوری ۱۹۷۰ء تک شبانہ روز رباعی گوئی کی اضطراری کیفیت کی شدت کی گرفت میرے وجود پر رہی اور میں بغیر سوچے سمجھے رباعیاں لکھتا چلا گیا مسلسل پانچ ماہ تک، اگر یہ کہوں کہ مجموعے کی تمام رباعیاں ایک ہی نشست میں لکھی گئی ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ سب کی سب رباعی گوئی کے ایک ہلّے، ایک ریلے اور ایک رَو میں کہی گئیں۔ اور پھر ماہ فروری ۱۹۷۰ء میں اِن کو طباعت کے لئے خوشخط لکھنا شروع کر دیا،

یہ ترتیب اور خوشخطی پورے ماہِ فروری پر پھیل گئی اور جب رباعی گوئی کا یہ شیرازہ سمیٹ لیا اور صورتحال ایک مجموعی شکل پکڑ گئی تو اپنے رباعی گوئی کو سراہنے کے لئے میں نے ایک رباعی کہی :

روٹھا جو جمال ہے منایا میں نے　　اک جشنِ وصال ہے منایا میں نے
اِس عمرِ عزیز کا رباعی کہہ کر　　چالیسواں سال ہے منایا میں نے

تو یہ بات ہے فروری کی۔ اور خوشخطی کے دوران بعض بعض رباعیاں کیوں کہ صفحے کا اور بعض اوقات ورقے کا ایک ہی مزاج رکھنا چاہتا تھا اور جس مضمون کی رباعیاں صفحے پر ہیں وہ ختم ہوگئیں اور جگہ باقی رہ گئی تو ایسی صورت میں اُسی وقت اُسی مزاج کی رباعیاں براہِ راست اُسی کاغذ پر ہو جاتی تھیں جو کتابی صورت میں آنے کے لئے بلاک بنوانے کے لئے تیار کیا جارہا تھا یعنی اپنی کاغذی غلطیاں فولادی غلطیوں میں تبدیل ہو رہی تھیں، اِس رواروی اور افراتفری اور اُس کے ساتھ بدانتظامی اور ہڑبونگ میں نظرِ ثانی تو بڑی بات تھی نظرِ اول کا بھی دوسری آنے والی اضطراری گرفتوں نے موقع نہ دیا اور خام مال جیسا کہ تھا اُسی حالت میں منظرِ عام پر لانے کی میں جسارت بھی کر گیا، باقی یہ لوگوں کی مُروت اور محبت تھی کہ اِس مجموعے کی کمزوریوں کو نظرانداز کرکے اِسے قبول کیا اور اِس کو اِسکی ظاہری صورت شکل پر قومی کتابی مرکز والوں نے اِس کے تمام عیوب اور خامیوں کے باوجود انعامِ اولین بھی دے دیا۔

ایک بزرگ نے بتایا کہ رباعی گوئی کے لئے فارسی زبان پر دسترس اور فلسفے پر عبور شرط ہے۔ مطلب یہ کہ رباعی گوئی کے لئے یہ ساز و سامان ضروری ہے۔ فارسی تو بالکل بھی نہیں پڑھی اور فلسفے کے اوراق اور خشک مسائل پڑھنے کے لئے اوّل تو وقت ہی نہ ملا اور بالفرض اگر وقت نکال بھی لیا جاتا تو مضامین فلسفہ اور اصطلاحاتِ فلسفہ خود ہی اکتاہٹ اور اپنی عبارت کی طرف سے بیزاری کی صورتحال پیدا کر دیتے۔ اور ایک خواہ مخواہ میں بوریت پیدا ہوتی۔ رباعی جو کہ ایران کی ایجاد ہے اور جس کا بہترین سرمایہ فارسی میں موجود ہے بدقسمتی سے میں نہیں پڑھ سکتا ہوں، ویسے کچھ نہ کچھ معنی نکال ہی لیتا ہوں، بہرکیف میں اِس بات کا مکرر اعتراف کر رہا ہوں کہ میں رباعی گوئی کے لئے بالکل نہتا ہوں اور بالکل بے سروسامان ہوں۔ سوچتا ہوں کہ ظروفِ الفاظ کیسے ہی بھونڈے ہو مظروفِ محسوسات خالص ہو تو ٹھیک ہے مظروف میں سچائی اور خلوص ہو تو ٹھیک سے بات بن جاتی ہے مطلب ثواب سے ہے۔

میں شراب میں مینائے زرنگار، طشتِ طلائی اور جام بلوریں کے اہتمام کا قائل نہیں ہوں، اچھی ہونی چاہئیے خالص اور سچی ہونی چاہیئے، بیشک مٹی کے پیالے کی بے تکلفی میں ہو، جام زرنگار کے تکلفِ بے جا کی کوئی ضرورت نہیں' لذتِ کام و دہن کا قائل نہیں ہوں رگ و پے میں اتری ہوئی تاثیر کا قائل ہوں۔ جام زرنگار تو خالی رکھے کا رکھا رہ جاتا ہے مثلاً یہ کہ کسی "خوب چشم" سے کہا جارہا ہو "تمہاری چشمِ میگوں آفرینش کی حقیقت لم یزل ہیں اور زیرِ افلاک اور بالائے زمین اِن کا کوئی نظیر اور عدیل نہیں ہے، خالقِ مکین و مکان و خدائے زمین و زمان کو اگر اپنی تخلیقات میں کوئی ایسا شاہکار نظر آئے جس پر وہ بجا طور پر ناز کرسکے تو وہ آخر تمہاری آنکھوں کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے" اور وغیرہ وغیرہ اور اِسی قسم کی لاتائل بات چیت، میں اس کا بالکل قائل نہیں، یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے اور اپنی افتادِ طبع اور کیفیتِ مزاج میں قطعاً شامل نہیں ہیں، یہ الفاظ کے ظروف ہیں اندر سے خالی اور کھوکھلے ہیں، میں تو سیدھے سے الفاظ میں آہستہ سے، اگر شدت سے جمالیاتی طور پر محسوس کر رہا ہوں گا تو یہی کہوں گا کہ "تمہاری آنکھوں کے شربتی رنگ میں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے"۔ اور بیان کی یہی سادگی اپنی تصویروں میں، خطاطیوں میں اور رباعیوں میں بھی افتادِ طبع کی مجبوریوں کی وجہ سے شامل ہوتی ہی رہتی ہوگی۔

ہاں تو رباعی کہنے کے لئے میں اِس اعتبار سے بالکل خالی ہاتھ ہوں، اردو اپنی زبان ہے باقی محسوسات ہیں، فارسی، عربی، فلسفہ ولسفہ کچھ نہیں جانتا بے سروسامان ہوں۔ کچھ شوق بھی رقیبِ سروسامان ہے لہٰذا بے سروسامانی اور بدنظمی کے ساتھ کام کرنا اپنی تقدیر بنا ہوا ہے اور یہ بے سروسامانیاں ہی اپنا سروسامان بنی ہوئی ہیں۔

یہاں ایک واقعہ اور لکھتا چلا جاؤں، بے سروسامان لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے انیسویں صدی کے درمیان تک کالے رنگ کی تصویر میں شمولیت تصویر کے اجزائے ترکیبی کا جزو لاینفک تھی، ایک دن کسی مصوّر کے پاس کالا رنگ ہی نہیں تھا اور اُس میں بازار سے خریدنے کی استطاعت بھی نہیں تھی اور اُس کا جذبۂ تخلیق و عمل اُسے تصویر نگاری کے لئے بے چین کر رہا تھا وہ کالے رنگ کے نہ ہونے سے بہت اُداس، مغموم اور مضمحل تھا لیکن شدتِ شوق میں اُس نے گہرے نیلے رنگ کو کالے رنگ کی جگہ مجبوراً استعمال کر لیا اور پھر جو تصویر بنی اُس کے سلسلے میں رینوار نے کہا کہ "ایک دن ہم میں سے کسی کے پاس کالا رنگ نہیں تھا، مجبوراً نیلا استعمال کر دیا اور اس طرح "امپریشن ازم" کی پیدائش ہو گئی۔ "امپریشن ازم" فنِ مصوّری کی وہ کامیاب تحریک تھی جس نے انیسویں صدی کے ماتھے کو جگمگا دیا ہے اور آنے والی کتنی ہی تحریکوں کے لئے نئے دروازے کھول دیئے لیکن یہ بے سروسامانی کا نتیجہ تھا، کالا رنگ نہ ہونے کی بات تھی۔ اچھا کام بالعموم انتظام و التزام سے نہیں بلکہ ڈھیل میں ہو جاتا ہے دور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے رباعی کی بات ہے رباعی ہی کو لے لیں رباعی جیسی نازک اور اچھوتی صنف کی ایجاد بھی ڈھیل میں اتفاق کے ہی طور پر ہوئی تھی۔

امیر یعقوب صفار کے کم سن لڑکے کی اگر چھوٹی گولی ایک دم سیدھی گچھی میں چلی گئی ہوتی تو وہ خاموش رہتا یا کچھ اور ہی کہتا الٹتی ہوئی گئی اور اُس کیفیت امید و بیم میں اُس کے منہ سے "غلطاں غلطاں ہمی رو تا لب گو" نکل گیا اور یہیں سے بات چل نکلی۔

مطلب یہ ہے کہ بے سروسامانی میں سے بھی غیر متوقع طور پر عالی شان ساز و سامان پیدا ہو جانے کے امکانات کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ بہرکیف رباعی گوئی میں نہ تو اپنا مقصد کمالاتِ زبان دکھانا ہے نہ مضامین باندھنا ہے نہ شاعرانہ لطافت و معنویانہ نفاست سے غرض ہے یہاں تو محسوسات کو سیدھے سادے طریقے سے بیان کر دینا ضروری ہے ورنہ اگر خدانخواستہ شاعری مقصود ہوتی تو طبع آزمائی کے لئے دیگر اصنافِ سخن موجود تھیں۔ شعر گوئی اور چیز ہے لیکن شاعری کے لئے جو عاشقانہ سوز و گداز اور معشوقانہ نفاستِ خیال چاہیئے میں اُس سے محروم ہوں لہٰذا اسی لئے رباعی گوئی کبھی کبھار کر لیتا ہوں، رباعی میں دو اور دو کو چار چار کہا جاتا ہے، بلا واسطہ سیدھی اور صاف بات کہی جاتی ہے اور بیشتر ذاتی مشاہدات و محسوسات و معاملات پر ہوتی ہے، میں تو یہاں تک دعویٰ کر جاؤں گا کہ شعر گوئی اور چیز ہے اور رباعی گوئی اور چیز۔
غالب کی عظمت الامان، ہمارے احاطۂ ادراک سے باہر ہے، غالب شاعر تھا۔ دیگر اصنافِ سخن اور بالخصوص غزل میں طبع آزمائی کی لیکن گنتی کی چند رباعیاں لکھیں جو تمام تر تقریباً ذاتی ہیں اور صرف غالب ہی کے مُنہ پر سجتی ہیں کیونکہ وہ اُسکی ذاتی ڈائری کی حیثیت رکھتی ہیں۔
رباعی میں آپ بیتی ہوتی ہے۔ غالب کی غزل کا کوئی بھی شعر ہر شخص اپنے طور پر پڑھ کر آپ بیتی کے طور پر اُس شعر کے حُسن و جمال کو محسوس کر کے اپنا دل ہلکا کر سکتا ہے لیکن مثال کے طور پر "مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل!" یہ رباعی صرف غالب ہی کے منہ زیب دے گی اور "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے" یہ ہم سب پڑھ سکتے ہیں۔

رباعی کہنے کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں، ظاہر بظاہر یہ دعویٰ عجیب الخلقت معلوم ہو گا لیکن اردو میں غالب ہی کی مثال کافی ہے، میں اگر رباعی گوئی کر لیتا ہوں تو ہرگز اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعری کر رہا ہوں، شاہ و گدا سبھی رباعیاں کہتے رہے ہیں بڑے بڑے سلطانِ طریقت بزرگوں نے جبکہ وہ شاعر نہیں تھے لیکن رباعیاں کہیں سلطانِ زمانہ لشکر اندازوں نے رباعیاں کہیں ہر چند کہ وہ شاعر نہیں تھے، عارف لوگوں نے بھی رباعیاں کہیں، میں رباعی گوئی کر کے خدانخواستہ بزعم خود یہ ثابت نہیں کر رہا ہوں کہ میں بھی اُسی قافلۂ شوق کی گرد میں شامل ہوں "جس قافلۂ شوق کا سالار تھا سرمدؔ"۔ ایسا نہیں ہے میں تو حسب نسب قسم کی چیزوں کا قائل نہیں ہوں بالخصوص معنیٰ کی فضیلت کا لیکن جو لوگ قائل ہیں اُن کے نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے حسب نسب کی نفی کر کے میں سرمد کی خاکِ پا کی بھی برابر نہیں ہوں اور رباعی گوئی کر کے حلقۂ عارفاں میں نہیں گھس رہا ہوں بلکہ صرف سُنتِ عارفاں پر عمل کر رہا ہوں بالکل اُسی طرح جیسے کوئی گنہگار شہد کھا کر سُنتِ محمدؐ مصطفیٰ ادا کر لیتا ہے۔

بہر کیف رباعی گوئی قلندرانِ ادا آشنا، حکیمانِ حقیقت شناس اور سلاطینِ لشکر انداز ان سب نے کی ہے، اِن میں خواہ رموزِ الوہیت و اَسرارِ عبودیت سے پردے ہٹائے جا رہے ہوں یا علم و اخلاق کی شمعیں روشن کی جا رہی ہوں، ویسے شاعروں نے بھی رباعیاں کہیں۔

سید ابوسعید ابوالخیر ایک صوفی بزرگ تھے، عمر خیام ایک ماہرِ فلکیات اور ریاضی داں تھے، بوعلی سینا حکمت اور فلسفے کا ایک ستون تھے، بابر ایک فاتحِ دوراں تھا، لیکن یہ سب بزرگ وقتاً فوقتاً رباعیاں بھی کہتے تھے۔ قلندرانِ ادا آشنا میں یہ سلسلہ چلتے چلتے سرمد تک آیا۔ بابر نے جس سلطنت کی بنیاد ڈالی اُس کے ہر بادشاہ کی رباعیاں ملتی ہیں، غالباً اورنگ زیب نے طبع آزمائی نہیں کی۔ ویسے داراشکوہ بھی رباعی کہتے تھے خیر داراشکوہ اگر رباعی کہتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، تھے بھی صوفی منش لیکن اُن کے بزرگ جو شاہانِ وقت تھے انہوں نے بھی رباعی گوئی کی۔

قلندرانِ ادا آشنا کی ایک فہرست ہے۔ میں اُن کے نام ادھر اُدھر سے تصوف اور صنفِ رباعی سے متعلق ادب میں سے جو میں نے مربوط اور باقاعدہ طریقے سے سنجیدگی کے ساتھ کبھی نہیں پڑھا، اُس میں سے بڑے بڑے بارعب اور پُروقار ناموں کی نقل کرنے میں سخت احتراز اور گریز کروں گا۔ پہلے تو اس لئے کہ ممکن ہے کہ اِن بزرگوں کے صرف نام نقل ہی کر دینے سے یہ غلط اندازہ کوئی لگالے کہ لکھنے والا صاحبِ سیر اور صاحبِ علم معلوم ہوتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے دوسرے اس لئے کہ اِن بزرگوں کا کلام فارسی میں ہے جو بدقسمتی سے مجھے اس لئے نہیں آتی کہ ساتویں جماعت میں جب میں تھا تو فارسی "آپشنل" مضامین میں تھی اور میں نے اِن مضامین میں سے "ڈرائنگ" لی تھی۔ خیر ایک مرتبہ میں ایک ایرانی کتب فروش کے یہاں کتابیں دیکھ رہا تھا اور مرزا عبدالقادر بیدل کی بھی رباعیات کی ایک جلد دیکھی جس میں کم و بیش پانچ ہزار رباعیاں تھیں، رباعی کسی کی بھی ہو پڑھتا ضرور ہوں، اُس وقت فارسی نہ آنے کا جو قلق ہوا اُس کا کیا بیان کروں ویسے کچھ نہ کچھ کام تو چلا ہی لیتا ہوں مگر بات نہیں بنتی۔ پھر یہ بھی سوچتا ہوں اور یہ سوچ کر اپنی اشک شوئی تو کیا خود کو پُرسرور کر لیتا ہوں کہ ممکن ہے کہ یہ بات اچھی ہی ہو کہ عربی اور فارسی سے نابلد ہوں ورنہ عربی اور فارسی کے غیر مانوس رعب دار اور شاندار الفاظ کی شوکت کا دھارا اپنے بیان کی سادگی اور خلوص کو اپنی رَو میں بہا کر نہ جانے کہاں پھینک دیتا اور مزید یہ کہ فارسی میں جو خزانۂ خیالات ہو گا میں اُس کا سارق ہونے کے امکان سے بھی محفوظ رہا (یہاں امکان کے لفظ کی بجائے خطرے کا لفظ ابھارتا مگر امکان جب لکھ چکا تو پھر سمجھ میں آیا)۔

صنفِ رباعی سے اپنی محبت میں اتنا ضرور ہوا کہ زبانِ اردو میں جب بھی کوئی رباعی کہیں بھی دیکھی کیسے ہی غیر معروف اور گمنام شاعر کی ہو یا کتنے ہی نامی گرامی شاعر کی دونوں کو یکساں توجہ کے ساتھ پڑھا ویسے میں تفریحاً اپنی رباعی گوئی کیلئے عجیب الخلقت قسم کا خط ایجاد قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، خوش خطی کرنے کا بھی شوقین ہوں اور اپنی رباعی گوئی کو خطاطی کی ہیر پھیر میں حملۂ اعتراض سے بچانے کی صورت اِس پردے میں پیدا کی جا رہی ہے کہ بعض حروف سے یا الفاظ سے کچھ معلوم اور نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر اُنس یا پیار ہوتا ہے اور بعض سے اُلجھن، جو حروف اچھے لگتے ہیں وہ بڑے چاؤ سے لکھے جاتے ہیں اور اسی لئے اُن کے خم و پیچ میں ایک حُسنِ خاص نمودار ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے، لہٰذا میں اپنی رباعی گوئی کے سلسلے کو نبھانے کے لئے اور بات رکھنے کے لئے تفریحِ طبع کی خاطر اگر یہ کہہ جاؤں کہ مصرعوں میں اپنی پسند کے حروف استعمال کرتا ہوں تاکہ اُن سے جو لفظ بنیں وہ آپس میں ایک دوسرے سے متعلق ہو کر، ایک دوسرے میں سما کر پورے مصرعے کو صوری اعتبار سے جھومتا ہوا رقص کرتا ہوا بنا کر نظر نواز معلوم ہوں تو اِس بات کے کہنے میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔ مجھے واقعی ابجد کے بعض حروف لکھنے میں مزا آتا ہے اور بعض میں نہیں ایسے ہی اُن سے بننے والے الفاظ کے بُعد و قرب کی بھی صورت ہے، بعض الفاظ اپنے اجتماعی انداز میں ایک دوسرے لفظ سے جسمانی رشتے کے اعتبار سے آپس میں ایک رابطۂ خاص پیدا کرتے ہیں تو اُن کا آپس میں یہ تعلق ایک حُسن پیدا کرتا ہے۔ بہت چھوٹی سی مثال دی جائیگی مثلاً "ہم نے" اگر ردیف ہے تو اسکی خوشخطی میں کوئی خاص کھنچاؤ پیدا نہیں کیا جا سکتا لیکن "میں نے" اگر ردیف ہے تو "میں" کے نون کو آگے کو کھینچ کر "نے" کا لفظ شکمِ نون میں اِس طرح چُست بٹھایا جا سکتا ہے کہ دونوں

لفظ ایک دوسرے میں عاشق اور معشوق کی طرح سمائے ہوئے معلوم ہوں، لفظ کے معنی و مفہوم کے اعتبار سے اُس کے خم و پیچ میں کمی بیشی کی جاتی ہے مثلاً گردش لکھا جائے گا تو شین کا دائرہ شکم شین میں خم کھاتا ہوا چلا جائے گا اور گردش کے لفظ کے معنی و مفہوم کو ظاہر کردے گا اب اگر گردش کی بجائے چکر لکھا جائے گا تو اِس لفظ کی جسمانی ساخت ایسی نہیں کہ اُس میں کھینچا تانی کرکے لفظ کا مفہوم بھی ادا کیا جاسکے لہٰذا مصرعوں میں اپنی پسند کے الفاظ خطاطی کے نقطۂ نظر سے شامل کئے جاتے ہوں گے۔ بعض جگہ تو یہ کوشش شعوری طور پر کی گئی ہے۔

جب اپنی ثانٹ والی جلد "رباعیاتِ صادقین نقاش" کے نام سے چھپ کر آئی تو یہ نیک ارادہ باندھا تھا کہ اب رباعی گوئی کو خیرباد کہہ دیا جائے کیونکہ آدمی کو وہی کام کرنا چاہئیے جو اُسکے بس کا ہو۔ نسلِ نوخیز کے لوگ اکثر دستخط اور ہلکا سا کوئی خاکہ بنانے کی فرمائش کرتے ہیں اور تصویر فوراً بن جاتی ہے لہٰذا میں عام طور سے تصویر بنا دیا کرتا ہوں لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ فرمائش خوش مذاق لوگوں کی طرف سے ہے تو اُس وقت رباعی لکھ دیتا ہوں اور بعض اوقات صورتحال سے متاثر ہو کر خود بخود ہی فی البدیہہ رباعی ہو جاتی ہے۔ اس طرح نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اوپر رباعی گوئی کی جو پابندی میں نے خود ہی لگائی تھی اُس کے سلسلے میں اپنی قوتِ ارادی جواب دے گئی اور اپنے جمالیاتی، حیاتیاتی اور فنی محسوسات پر رباعیاں وقتاً فوقتاً اور کاموں کے دوران ہوتی رہیں۔ اور آثار ایسے نظر آتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا سلسلہ کیوں جاری ہے کس لئے جاری ہے یہ مجھے پتہ نہیں لیکن جاری ہے، رباعی گوئی ہونی چاہئیے کہ نہیں کا سوال تو جب پیدا ہو گا جب کرنے نہ کرنے پر اختیار ہو، جب کوئی خیال آناً فاناً اچانک ذہن میں چمکتا رہے تو خانۂ تخیّل کی تاریکیوں سے سفیدئ قرطاس پر وجود میں آنے کے لئے اپنی توانائی اور طاقت سے مجھے بیشتر اوقات نقوش، کبھی کبھی خطاطیاں اور شاذ و نادر رباعیاں لکھنے کے لئے مجبور کردیتا ہے اور میں ناگہانی طور سے اُس کو عدم سے وجود میں لاکر دیکھتا ہوں اور دکھاتا ہوں اور ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مثلاً کسی نے بہت ہی اچھا کام کیا ہو تو اُس کا کیا کمال، میں نے اگر بہت ہی بُری رباعیاں کہیں تو اس میں میری کیا خطا۔ یہ تو جوہرِ خداداد کی بات ہوتی ہے، یہاں لگے ہاتھوں ایک بات جو پہلے کہی اور کہہ چکا ہوں پھر کہتا چلوں کہ جوہر، جس حیثیت کا اور جس اوقات کا بھی ہو بندے کے پاس ایک امانتِ آسمانی ہوتا ہے۔ اس کو بروئے کار نہ لانا امانت میں خیانت کرنا ہے اور بروئے کار لانا اپنے نزدیک عین عبادت ہے۔ کسبِ کمال کی توفیق بھی اوپر ہی سے عنایت ہوتی ہے اور روز و شب کا فرق مٹا دیتی ہے۔ فنی اعتکاف ایک اضطراری کیفیت کی گرفت میں آکر ہوتے ہیں اور پیچلے خانۂ تقویم سے باہر نکل کر کھنچے جاتے ہیں جہاں سے گردشِ شام و سحر کا چلتا ہوا چکر ایک جھُن جھنا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے وجود کا ایک ایک رونگٹا کام میں لگا دیا جاتا ہے، دنیا کی بڑی بڑی رنگینی جو تصویر میں لائی جاسکتی ہے کام کی طرف سے ذرا سی بھی دیر کو گردن موڑنے کے لئے ہیچ معلوم ہوتی ہے، زندگی کی چند ہی راتیں ایسی ہونگی جن میں شب زندہ داریوں کے ساتھ الصلوٰۃ خیرٌ من النوم نہ سنا ہو۔ بہرکیف مختصر یہ ہے کہ کام جس کا کرنا اپنی فطرتِ ثانیہ اور جس کا شوق زندگی سے پیار کی طرف مائل کئے ہوئے ہے کام کرنے کے لئے زندہ رہنے والوں میں سے ہوں نجات کا یہی راستہ ہے، کام ہوتا رہے اچھا کام اچھے کام کے ارادے سے نہیں ہوتا بلکہ خود بخود ہی ہو جاتا ہے، میں بُرا بھلا جیسا بھی ہوتا ہے افتادِ طبعیت سے مجبور ہو کر کام کرتا رہتا ہوں، کام کرتے رہنے کے اِس تسلسل میں اِس بات کے امکان کی طرف سے ناامید نہیں ہوتا کہ شاید سوءِ اتفاق بُرا بھلا کام کرنے کے دوران میں کسی اچھے کام کے ہو جانے کا واقعہ بھی پیش آجائے لہٰذا کام ہوتا رہتا ہے اور اگر ابھی تک اچھا کام نہیں کرسکا ہوں تو مستقبل میں اچھے کام کے ہو جانے کے اتفاق امکان کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔

خدانخواستہ خدانخواستہ اِس لالچ میں بھی کام نہیں ہوتا کہ کام ہو جائے تو چار پیسے ملیں، یہاں تو اُلٹے اور خرچ کئے جاتے ہیں۔

کام اپنے کلیان کا راستہ ہے، نظام الحیات ہے اِس کے نہ کرنے پر اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، اگر سونے کا بنا ہوا ایک شہر اپنی ملکیت اِس شرط پر بالفرض قرار دے دیا جائے کہ آئندہ پنسل قلم کا غذ وغیرہ کو ہاتھ نہ لگانے کی صورت میں یہ معمورۂ طلائی جملہ اس میں بسی ہوئی "دوشیزگانِ نازپرور" کے تمہارا ہے تو میں اس پیشکش کو یہ جانتے ہوئے کہ اس شرط کو پورا کرنا میرے اختیار سے باہر ہے ٹھکرا دوں گا۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ قلم یا موقلم یا رنگ کا چھونا جرم ہے اور اس کو چھونے کی سزا پانچ دُرّے ہیں تو اپنی لاغری دیکھتے ہوئے تازیانۂ جلاد کا نیل گوں

تصور کام کرنے میں حائل تو ضرور ہوگا مگر پھر بھی اضطراری طور پہ بے اختیارانہ انداز سے ، بغیر سوچے سمجھے جرمِ خاکستی سرزد ہو ہی جائے گا۔
میں کئی روز تک مسلسل بغیر کھائے زندہ رہ سکتا ہوں، کئی راتوں بغیر سوئے مگر بغیر کچھ نہ کچھ کام کئے ایک دن بھی نہیں۔ ان ہی محسوسات کے اظہار کے لئے یہ رباعی کہی تھی:

گر ترکِ محبت کی جزا ہیں توڑے　　　　گر جرمِ محبت کی سزا ہیں کوڑے
کوڑے ہمیں منظور ہیں ورنہ دل میں　　　　سرطانِ جمود کے سڑیں گے پھوڑے

حالت یہ ہے کہ جس ٹوٹی ہوئی چوکی پہ کام کرتا ہوں اُس کے علاوہ مجبوراً کہیں اور ہوتا ہوں تو ایک تشنج آمیز بے چینی محسوس کرتا ہوں، یوگا کی نشستوں اور زاویوں سے زیادہ پیچیدہ اور مختلف پہلوؤں سے کام کیا جاتا ہے۔ اس چوکی کے بارے میں کسی سے کہہ بھی رہا تھا کہ یا تو بطنِ مادر ہی میں سکون ملا ہوگا یا پھر قبر کی تاریکی ہی میں چین ملے گا ورنہ تو دنیا میں صرف اس چوکی پہ ہی آرام معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ مجھے اِس وقت کی تمام اپنی گفتگو "بہ گردِ مرکزِ خود صورتِ پرکاری رقصم" کا مصداق نظر آرہی ہے لیکن قدرے تکلف سے حقیقتِ احوال کا اعلان خفیف کر ہی دیا گیا ہے جس پر کچھ ندامت سی بھی ہے۔

خود ستائشانہ جملوں میں کافی اپنی باتیں کر رہا ہوں اور پھر ایسے سماجی گرد و پیش میں جس کا مزاج یہ ہے کہ اگر یہ کہوں کہ مجھے ملیریا یا یرقان ہو گئی ہے تو اِس عارضے کے اظہار کو بھی خود نمائی، خود بینی اور خود پرستی پر محمول کیا جائے گا ایسے ماحول میں یہ کہنا کہ خیریت سے ہوں اپنے ڈھیٹ ہونے پر تو صواد کر ہی دے گا۔ اور وہ جو مجھ پر چند ہی دن پہلے "منظرِ عام" پر مفتیانِ فن فہم نے خود بینی اور خود پرستی کا فتویٰ لگایا تھا اُس فتوے کی "صداقت" کو یہ میری گفتگو مزید طمانیت اور توانائی پہنچائیگی۔ بغیر کسی تکلف کے حسبِ معمول صاف صاف یہ کہہ دوں کہ مجھے اپنے بارے میں بات کرنے میں صرف اُس صورت میں مزا آتا ہے اگر ممالکِ غیر کی سیر کو کوئی صاحب گئے کلاہِ دانشوری کج ہوئے اور وہاں سے وہ آئے اور اُنہوں نے بحیرۂ روم کے جزیروں اور ساحلی شہروں میں جو کامیاب عشق کئے اُن کے "شیمپین اور کیویار" قسم کے افسانے سنانے شروع کر دیئے تو بالفرض وہ بالکل سچ ہی کیوں نہ کہہ رہے ہوں لیکن سننے والا پہلے تو اُکتا جاتا ہے اور اوپر سے یہ بھی سوچتا ہے کہ دروغ گوئی سے کام لیا جا رہا ہے بھلا فلاں جواں سال ناول نویسہ سے چند دن میں کہاں ملاقات ہو گئی ہوگی اور بالفرض اگر کہیں ہو بھی گئی ہوگی تو موصوف کے ساتھ کسی شہر سے "ریلوے جرنی" کے بعد جزیرۂ میورقہ تک کشتی رانی کا وقت کہاں سے نکالا ہوگا اُس نے، اِس کے برخلاف اگر کوئی شخص اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا ذکر کرے کہ میرے جہاز میں آگ لگ گئی تھی، جہاز غرق ہو گیا تھا لیکن میں بچ نکلا اور کسی موج نے مجھے ایک جزیرے میں پھینک دیا میں وہاں کئی روز بھوکا رہا اور پریشانی سے پیدا ہونے والی نقاہت نے میری صلاحیتِ خود لذتی کو بھی پامال کر دیا۔ تو اِس بات کو نہ صرف آدمی توجہ سے سُنے گا بلکہ اُسے سننے کے بعد بات میں یقین بھی کرے گا اور سنانے والے سے اُس کے دل میں ایک جذبۂ ہمدردی بھی کارفرما ہو جائے گا۔ میں اپنی وہ خود نمائی جو آشیانۂ زاغ و زغن اپنے سر پہ بنا کر کیا کرتا ہوں اُس کا مطلب یہی ہے کہ میں وہی ہوں جو ہوں، اب اِس کو خود پرستی کہہ لیا جائے تو وہ کہنے والے کی مرضی کی بات ہے ورنہ سر پہ چوبا بنانے کی بجائے تاجِ زرنگار بنانے کے لئے تو چند ہی لکیریں مارنی پڑینگی لیکن ایک مضحکہ خیز جھوٹ اور شرمناک قسم کی خود ستائی اور خود پرستی ہو جائے گی۔

میں اپنی ہر تصویر میں خود کو ہیچ مداں ہی بناتا ہوں لیکن بعض اوقات یہ سوچ کر کہ کہیں ہیچ مدانی کے پردے سے چہرۂ تعلّی نہ جھانک رہا ہو تو لہٰذا ہیچ مدانی سے بھی بچتا ہوں اور پھر ڈنکے کی چوٹ پر کی ہوئی اُس تعلّی کو بہتر سمجھتا ہوں جس کے پردے میں خاکساری اور خاک نشینی چھپی ہوئی ہو، ویسے سر پر آشیانۂ زاغ و زغن بنانے میں بھی ایک تعلّی اور خود ستائی کا زاویہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ میں سچ بولتا ہوں اور میرے وجود پہ منافقت کا خول چڑھا ہوا نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہو جاتا ہے کہ یہ تمام بات پھر خود کہنے کی بجائے سر پہ قیام پذیر کوا کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے تعریف کرتا ہے یہ جو ہیں وہی ہیں، یہ حسینوں کی نگاہ سے بچا کر اُن کے جسم کے خطوط کی فیتہ نگاہ سے پیمائش کر لیتے

ہیں اور اخلاقاً پہلے اُن کو آگے بڑھاتے ہیں اور پھر پیچھے چلتے ہوئے گردن کے خم کا، شانوں کے لوچ کا "مدِ رفت" کے اتار چڑھاؤ کا، کولہوں کے خم کا اطمینان سے جائزہ لیتے ہیں۔ اور پھر اُن کو رخصت کرتے وقت اپنے خمِ سلام میں اپنے پردۂ نگاہ کی طہارت کا پورا بھرم رکھتے ہیں۔

میں اپنی فتوحات کی بات نہیں کرتا۔ اپنی پامالیوں تباہ حالیوں کی بات یہ سوچ کر کہ یہ میری ہی نہیں میری طرح اور افراد کی بھی پامالیاں ہیں کر لیتا ہوں، ایک وجود پر آشیانۂ زاغ و زغن بناتا ہوں اس وجود پر اپنے خد و خال کا اور اپنے دست و پا کا ایک چھینٹا مار دیتا ہوں، اعضا کے درمیان مسکنِ عنکبوت کا تار و پود بنایا جاتا ہے، گوشہ ہائے جسم میں چوہے لوٹ رہے ہوتے ہیں، بدن پہ رینگتی ہوئی چھپکلیاں، کیڑے مکوڑے اور گنڈاریں بنائی جاتی ہیں تو یہ خود نمائی تو ایک طرح ہو سکتی ہے لیکن خود پرستی نہیں، حق پرستی ہو تو ہو، ویسے خود نمائی بھی نہیں ہے۔ خود نمائی تو جب ہو جب سر پہ زاغ و زغن کا آشیانہ بنانے کی بجائے ظلِ ہما بہ مع جملہ لوازماتِ شاہانہ کے بنایا جائے، یہ تو سب جزیرے پر تباہ حال آدمی کی بات ہے اور جزیرے پہ ایک میں ہی نہیں اور جزیروں میں میرے جیسے کتنے ہی اور موجود ہیں اور اپنے آپ کو بہت قریب دیکھ کر اور بالکل اپنی زد میں اور اختیار میں دیکھ کر خود کو ان سب کے نمائندے کے طور پہ ایک تباہ حالی اور بیداری کی علامت بنا لیا ہے تو قبر میں ٹانگیں لٹکائی ہوئی بوڑھی ثقافت کے فاضل ناقد مجھ پر اس سلسلے میں خود نمائی وغیرہ کا فتویٰ لگا دیں تو میں اُسے کیسے درخورِ اعتنا سمجھ سکوں گا۔

اپنے وجود پہ پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانے کے عمل پر مجھے اگر خود بینی اور خود پرستی کا الزام دیا جا رہا ہے۔ تو میں اس کو سر آنکھوں پہ ایک منصفانہ فیصلہ مانتے ہوئے یہ کہوں گا کہ بظاہر اپنے ہی خد و خال پر طبع آزمائی کرنے کو ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کہ شاعر اپنے شعر میں اپنی ہی بات اور اپنا ہی واردات بیان کرتا ہے اور تخلص اپنا ہی استعمال کرتا ہے، میں تو جہاں تباہ حال آدمی بنانا ہو وہاں خود کو بگڑی ہوئی اور جلی ہوئی صورت میں تصویر میں شامل کر دیتا ہوں، ایک لطیفہ یا واقعہ اور سنا دوں، اب سے کوئی دس سال پہلے بنک دولت پاکستان کی لائبریری میں ایک دیواری تصویر لائبریری کی رعایت سے بنائی تھی، یعنی جو صاحبانِ علم و دانشِ عالیہ سقراط سے لے کر آئن اسٹائن تک گزرے ہیں اُن کو اس تصویر میں یکجا کر دیا تھا بنیادی طور پہ یہ خیال حسنی صاحب مرحوم و مغفور کا تھا، میں اس لئے لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مبادا اس خیال کی موجودیت کا "کریڈٹ" کہیں مجھ کو نہ دے دیا جائے۔ میں نے صرف اجمال میں تفصیل ضرور شامل کی تھی۔ خیر تو اس ترتیب میں ہر صاحبِ کمال و دانش کو اُس کے علم کی نوعیت کے لحاظ سے علامات کو شناختی نشان کے طور پہ شامل کر دیا تھا، مثلاً ایک بزرگ جیومیٹری کی شکلیں بنا رہا ہے تو وہ اقلیدس ہو گیا ایک بزرگ طبیب ہے تو وہ کسی مردِ لاغر و بیمار کی نبض دیکھ رہا ہے تاکہ پہچان میں آئے کہ طبیب ہے یہاں پہ بیمار آدمی میں نے خود اپنے ہی نمونے کا بنا دیا ہے اور اس کے لاغر جسم اور اتری ہوئی صورت پہ اپنے ہی جسمانی عناصر کا ایک کھولتا ہوا چھینٹا مار دیا ہے۔ بلڈنگ کے افتتاح کے موقع پہ جب سربراہِ مملکت تشریف لائے تو ایک صاحب نے اُن سے کہا کہ ان بزرگانِ عظیم میں صادقین نے خود کو بھی شامل کر دیا ہے۔ میں نے فوراً بتایا کہ یہاں پہ ایک لاغر، مریل اور بیمار آدمی بنانا اس لئے ضروری تھا کہ ایک نباض دوراں اُس کی نبض دیکھ رہا ہو، اگر میں اپنے علاوہ کسی اور کو اس حالت اور حلیئے میں بنا دوں تو وہ ناراض ہو گا کہ میری تضحیک کی ہے اور مذاق اڑایا ہے، لہٰذا اس کے پیشِ نظر میں نے خود ہی اپنے آپ کو بنا کر اپنا خود ہی مذاق اُڑا دیا ہے، ننگی بھوکی مگر بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کی نمائندہ علامت کے طور پہ سر بریدہ وجود جو سر بریدہ کو ہاتھ میں لئے ہوئے وجود سے سرشار ہے اور سر کٹنے کے بعد بھی اپنی جد و جہد اور جذبۂ حیات سے بھرپور رہے۔ اوروں پہ خدانخواستہ نہیں خود پہ کیچڑ اچھالتا ہوں ایک واقعہ اور لکھتا چلوں:

ایک موقع پہ تیز روشنیوں کے قمقموں کے نیچے اور کیمروں کے سامنے جہاں میں اخلاقی مجبوریوں کی وجہ سے بالاکراہ چلا گیا تھا مجھ پہ کچھ لوگ اعتراضات کر رہے تھے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ میں خود بینی اور خود نمائی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو کیمروں کے چالو ہونے سے پہلے خود اپنی آرائشِ جمال کے لئے ملحقہ آئینہ خانے یا سنگار خانے میں جا رہے تھے۔ اور بضد تھے کہ میں بھی چلوں، میں نے اُن سے کہا کہ کیا ہو گیا ہے میں نہیں جاؤں گا، وہ بولے کہ اگر بیس نہ لگایا جائے تو خد و خال اچھی طرح اُبھر نہیں ہوتے، خیر وہ تو سنگار خانے میں چلے گئے، کافی دیر میں پلٹے، اِس

دوران متعلقہ عملے کے لوگ مجھ سے کچھ سائنسی مجبوریوں کے تحت کہتے رہے کہ آپ بھی چلیں، میں نے قدرے سختی سے کہا کہ یہ کام میں نہیں کرسکتا کیا فرق پڑ جائے گا اگر عکس بُرا آئے گا، خیر تو جب اعتراض کرنے والے لوگ سنگار خانے سے آگئے اور مجھ زمین پہ پارڈ بورڈ پہ سو جانے والے شخص پر خود نمائی اور خود بینی کا اعتراض کر رہے تھے تو میرے دل میں آیا تھا کہ میں کہوں کہ ابھی ابھی آئینہ خانے میں کون گیا تھا؟ میں کہ آپ؟ مگر میں نے کہا کہ نہیں حدِ ادب کی بات ہے اور میں" کہتے ہو کر خود بین وخود آرا ہوں نہ کیوں ہوں" پھر کر بات کاٹ گیا ویسے میں یہ کہنے کی اخلاقی جُرأت رکھتا تھا کہ جہاں کہیں بھی موقع ملتا ہے یعنی اگر کسی بھری ہوئی لوٹے میں، آئینہ ہو تو میں اپنی شکل ضرور دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں اگر صرف ہاتھ دھونے یا کُلی کرنے کے لئے حمام میں جاؤنگا تو ایک نظر آئینے میں اپنے عکس پر چلتے چلتے ضرور ڈال لونگا۔ ایک مرتبہ ایک بُت طناز قسم کی لڑکی بڑے بڑے دائروں والا چشمہ لگائے ہوئے تھی ظاہر ہے کہ میں اُسکی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر اُس سے کہا کہ قطعاً اس غلط فہمی میں نہ پڑنا کہ میں تمہاری آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہوں، وہ بولی کہ تو پھر اور کیا دیکھ رہے ہیں اور پھر میں نے اُسے بتایا کہ میں تمہارے چشمے کے کالے شیشوں کی چمک میں خود اپنا ہی عکس دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے بال میرے حساب شائستگی سے ٹھیک ہیں کہ نہیں یعنی بے تُلے انداز میں الجھے ہوئے ہیں کہ نہیں، خود بینی کا یہ عالم ہے کہ حسینوں کے غسل خانے میں بھی گیا ہوں اور اُن غسل خانوں کے آئینوں میں اپنی شکل دیکھی، اس خیال سے نہیں کہ "بناؤ سنگھار" ٹھیک ہے کہ نہیں۔ اصل میں آئینوں میں حسینوں کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھا کہ "اُن گیسوؤں والوں کو ابرو کے کمانداروں کو" یہ "دریدہ دامنوں والا پریشان گیسوؤں والا" کیسا لگ رہا ہے خود بینی کی وہ منزل ہے کہ خیر آئینے تو پھر آئینے ہیں ٹھہرا ہوا پانی بھی اگر نظر آجاتا ہے تو اُس میں اپنی صورت کا جلوہ ضرور کر لیا جاتا ہے چاہے وہ پانی گندا ہی کیوں نہ ہو، اور آئینے میں دیکھتے وقت یہ ضرور سمجھ لیتا ہوں کہ آئینے میں جتنی اُلٹی تحریر نظر آتی ہے اتنی ہی اُلٹی تصویر بھی نظر آنی چاہیے۔ بایاں ہاتھ دایاں اور دایاں ہاتھ بایاں نظر آتا ہے اسی طرح پورا وجود کا وجود، وجود کی جہت اگر مشرق میں ہے تو آئینے میں مغرب میں نظر آتی ہے، اسی لئے کبھی کبھی میں اُلٹی خطاطیاں کرتا ہوں تاکہ آئینے والی دنیا میں سیدھی نظر آئیں۔

لگے ہاتھوں کچھ اور اعتراضات کا بھی جواب ہوتا چلے :۔

تصویروں کی طرح اپنی رباعیوں کے بھی تمام کے تمام خاندان ایسے ہیں کہ جس خاندان کی جو رباعی ہے اُس خاندان کی دیگر رباعیوں سے شکل وشباہت، معنی ومفہوم میں ملتی جلتی ہے، بات ایک ہی ہے کہنے کا طریقہ اور زاویہ مختلف ہے، اس پر بھی تصویروں کی طرح تکرار کا اعتراض ہوسکتا ہے، یہ ایک ہی بحر میں کہی ہوئی رباعیاں ہیں۔ اُس کے علاوہ اپنی افتادِ طبع اور نظریہ جمال یہ ہے کہ کسی شے کا جمالیاتی مشاہدہ ہر زاویے اور ہر پہلو سے کرنا چاہیے اور رُخ اور نیم رُخ کے درمیان جتنی بھی صورتیں ہیں وہ بھی مشاہدے میں آنی ضروری ہیں، صرف رُخ اور نیم رُخ سے ہی بات نہیں بنتی، ایک ہی بنیادی خیال کی دوشیزۂ خوب رُو کو اُس کے امکانی طریقے پر مختلف النوع طریقوں سے بال بنا کر، مختلف النوع رنگوں کے مختلف النوع لباس پہنا پہنا کر اور پھر مختلف النوع زاویوں سے اُس کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ چیز وہی ہوتی ہے، دھوپ میں اُسی چیز کو دیکھو تو اور ہی رنگ ہوتا ہے، سایۂ شاخِ گل میں بارہویں کے چاند کی چاندنی میں دیکھو تو کچھ اور ہی روپ نظر آتا ہے، مختلف اوقات میں، مختلف زاویوں سے شے کے مختلف رنگ اور مختلف پہلو نظر آتے ہیں، فنِ مصوری میں میرا اپنے موضوعِ تصویر کی طرف ایک خاص ذاتی رویہ ہوتا ہے، کوئی سہ جہتی ہیولیٰ ہے، شش جہت سے دیکھا جاسکتا ہے، اب ہر جہت کے درمیان میں بے شمار زاویے ہیں جہاں سے اِس پر نظر ڈالی جاسکتی ہے اور اگر ان زاویوں کو آپس میں ضرب دے دینا شروع کر دیا جائے تو زاویوں کا معاملہ اور شے کے پہلوؤں کا سلسلہ "انفنٹی" تک چلا جائے۔ تو شے کے وجود کے لامتناہی گوناگوں زاویوں اور صفتوں کا یک نحو تصور ایک ایسی سطح پر جس میں صرف طول اور عرض کی دو جہتیں ہوں، پیش کرنے کی سعیٔ پیہم کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ سعیٔ پیہم کا سلسلہ موضوعِ سخن شے کے وجود کو اپنے وجود میں اور اپنے وجود کو موضوعِ سخن شے کے وجود میں زردی اور سفیدی کی طرح لاشعوری طور پر ذہنی مراحل کے بعد پھینٹ دینے کے بعد غیر ارادی طور پر جاری ہوتا ہے اور پھر یہ خلوص سعیٔ پیہم ہوتی چلی جاتی ہے، موضوع سے خلوص موضوع کا ہر رنگ روپ دیکھنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے، سعی سعی اور پھر سعی کے اس عمل کو جب بوالہوس اپنی حُسن پرستی ثابت کرنے کیلئے

موضوع کی بحث سے اور میری موضوع سے وابستگی کے اِس سلسلے کو "تکرار" کہتا ہے تو مجھے ہنسی تک بھی نہیں آتی کیونکہ شیوۂ اہلِ نظر کی آبرو بہرحال برقرار رکھنی ہوتی ہے۔

خلاصۂ اعتراضات یہ تھا کہ اس کے فن میں تکرار ہے تصویریں بے رنگ ہیں جن میں نومیدی و بدصورتی ہے لطف یہ ہے کہ یہ اعتراضات اُن حضرات کی طرف سے صادر ہو رہے تھے جنہوں نے میرے کام کا اعتبار یہ سے بھی کم حد اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا ہے۔ تکرار کے بارے میں میں نے ایک موٹی سی مثال یہ دی کہ ہندسہ ۵ ہے۔ دو اور تین کو جمع کریں، چار اور ایک کو جمع کریں تو نتیجہ ۵ ہی ہوگا۔ ۵ کو ایک سے ضرب دے دیں یا پچیس کو ۵ سے تقسیم کر دیں یا سات میں سے دو کو نکال دیں تو ۵ ہی باقی بچے گا اور یہ ۵ کے وجود کے مختلف پہلو ہیں اور یہ پہلو اتنے ہیں کہ تعداد و شمار کی سرحدوں کو توڑ کر لامتناہیت کا عالم ہیں کہ اس ہی ۵ کو امکانی طور پر مختلف زاویوں سے دیکھنا تکرار نہیں ہے بلکہ ۵ کے وجود کے ادراک کرنے کا طریقہ کار ہے۔

— معترضین کا دل رکھنے کے لئے اگر میں اِس کو تکرار ہی مان لوں تو پھر مزید یہ کہوں گا یہ تکرار ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر تکرار ہے لیکن یہ وہ تکرار ہے جو کہ قوالی میں ہوتی ہے، جو آداب اور حُسنِ قوالی سے ناواقف ہیں وہ "بصد سامانِ رسوائی" کی مسلسل مختلف النوع طریقوں سے ادائیگی کو تا کہ اسکی کیفیت اور معنویت نمودار ہوتی چلی جائے، اِس کو تکرار ہی سمجھیں گے لیکن بندگانِ طریقت کے نزدیک یہی چیز قوالی کا حسن و جمال ہوگی۔

ایک بار پھر یہ کہوں کہ یہ تکرار ہے لیکن اُستاد فیاض خاں کی گائی ہوئی ٹھمری کے بول کی تکرار ہے اور یہ جو لوگ موسیقی کے حُسن و جمال سے نابلد ہیں اُن کے لئے تو تکرار ہے اور جو موسیقی سمجھنے والے ہیں اُن کے لئے یہی چیز موسیقی کی جمیل اور لطیف روح ہے۔ اور اگر تکرار کی پوچھیں تو صحیح معنوں میں تکرار تو "سورۃ الرحمٰن" میں آتی ہے، ۳۱ مرتبہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ آیا ہے، میں نے اپنی خطاطی کے ابتدائی دور میں سورۃ الرحمٰن لکھی تھی، اور اس آیت کا ہر مرتبہ مختلف رنگ مختلف روپ اور مختلف پیکر بنایا تھا یعنی اسکی صوری ساخت اور ماہیت ہر جگہ مختلف تھی، مختلف اشکال والوں سے لکھی ہوئی اِس آیت کو جو کہ حسن و معنی کے اعتبار سے واقعی تکرارِ آسمانی ہے لیکن صوری طور پر ہر جگہ کچھ اور ہی قد و قامت اور مختلف النوع لباس میں آراستہ کی گئی ہے اِس اشکالی سلسلے کو بھی اگر تکرار کہا جائے گا تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔

ایک شے کے وجود کو گوناگوں زاویوں سے دیکھنا کیونکہ اپنی فطرتِ ثانیہ ہے تو رباعیات میں بھی اِس قسم کی تکرار پائی جاتی ہے، اُس کے پہلے رنگ میں ہے، اِس اعتراض کا جواب دینے کے لئے کیونکہ اب بیاض میں گنجائش نہیں معلوم ہو رہی ہے تو میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر دل سے نکلی ہوئی بات سادہ الفاظ میں کہدی جائے تو کیا مضائقہ ہے، اِس قسم کی بات کسی اور سلسلے میں درمیان کے اوراق میں کر چکا ہوں لہٰذا اب تیسرے اعتراض کا مختصراً ابسفی الحال یہ ہے کہ میں جب کبھی کسی ویت نامی شہید کی یاد میں یا کہیں اور انسانیت کے اصولِ اعلیٰ کی خاطر جان دینے والے سورما کے تصور میں تصویر بناتا ہوں تو کہا جاتا ہے کہ اِس کا فن نومیدی و بدصورتی کے علاوہ ہے ہی کیا۔ ظاہر ہے کہ ان اعتراض کرنے والوں کا تصورِ فن یہی ہے کہ اچھی تصویر وہ ہے جس سے ڈرائنگ روم کی آرائش ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انسانیت پر مظالم ڈھانے والے جلادوں اِن شقی القلب کی داشتاؤں کی زرق برق لباس میں شوخ و شنگ تصویریں بناؤں، یہاں پر یہ اجمال بھی ضرورت سے کچھ بہت ہی زیادہ ہے۔ کسی تقیع جور کی آراستہ شہ نشین میں اُس کی داشتہ کی مصنوعی اور بناوٹی کھوکھلی مسکراہٹ میرے لئے بے معنی ہے، ڈسٹ بن پر پھینکے ہوئے پس خوردہ کی جب ایک ننگا بھوکا آدمی تلاش کرتا ہے اور جب اِس جدوجہد میں کامیاب ہوتا ہے تو اُس کے چہرے کا تاثر معنی خیز معلوم ہوتا ہے، مناد مریں کا نہیں میں تو گٹر کا مصور ہوں، شاہ نشینوں کی آرائشی ماحول اور خوشبوؤں سے نہیں ڈسٹ بن کے تعفن میں سچائی تلاش کرتا ہوں۔

رباعیات کی طباعت و ضخم اور کچھ نہیں تو اِس قسم کا تاثر چھوڑنے کا خطرہ اپنے دامن میں لئے ہوئے ضرور ہے کہ جیسے کہ کوئی اہتمام اور التزام کیا گیا ہو، سب پٹی پٹائی چیزیں ہیں، صرف اِن کو نئے طریقے سے ترتیب دے دیا گیا ہے، پھر بھی مجموعے کی صوری صورتحال یہ تاثر چھوڑ سکتی ہے کہ اس نے اپنی نقاشی اور خطاطی کا پوری طرح جائز اور ناجائز استعمال کیا ہے، ویسے اخلاقی نقطۂ نظر سے میں یہ سوچتا ہوں کہ شاعر اگر خود ہی اپنی خطاطی کرے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، اسی لئے جتنا اہتمام اور التزام کیا جا سکتا تھا اور جس کے جملہ ذرائع اور وسائل اپنے اختیار میں تھے اُس کا

اعشاریوں والا حصہ بھی اِن کے "میک اپ" پر کام میں نہیں آیا ہے، اپنے نزدیک تو یہ "کیئر دل لک" ہی کی صورت ہے، سوئی سب کو کپڑے پہنا دیتی ہے اور خود ننگی رہتی ہے۔ اپنی یونہی سی نگارشات اور پھر اُن کی نقاشانہ آرائش کے پردے کے پیچھے نہیں بلکہ پردے کے آگے ایک قسم کی خود نمائی اور خود پرستی ننگی ناچتی ہوئی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ہوگی یہ فنی کھیل رنگینی اور پیچیدگی سے نہیں، صفائی اور سادگی سے کھیلا گیا ہے اس کے باوجود تو خیر خود اپنے ہی آپ سے خود پوچھتا ہوں کہ اپنی نقاشی کے ہاتھوں۔ خطاطی کے تیل سے "ون مین شو" کی آڑ میں تو نے اپنی انائے شاعرانہ کی مالش تو نہیں کرائی ہے اور اب تو یہ "ون مین شو" کا لفظ بھی مجھے ایک ماری ہوئی ڈینگ معلوم ہو رہا ہے لہٰذا میں اس سے بھی درگزر کرتا ہوں، غریب اور نادار آدمی اپنے کام یعنی کھانا پکانے، سودا خریدنے، کپڑے دھونے، جھاڑو دینے غرض یہ کہ اپنے جملہ کام خود ہی انجام دے لیتا ہے۔

اگر رباعیات کی یہ باتصویر جلد دیکھنے والے کو اچھی لگ رہی ہو تو میں اسکی داد نہیں چاہتا ہوں لیکن اگر بُری ہے تو اس کو سننے کیلئے ہمہ تن گوش برآواز ہوں، اسکی اشاعتِ اوّل ربیع الاوّل ۱۳۹۰ھ یا شاید ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ میں ہوئی تھی، میں نے پرانے خیال کا آدمی ہونے کی وجہ سے اس کا نام جدید روش پر نہیں رکھا تھا، پرانی ڈگر ہی پر "رباعیات صادقین" رکھا تھا لیکن میری قدامت پرستی اس سے کچھ مطمئن نہیں تھی کیونکہ اگلے وقتوں کے لوگ اپنی کتاب کا نام تاریخی بھی رکھا کرتے تھے تو اس میں مزید دقیانوسیت کا عنصر شامل کرنے کیلئے جب تاریخی نام بنانا چاہا اور آگے "نقاش" لگا دینے سے جو فوراً ہی مادۂ تاریخ بغیر کسی بھی کوشش کے یونہی نکل پڑا تو میری آنکھیں کُھل گئیں، بہرکیف اشاعتِ دوم کے وقت یہ باتیں بتانی ضروری تھیں اور کیونکہ ثاث والی طباعتِ اول کی طرح اِن رباعیوں کی اشاعتِ دوئم کی جلد کو از قسم پیش لفظ سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا اُس سے متعلق کچھ ضروری اور غیر ضروری پریشانیاں اس بیاض میں لکھ دی ہیں اور اب اِس بیاض کے بارے میں کچھ عرضداشت ہے۔

کوئی بھی کام ہو تشکیل کے جملہ مدارج و مراحل سے گزر کر تکمیل کو پہنچتا ہے، کاغذ کے مٹیلے ٹکڑوں پر پنسل سے لکھی ہوئی چیز ہی تو اصلی چیز ہوتی ہے، مجموعۂ خیال فرد فرد ہوتا ہے اور پھر تالیف نسخۂ جانفزا کی جاتی ہے اور پھر کاتب اُسکی مناسب حاشیہ آرائی کرکے شانِ قلم سے مشاطگی کرتا ہے اور پھر بن سنور کے دیدہ زیب سرورق کے لباس میں جس کی خیالی مصور کرتا ہے۔ کتاب ہم تک پہنچتی ہے۔ اُس سے پیشتر تر بتر مسودے کے مٹیلے کاغذوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں، اُن رباعیاں کے بعد بھی رباعیاں ہوتی چلی گئیں اور اب بھی ہو رہی ہیں اُن کی جب کبھی کتابی صورت بنے گی تو اُس کا نام "رباعیاتِ صادقین خطاط" ہوگا۔ اوّل تو رباعیاں ہوتی ہیں پھر نسخہ جانفزا کی تالیف ہو جاتی ہے پھر کہیں جاکے کتاب آسکتی ہے۔

میں کتاب سے پیشتر ہوتے ہوئے مسودے کی جو مٹیلے کاغذ پر صورتحال ہوتی ہے اُس منزل پر بیاض کی صورت آپ کو دکھا رہا ہوں، یعنی آنے والی کتاب اپنی نشو و نما کی ابتدائی منزلوں میں دکھائی جا رہی ہے، مکمل تصویر نمائش گاہ کی کشادہ دیواروں پر موزوں فریم میں مناسب فاصلے سے نہیں دکھائی جا رہی لیکن تصویر جو ابھی بنانی شروع کی ہے وہ آپ کو کارخانے میں دکھائی جا رہی ہے۔

رباعیات کی طباعتِ دوئم کچھ روا روی والا بناؤ سنگھار کرکے تھوڑی بہت نوک پلک بنا کر شاہ نشین میں ایک ادائے سادہ کے ساتھ بیٹھی ہے، لیکن آنے والی کتاب بناؤ سنگھار اور نوک پلک اور لباس تو بعد میں ہوتا ہے۔ ابھی غسل والی صورتحال سے پیشتر والی صورتحال میں اس ہوتی ہوئی بیاض میں دیکھی جا سکتی ہے اور صاحبانِ ذوق سمجھ ہی سکتے ہیں کہ اگر اُن کی حسبِ معمول دعائیں شاملِ حال رہیں گی تو شاہ نشین میں یکسر انداز سے آئے گی۔ یہ تو آپ سے بے تکلفی کی بات ہے کہ میں اِس ہوتی ہوئی بیاض کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں یعنی مرغن کھانا کھانے کے کمرے میں آراستہ نہیں بلکہ باورچی خانے میں پکتی ہوئی دال کا باورچی خانے ہی میں نمک چکھایا جا رہا ہے۔

بے راہ روی کے ساتھ کافی لکھائی ہو گئی اور اس کے دوران اکثر جگہوں غلطیاں بھی ہو گئیں، کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ بے خیالی میں کوئی لفظ لکھ گیا اور کاٹ بھی نہیں سکتا تھا تو پھر اُس لفظ کو نبھانے کے لئے آگے کو ایک جملہ کا جملہ ہی بڑھا دیا۔ بہرکیف اکثر جگہوں زبان و بیان کی غلطیاں ہوئی ہوں تو یا تو اُن کی اصلاح کر دیجئے گا یا پھر فراخ دلانہ انداز سے معاف کر دیجئے گا۔

صادقین

خودنوشت

عربک کالج سے بائیں طرف ہوکر اُس سڑک کی عمارتوں کے برآمدوں میں سے گزرتا ہوا جس کو عرفِ عام میں حُسن بازار کہا جاتا تھا، راستہ چلتے ہوئے بھاگتے میں اپنے مستقبل کے بارے میں رنگین خواب دیکھتا ہوا فراش خانے آگیا۔

اُس وقت دن کے کوئی پونے بارہ بجے ہوں گے، مجھے حیرت ہوئی کہ آج بھائی جان دفتر کیوں نہیں گئے۔ انہوں نے کہا کہاں تھے، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنی دفتر سے ایک دن کی چھٹی کی درخواست دیتے ہوئے کہا کہ آل انڈیا ریڈیو میں فلاں نمبر کے کمرے میں رضوی صاحب کو دے دینا، اُن کی شناخت بھی بتائی کہ دراز قد اور اچھی شکل کے آدمی ہیں۔

یہ ستمبر ۱۹۴۴ء کی دسویں تاریخ تھی اور میں صبح سے مسلسل نئی دلی میں پیدل گھومتا ہوا فراش خانے آیا تھا، کاظمین صاحب کی چھٹی کی درخواست کو سنبھال کر آل انڈیا ریڈیو کی طرف پیدل چل پڑا۔ پھر وہی "حُسن بازار" وہی تھا مینن روڈ اور کناٹ پیلس جس کے درمیانی سیدھے راستے کو نظرانداز کر کے برآمدوں سے گزرتا ہوا آل انڈیا ریڈیو کی عمارت میں پہنچا اور رضوی صاحب کو درخواست دے دی، جو مجھ سے کمال شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے درخواست ایک پستہ قد صاحب جن کی درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی اور چشمہ لگا ہوا تھا اُن کے سامنے رکھ دی۔

کاظمین صاحب نے مجھے چلتے وقت تین آنے تو دیئے تھے لیکن میں نے اُن کے سگریٹ خرید لئے تھے جن کا برینڈ برکلے تھا، لہٰذا اب پھر مجھے آل انڈیا ریڈیو سے پیدل ہی واپس جانا تھا۔ اُس وقت کوئی ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ میں نے جیسے ہی واپسی اختیار کی اور ایک برآمدے سے گزر رہا تھا تو دیکھا کہ چند اشخاص کتاب سامنے رکھ کر خوشخطی میں نقل کر رہے ہیں، یہ زمانۂ متقدمین کے کسی شاعر کا دیوان تھا، یہ منظر دیکھتے ہی میری رگِ خوشخطی میں بھی ایک ارتعاش کی صورت پیدا ہوئی۔ اور میں نے بھی تفننِ طبع اور خوشخط لکھنے کی جبلت سے مجبور ہوکر یونہی ایک کاغذ اٹھا کر، دیوان تو مجھ سے دور تھا لہٰذا حافظے سے علامہ اقبال کی غزل "اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا" لکھنی شروع کردی۔ اس غزل کے چند شعر مجھے اس لئے یاد تھے کہ ان کو ترنم سے گنگناتے رہنا کاظمین صاحب کی خالی اوقات میں فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اور لوگ تو کرسیوں پر بیٹھ کر لکھ رہے تھے، میں کھڑے ہوکر تقریباً رکوع کی حالت میں قلم چلا رہا تھا۔ ابھی میں تیسرا شعر مکمل کر ہی رہا تھا کہ میں نے اپنی پشت پر ایک ہاتھ کا لمس محسوس کیا میں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک درمیانہ قد، بھرے ہوئے جسم کے، اور سر کے گنجے ایک صاحب تھے۔ انہوں نے کہا صاحبزادے ماشاءاللہ تمہارا خط بہت اچھا ہے، مڈل پاس معلوم ہوتے ہو؟

میں نے کہا چند ماہ پہلے ہی میٹرک پاس کیا ہے۔

کون سی ڈویژن میں؟

دوسری ڈویژن میں۔

شعر سمجھتے ہو، تمہاری اردو کیسی ہے؟

نہایت کمزور ہے، اگر اچھی ہوتی تو فرسٹ ڈویژن آئی ہوتی۔ جغرافیہ اچھا ہے اور نقشے بنانے کے ساتھ تصویر نگاری بھی کرتا ہوں۔

پھر ایک "اضطراری کیفیت" میں بین الاقوامی صورتحال سے متعلق ایک کارٹون بھی بنا دیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ حالاتِ حاضرہ کے بارے میں کچھ

پوچھ لیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ برطانیہ کا امریکہ میں کون سفیر ہے اور جب میں نے اُن سے فوراً کہا کہ لارڈ ہیلی فیکس تو وہ مجھ سے پوری طرح متاثر ہو چکے تھے اور میری متاثر کرنے والی کمزوری کی کماحقہٗ آسودگی ہو چکی تھی۔

انہوں نے کہا کہ تم کو ایک ایسے فنکار کی حیثیت سے جس کو معاوضہ ماہانہ طور پر ملے گا ریڈیو کے میوزک سیکشن میں رکھنا چاہتے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ پھر بولے کہ بس تمہیں خوشخط طریقے سے غزلیں اور مکالمے لکھنے ہوں گے، میں نے پوچھا کس کے لئے، انہوں نے بتایا کہ گانے والوں کے لئے اور ڈرامے میں حصہ لینے والوں کے لئے، میری عقل میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ پھر گویا ہوئے کہ تمہیں ہر ماہ ساٹھ روپے ملا کریں گے اور پھر میری خشش و پنج کو بھانپتے ہوئے انہوں نے گُرپ کی یہ چال بھی چل دی کہ دیکھو آج ستمبر کی دسویں تاریخ ہے اگر آج سے ہی کام کرنا شروع کردو تو پورے مہینے کا معاوضہ ملے گا۔ میں نے سوچا کہ بیس دن کے بعد اور ساٹھ روپے! یہ وہ زمانہ تھا جب ایک اٹھنّی بھی میرے لئے ایک کثیر رقم ہوتی تھی، اب میں سوچ رہا تھا کہ صرف بیس دن کے بعد ایک سو بیس اٹھنّیاں، میں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ صرف بیس دن کے لئے یہ کام کیا جائے اور ساٹھ روپے شیروانی کی جیب میں ڈال کر بمبئی کی طرف کوچ کیا جائے، دس ستمبر ۱۹۴۳ء سے وہاں کام کرنا شروع کردیا۔ اُسی دن میں نے دیکھا کہ ایک پٹّو کی شیروانی پہنے ہوئے، بہت ہی اُلجھے ہوئے اور لمبے بالوں والے ایک صاحب برآمدے میں بڑے عالمِ محویت میں کھڑے ہوتے ہیں، میں اُن کے پاس سے گزرتا ہوا اپنی نشست پر آگیا اور کسی شاعر کے حامد علی خاں صاحب کے کئے ہوئے انتخابِ کلام کے فائل کے لئے غزلوں کی خوشخط نقلیں کرنے لگا۔ اگلے دن اسی جگہ ان صاحب کو میں نے پھر موجود پایا۔ آج میں ان کو صرف ان کی پٹّو کی شیروانی کی وجہ سے پہچان سکا تھا۔ میں نے چونکتے ہوئے اُن کے پورے سراپا کا جائزہ لیا، سر بالکل تازہ تازہ اُسترے سے مُنڈا ہوا تھا، گلے میں موٹے موٹے منکوں والی مالا بھی پڑی ہوئی تھی، اُلٹے ہاتھ میں تین کتابیں بھی تھیں اور یہ ہاتھ اُن کے دل پہ رکھا ہوا تھا، پتہ نہیں پیچھے کی دو کتابیں کیا تھیں مگر آگے والی کتاب پہ انگریزی میں فرائیڈ لکھا ہوا تھا، ایک میلا علیگڑھ کٹ کا پجامہ پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں چپل تھے، پاؤں پر انگھور کے داغ اور دھبوں سے تجریدی آرٹ کا شاہکار بنا ہوا تھا، آنکھوں میں سُرخی تھی اور میں سہما ہوا ان کو دیکھ ہی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہیں کہ اتنے میں مس آہوجہ وہاں سے یہ کہتی گزریں: "تسی سناؤ جی! میراجی کی حال اے تھواڈا"

میں نے کمرے میں جاکر خواجہ خلیل حسین انصاری سے پوچھا کہ یہ کون بزرگوار ہیں برآمدے میں، انہوں نے بتایا کہ میراجی ہیں، شاعر ہیں ان کو نہیں جانتے ہو۔ میں نے کہا آج پہلی ہی مرتبہ نام سُنا ہے مگر میں نے ان کو کل بھی دیکھا تھا لیکن کل سر پہ لمبے لمبے اور اُلجھے ہوئے کھچڑی بال تھے۔

دلّی ایک دنیا تھی جس میں کیا تھا جو نہیں تھا، قدیم ترین اور جدید ترین سب ہی کچھ موجود تھا، مختلف زمانوں کے قلعے، مختلف ادوار کے مقبرے، ہر عہد کے مینار، گوناگوں صدیوں کی مساجد اندرا پرستھا سے لے کر رائے سنیا تک میری نگاہِ تجسّس کے سامنے کتابِ تاریخ کی اُلٹ پھیر کر رہی تھیں، اِن عمارات کا ایک ایک پتھر زبانِ حال سے اُن بادشاہوں کی جنہوں نے یہ عمارات تعمیر کرائی تھیں اُن کے دبدبۂ قیصری، جبروتِ شہنشاہی، طنطنۂ سلطنت اور طمطراقِ حکومت کی غمازی کر رہا تھا، بعض آثارِ قدیمہ بادشاہوں کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کے دوش بدوش اُن کی جمالیات، نزاکت و لطافت کے ساتھ اُن کے ذوقِ جمال کی بھی شہادت دے رہے تھے۔ بادشاہ رعایا پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے ایسی عمارات بنواتے تھے کہ اُن کی ہیبت اور رعب قائم رہے۔ کوٹلے کا قلعہ ہو یا انڈیا گیٹ، بنیادی مقصد رعایا پہ دھاک بٹھانا اور ہیبت طاری کرنا تھا مگر اس چکر میں محنت کشوں کو روزگار ضرور مل جاتا تھا، مزدوروں کو پتھر لادنے اور ڈھونے کا کام اور کاریگروں کو پتھروں میں کندہ کاریاں کرنے کا کمال دکھانے کا موقع ملتا تھا اور ان عمارات کی تعمیر سے سلاطین کے دارالخلافے میں رونق اور زیبائش بڑھتی چلی جاتی تھی۔

اندرپرستھا سے تغلق آباد تک اور تغلق آباد سے شاہجہاں آباد تک پھر شاہجہاں آباد سے لے کر رائے سنیا تک دلیاں بنتی رہیں، صدیاں گزرتی رہیں اور اِس سرزمین پر طرح طرح کی عالمِ حیرت میں پہنچا دینے والی عمارات کی فصلیں اُگتی رہیں، فیروز شاہ کوٹلے میں جلالِ شہنشاہی تھا تو لال قلعے میں جمالِ ظلِّ الٰہی۔

اِسی زمانے کے لگ بھگ قائدِاعظم محمد علی جناح کی دلّی میں آنے کی خبر سُنی کہ رات کے ابتدائی وقت میں وہ پرانی دلّی کے اسٹیشن پر کسی ٹرین سے تشریف لارہے ہیں، میں اُن کے استقبال کے لئے وقتِ مقررہ سے بہت پہلے ہی چلا گیا تھا، پلیٹ فارم پر دو رویہ قطاروں میں آمنے سامنے بڑے متوازی انداز سے

بکمالِ عقیدت خلقت کھڑی ہوئی تھی' ریل کی طرف کی لامتناہی قطار میں خود میں بھی شامل تھا اور میں نے بائیں طرف گردن کو آگے بڑھا کر موڑتے ہوئے دیکھا، اس انسانی گلی میں محمد علی جناح کوئی آدھے فرلانگ سے آتے ہوئے میری حدِ نگاہ میں آچکے تھے' چہرے پہ سکون آمیز مسکراہٹ تھی' سر پہ جناح کیپ گہرے نیلے رنگ کی تھیروانی جو دُور سے کالی معلوم ہو رہی تھی' چوڑی دار گھنی چنٹوں والا پے جامہ۔ اور بشلر شو پہنے ہوئے پُر نظم افراد کی دو رویہ قطاروں میں خراماں خراماں اپنے اندازِ خاص سے سب کے سلاموں کا جواب دیتے چلے جارہے تھے' میں نے آتے ہوئے اُن کا پورا سراپا دیکھا۔ میرے نزدیک سے جب وہ کوئی ایک فٹ کے فاصلے سے گزرے تو میں نے اُن کے نیم رُخ پر نظر کی۔ اور پھر یہ ایک کسی خیال میں سرشار ہو کر فراش خانے چلا گیا۔ میں نے اس کے بعد بھی محمد علی جناح کو دو بار اور دیکھا تھا۔

ریڈیو کے ماحول میں میری کوائف عالم سے متعلق آگہی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ میری شعروادب کے بارے میں افہام و تفہیم کا روز بروز اُفق وسیع اور روشن ہوتا چلا جارہا تھا' جس کی وجہ وہاں میرے کام کی نوعیت تھی جس کو میں بڑے شوق سے دل لگا کر انجام دیتا تھا۔ کام کرتے ہوئے مجھے یہ نہیں محسوس ہوتا تھا کہ میں دلیل کر رہا ہوں بلکہ کام کرنے کے دوران مجھ پر ایک کیف و انبساط و نشاط کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اکثر ادبی حضرات مجھ سے اپنی نظم یا نثر خوشخط لکھنے کے لئے کہتے اور میں رضاکارانہ طور پہ اُن کی فرمائشیں پوری کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ انصار ناصری صاحب نے جن سے ہمارے تعلقات بالکل عزیزوں جیسے ہو چکے تھے' اپنا ایک ڈرامہ نما افسانہ لکھنے کے لئے دیا جو گھر پہ ایک گلابی رنگ کے پیڈ پر میں رات کو نقل کرتا تھا۔ طویل تھا جو اس میں کافی دیر تک نقل کرنے کے دوران میں اپنی طرف سے بالتصویر بھی کرتا جارہا تھا اور جب میری موجودگی میں انہوں نے نظامی صاحب کو دکھایا تو مجھے نقل نویس رکھنے پر نظامی صاحب اُن سے داد وصول کر رہے تھے' نظامی صاحب۔ اُس دن تو مجھ سے خوش تھے لیکن ایک دن پہلے مجھ سے اِس بات پر بہت ہی ناراض تھے کہ میں اُن کے بالکل ہی نزدیک بیٹھا ہوا بر کلے کا سگریٹ پی رہا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اُس کا لمبا کش لے کر چھلّے بنا کر منہ سے دھواں نکالنے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا، انہوں نے مجھے یہ کہتے ہوئے اور اپنے گیج کا حوالہ دیتے ہوئے ڈانٹا کہ میاں ابھی سنِ بلوغت میں داخل ہو رہے ہو تمیں تمیز نہیں ہے کہ بڑوں کے سامنے اس داہیہ درازی کے ساتھ سگریٹ پی رہے ہو' میں نے سگریٹ فوراً بجھا دیا، نظامی صاحب کی اُس ڈانٹ میں جو بزرگانہ شفقت تھی دل پر نقش ہے۔

میں حامد علی خاں صاحب کی ماتحتی میں تو تھا ہی البتہ اُن کی قدر دانی اور شفقت کے سائے میں نقل نویسیاں کرتا تھا۔ دراصل صورت یہ تھی کہ وہ قدیم و جدید غرض ہر دور کے شعرا کے دبیز دیوانوں اور ضخیم کتابوں سے غزلوں کا اور پھر غزلوں کے اشعار کا انتخاب کرتے تھے' منتخب شدہ اشعار پہ پنسل سے نشان بنا دیتے تھے اور میں ہر شاعر کا انتخاب شدہ فائل اپنی خوشخطی میں تیار کر لیتا تھا' فائل کے سرورق پہ شاعر کا تخلص لکھا جاتا تھا' میں نے انہیں بتائے بغیر ایک مرتبہ یہ حرکت بھی کی کہ جب غالب کا فائل تیار ہو گیا اور میں اُس کے کور پہ غالب لکھ ہی رہا تھا کہ ایک موجِ ذہنی آئی جو یہ تھی کہ روشنائی اور قلم ہی سے فائل پر مرزا اسد اللہ خان غالب کی تصویر کی نقل بھی اتار دی۔

اردو تاریخ کے ہر دور کے اہم شاعروں کا انتخاب میں نقل کر رہا تھا، میر، سودا اور میر درد سے لے کر جدید شاعروں تک' اور شعروں کو نقل کرنے کے دوران مجھے شعر یاد بھی ہوتے چلے جارہے تھے اور دیوانوں کے اوراق پر لکھی ہوئی غزلوں کی غزلیں میرے لعری حافظے کی الماریوں میں محفوظ ہوتی چلی جارہی تھیں۔ اور تو اور اب میں خود بھی شاعری کرنے لگا تھا، بالعموم مصرعوں میں سکتہ نہیں ہوتا تھا، اردو شاعری کا تاریخی پرسپیکٹو میرے ذہن و ادراک پر سویدا ہوتا چلا جارہا تھا اور میں نے اپنا بھی اردو شاعری کی رنگین، عاشقانہ اور جمالیاتی نظموں پر مشتمل ایک انتخاب کرنا شروع کر دیا تھا اور میں پھر یہ اِس کا اپنے ہاتھ سے قلمی نسخہ بھی تیار کر رہا تھا۔ اِس میں نظیر اکبر آبادی کی کئی نظمیں شامل تھیں، پری کا سراپا بھی تھی جو میں نے اِس بند سے لکھی تھی "بیدرد ستمگر بے پروا بے چنچل، بیکل، چنچل سی" اور یہ کاظمین صاحب کو مخمور اکبر آبادی صاحب سے حاصل ہوئی تھی' بہر کیف اِس نظم سے لے کر اختر شیرانی کی نظم "بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں" تک اِس نوعیت کی جملہ شاعری انتخابی طور پر جمع کی جارہی تھی جس میں راجہ مہدی علی خاں کی بھی ایک نظم "چھوڑ دو میری کلائی مجھے گھر جانے دو" کے ساتھ ساتھ ن۔م۔ راشد کی ایک مُعرّیٰ نظم "سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ" بھی شامل تھی' غالب کی تحدید

زمینوں پر میں خود بھی طبع آزمائی کر رہا تھا۔

دس ستمبر ۱۹۴۶ء کو جب مجھ سے نظامی صاحب نے پوچھا تھا کہ تمہاری اردو کیسی ہے تو میں نے جواب دیا تھا کہ انتہائی کمزور لیکن اب مجھے حامد علی خاں صاحب کے زیرِ سایہ اور کام کی نوعیت کی باعث اردو ادب میں تیز رفتاری سے درک ہوتا جا رہا تھا۔ کتنے ہی اردو شعرا کے نام ہی نہیں بلکہ کلام بھی یاد ہوتے چلے جا رہے تھے، اور میں حامد علی خاں صاحب سے اُن کے سیدھے ہاتھ کی طرف کی الماری میں جو کتابیں رکھی ہوئی تھیں وہ بھی عارضی طور پر مانگ کر لے جاتا تھا اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات اُنہی سے مانگ کر پڑھی اور پھر "گلِ رعنا" کا بھی اسی طرح مطالعہ کر کے میں قلندر بخش جرأت سے بھی متعارف ہو گیا اور اُن کا کلام کے خاص اشعار اپنے مذکورہ بالا انتخاب میں نقل کر لیئے۔

شاعروں کے کلام کے انتخاب کے فائل تو بنتے ہی تھے، اس کے علاوہ ہر گانے والے اور گانے والی کے لیئے بھی ایک کاپی تیار کی جاتی تھی جس میں مختلف شعرا کی میں غزلیں نقل کرتا تھا اور کاپی کے کور پر گانے والوں کے نام بھی میں ہی جلی حروف میں لکھتا تھا، کسی کاپی پر فرحت جہاں بٹو لکھا تو کسی پر شیدن بائی، کسی پر رسولن بائی لکھا تو کسی پر چھبورن بائی، ہر موسیقار کے غزلیں نقل کر رہا ہوتا مگر میرے کان گانے والی کی آواز اور پڑھنے کے انداز اور اُس کے تلفظ کی طرف لگے رہتے۔ اگر اس کے تلفظ میں کہیں کوئی غلطی ہوتی تو حامد علی خاں صاحب اُسے درست کرتے۔ ایک دن اوروں کی نسبت ایک کم عمر فنکارہ آئی اور وہ حامد علی خاں صاحب کے داہنی جانب کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ جب تحت اللفظ غالبؔ کی غزل پڑھ چکی تو حامد علی خانصاحب نے اُس سے کہا کہ آپ کا تلفظ بالکل ٹھیک ہے اور آپ شعر اُسکے معنی و مفہوم کو سمجھ کر پڑھتی ہیں۔ میں نے اس طرف کچھ نقل کرتے کرتے سر اٹھایا اور اس فنکارہ کو دیکھا، مجھے اس فنکارہ کا نیم رخ نظر آیا، سانولا چہرہ تھا، وضع قطع میں سادگی تھی، وہ چلی گئی اور میری برابر والے نقل نویس ظلِ حسنین نے مجھ سے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کون تھی؟ میں نے کہا "نہیں"، وہ بولے "اقبال بانو"۔

غزلیں گانے والوں کے علاوہ موسیقیِ عالیہ کے اُستاد ان گرامی بھی ریڈیو میں آیا کرتے تھے، کسی دن شور مچا ہوا ہے کہ اُستاد فیاض خاں آرہے ہیں، یا اُستاد چاند خاں آنے والے ہیں اور ایک دو دن میں طبلے کے اُستادوں کے استاد احمد جان خاں تھرکوا رام پور سے آنے والے ہیں یا اُستاد عظیم حسان طبلے پر برق و باراں کا نقشہ پیش کرنے والے ہیں، کوئی ستار کا فن کار تو کوئی وچتر وینا پر نغمہ پیش کرنے والا ہے، مگر پکے گانے والے حامد علی خاں صاحب کے پاس یوں نہیں آتے تھے کہ تلفظ اُن کا مسئلہ نہیں تھا مگر اُن کا زبردست شہرہ سُن کر میں اُنہیں اسٹوڈیو میں جا کر دیکھ لیتا تھا، ایک دن مجھے وہاں روزانہ آنے والے موسیقار یاتو وہ امراؤ خاں تھے یا دائم حسین۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بتایا، یہ بتایا کہ اُستاد احمد جان تھرکوا اُن کے ماموں ہیں۔ ایک دن برآمدے میں ایک نستعلیق مشرقی وضع کے ایک صاحب نظر آئے تو خواجہ ظلِ حسنین انصاری نے بتایا کہ یہ بھی پکے گانے کے استاد ہیں اور اِن کا نام شاہد احمد دہلوی ہے، گانے کے استادوں سے بالکل مختلف نسل کا نام، میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو ماہنامہ ساقی کے ایڈیٹر کا نام ہے اور وہ جب کمرے میں حامد علی خانصاحب سے ملنے آئے تو اس امر کی کہ یہی ساقی کے ایڈیٹر ہیں خود بخود تصدیق بھی ہو گئی۔

گانے والیاں اور گانے والے تو حامد علی خانصاحب کے داہنے ہاتھ کی کرسی پر آکر بیٹھا ہی کرتے تھے مگر اسی کرسی پر نامی گرامی ادیب اور شاعر بھی تشریف فرما ہوتے تھے، میاں بشیر احمد سے لے کر اختر شیرانی تک اور یہ سلسلہ اِن سے گزرتا ہوا پروفیسر حمید احمد خاں سے نکلتا ہوا چراغ حسن حسرت تک پہنچ جاتا تھا، وہ چاہے شاہد احمد دہلوی ہوں یا بالکمند عرش ملسیانی غرض نامی گرامی ادیبوں کو میں نے حامد علی خاں صاحب سے بغرضِ ملاقات آتے ہوئے دیکھا، اور مجھے اس طرح اردو ادب کی تاریخ کی آگہی کے ساتھ ساتھ جدید اہلِ قلم کے درشن کرنے کے بھی مواقع ملتے رہے۔

میرے والد اور والدہ دونوں کے ہی برادرِ عم زاد جن کو میں اُن کی عدم موجودگی میں تو ماموں معقول اور موجودگی میں صرف ماموں کہتا تھا۔ مجھ سے بہت بے تکلف تھے، اُن سے ہر طرح کا ہنسی مذاق بھی ہو جاتا تھا اور وہ چرکین کی شاعری ہی نہیں بلکہ رفیع احمد خاں قسم کے شعر بھی سنا دیا کرتے تھے، ایک شام غروب کے بعد حُسن بازار کے برآمدوں میں سے گزرتے ہوئے وہ اور میں فراش خانے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک زینے کے نیچے ایک شخص نے اُنہیں روکا اور کہا کہ صاحب بہت ہی غضب کی ہے، قیامت خیز ہے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ بنگالن ہے، ہندوستانی ہے یا پنجابن؟ اُس نے بتایا کہ ہندوستانی ہے، گاتی بھی خوب ہے، طبیعت خوش ہو جائے گی، ماموں معقول نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر اُس سے پوچھا کہ عمر کے لحاظ سے اِس کی لائق ہے کہ نہیں؟ اُس نے

کہا کہ جی بالکل ہے۔ اور اس مکالمے کے بعد میں اور وہ فراش خانے کی طرف بڑھ گئے۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے تحریر کیا کہ میں بھی اُن سے ہنسی مذاق کر لیتا تھا۔ وہ جوش ملیح آبادی کو دہریہ اور ملحد کہتے تھے اور میں بہت عظیم شاعر مانتا تھا۔ ایک رات میں اور وہ نمک والوں کے پھاٹک کی حویلی کی بالائی منزل پر سوتے تھے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی گرمیوں کا زمانہ تھا اور میرے تکیے کے نیچے جوش صاحب کی کتاب "حرف و حکایت" رکھی ہوئی تھی۔ میں اُن سے کچھ ساعتیں پہلے ہی جاگ چکا تھا اور میں نے یہ کتاب تکیے پر رکھ کر دو زانو ہو کر پڑھنی شروع کر دی، انہوں نے جاگتے ہی مجھ سے پوچھا کیا پڑھ رہا ہے، میں نے کہا بڑی عقیدت کے ساتھ خضوع و خشوع کے ساتھ ایک مقدس کتاب۔ اس دوران مجھے اردو کی بے شمار غزلیں اور اَن گنت نظمیں بھی یاد ہو چکی تھیں، نظیر سے جوش تک اور میر سے مجاز تک کے اشعار حافظے کی الماریوں میں محفوظ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ قبلہ جوش صاحب سے اپنی ارادت اور عقیدت کے سلسلے میں ایک بات اور بھی تحریر کرتا چلوں کہ جب سال آٹھ میں نے ۱۹۳۹ء میں مراد آباد جا کر انٹرمیڈیٹ کا پرائیویٹ طور پر امتحان دیا تو اردو کے پرچے میں ایک یہ بھی سوال تھا کہ اپنے پسندیدہ شاعر پر مضمون لکھو۔ اس سے کچھ پہلے میں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی اردو میگزین میں کسی بہت ہی قابل طالبِ علم کا جوش کے اور اُن کی شاعری کے بارے میں ایک سیر حاصل اور طویل مضمون بھی پڑھ لیا تھا۔ صاحبِ مضمون طالبِ علم کا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے نام یوسف رضا تھا جن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو کر ریل کی پٹری پر اپنا سر رکھ کر جام خودکشی نوش کر لیا تھا، بہر نوع میں نے امتحان کی کاپی میں اس مضمون کے پڑھ لینے کا جتنا کہ امکان میں تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے جوش پر اسی پیرائے میں کوئی پوری ایک کاپی پر مشتمل مضمون بھی لکھ دیا۔ اسی زمانے میں جب ایک دن میں چھٹی کے بعد دفتر کے کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں ٹہلتے ہوئے میراجی کھڑے ہوئے تھے اور حسبِ معمول اُن کے ہاتھ میں کتابیں تھیں اور اوپر سب سے ایک نیلے رنگ کی کتاب تھی جو تازہ بہ تازہ نو بہ نو بازار میں آئی ہوگی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو اسکا نام "رامش و رنگ" تھا اور نیچے لکھا ہوا تھا۔ "جوش ملیح آبادی" اس وقت تک میں جوش صاحب کا باقاعدہ قسم کا عقیدت مند بن چکا تھا، کتاب دیکھتے ہوئے میں نے میراجی سے کہا کہ جوش سے بڑا ایشیا میں تو کوئی شاعر اس زمانے میں نہیں ہے۔ اس پر میراجی مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولے "ممکن ہے کہ کوئی چین میں ہو۔"

جوش صاحب کے ذکر سے مجھے ایک اور بات یاد آ رہی ہے۔

قدیم شعرا میں میاں نظیر اکبرآبادی اور جدید میں قبلہ جوش ملیح آبادی کے علاوہ ریڈیو کے دفتر میں اردو کے تمام بڑے شاعروں کے انتخابِ کلام کے فائل میرے ہاتھ سے تیار ہو رہے تھے نظیر کا دیوان تو پھر بھی الماری میں موجود تھا لیکن جوش کی کوئی بھی کتاب بھی انگریزی سرکار کے اُن پر عتاب کی وجہ سے وہاں نہیں تھی۔ انگریز کا اُن پر عتاب میرے لئے اُن سے ایک وجہِ عقیدت بنا ہوا تھا ہر چند کہ میں انگریز کا طرفدار بھی تھا۔

مخمور اکبرآبادی صاحب جو رسالہ کلیم کا مجلّد فائل لائے تھے اُس میں جتنی بھی جوش صاحب کی نظمیں تھیں وہ میں نے خوشخط لکھ کر اپنے پاس جمع کر لی تھیں۔ یہ کلامِ جوش کا قلمی نسخہ ابھی میں گھر پر تیار ہو رہا تھا اور پھر مخمور صاحب نے میرے اس انہماک، شیفتگی اور وارفتگی کو دیکھتے ہوئے قبلہ کی دو اور کتابیں بھی دیں۔ اُن میں سے ایک تو "جنون و حکمت" اور دوسری کا نام "فکر و نشاط" تھا۔ اوّل الذکر میں اُن کے فوٹوگراف کا عکس بھی شامل تھا جس میں اُن کے سر پر بال تھے، میں نے اُن کے تیور سے متاثر ہوتے ہوئے آنے والے اتوار کو اس تصویر کی ایک بڑے کاغذ پر نقل بھی اتاری اور دالان کی دیوار پر فریم کر کے آویزاں بھی کر دی اور مخمور صاحب جب آئے تو اُن سے اسکی داد بھی وصول کر لی، فنِ مصوری کی قسم کی طرف بھی میلانِ طبع تھا، مجھے یاد ہے کہ میں نے جب ایک فرانسیسی مصور کا نام "ڈیلاکراکس" لیا تو انہوں نے بتایا کہ فرانسیسی زبان میں یہ تلفظ نہیں ہے "دولاکرائے" ہے اور پھر متعدد فرانسیسی مصوروں کے ناموں کے تلفظ بتلائے۔

بہر کیف مخمور صاحب سے یہ دونوں کتابیں ملنے کے بعد میں نے صنفِ رباعی سے پیدائشی وابستگی کے باعث "جنون و حکمت" کی خوشخط نقل کرنی شروع کر دی اور اس کا اپنا ذاتی قلمی نسخہ تیار ہونے لگا جو ایک ہفتے کی محنتِ شبانہ کے بعد مجلّد بھی ہو گیا اور نقل کرنے کے دوران مجھے بہت سی رباعیاں یاد ہوتی بھی چلی جا رہی تھیں اور رباعی کی بحر کا اتار چڑھاؤ، اُس کے پیچ و خم کا زیر و بم مدھم انداز سے میرے قرطاسِ شعور پر شوق اور شعوری طریقے سے مزید گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا، رباعی کے پیکر کا ڈھانچہ لوحِ محسوسات پر بتدریج نمودار ہوتا رہا اور یہیں سے رباعی کہنے کے شوق کا آغاز ہوا۔ رباعی کی صنف سے میرا ذہنی، روحانی اور جمالیاتی یا جو کچھ بھی اس تعلق کو کہا جائے میرے نسخۂ وجود کا ایک عنصرِ خاص تھا۔

"جنون وحکمت" کا قلمی نسخہ تیار کرنے کے بعد "حرف وحکایت" کا بھی قلمی نسخہ تیار ہو رہا تھا اور یہ دیکھ کر مخمور صاحب مجھے نظیر اکبر آبادی سے متعلق اپنی ایک کتاب اور نظیر کا دیوان دے چکے تھے، نظیر کے نام سے میں لڑکپن کے زمانے ہی سے یوں واقف تھا کہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی جو کتابیں بچپنے میں گھر پر پڑھائی جاتی تھیں جو "اردو زبان کا قاعدہ" سے شروع ہو کر اردو زبان کی پہلی کتاب سے لے کر اردو زبان کی پانچویں کتاب تک تھیں، اُن میں "سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ" بھی شامل تھی، اب جو مخمور صاحب نے نظیر کا دیوان دیا تو اس میں سے کئی نظمیں اپنے لئے میں نے نقل کر لیں۔ بات کر رہا تھا جوشؔ صاحب کی جنون وحکمت اور حرف وحکایت کی۔ اُس دن مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور میری شیروانی کی جیب میں دس دس روپے کے آٹھ نوٹ تھے اور میں اُس نقل نویس کے ساتھ واپس آ رہا تھا جو ترکمانی دروازے کے پاس رہتا تھا، ہم دونوں پیدل چلتے رہے ایک مقام تک آکر وہ تو بائیں ہاتھ کی طرف کی گلی میں مڑ گیا اور پھر میں راستہ بھٹک گیا اور بالآخر ایک شاہراہ پر آیا جہاں ایک بالائی عمارت پر انگریزی حروف لکھے ہوئے جلی انداز میں تھے "ڈی اے ڈبلو این"۔ میں نے سوچا یہ تو ڈان اخبار کا دفتر معلوم ہوتا ہے، پھر اک راہ گیر سے پوچھا کہ اس محلّے کو کیا کہتے ہیں، اُس نے بتایا کہ دریا گنج۔ راستہ چلتے ہوئے میں کسی سے راہ پوچھنے ہی والا تھا کہ ایک موڑ پر مجھے دُور سے جامع مسجد کے آثار نظر آئے جہاں سے فراش خانے تک کا راستہ مجھے خود از بر اس لئے بھی ہو گیا تھا کہ ایک شام کاظمین صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ایک مثلث نما کھلی ہوئی جگہ میں جس کے تینوں جانب لوہے کی سلاخوں کا جنگلا تھا چاٹ اور فالودہ کھلانے کے لئے لائے تھے اور غالباً اس جگہ کو چاٹ بازار بھی کہا جاتا تھا۔ اُس روز دریا گنج سے آتے ہوئے میں اردو بازار میں تھا اور میری بائیں جانب اردو کتابوں کی دکانوں کا سلسلہ چلا جا رہا تھا اور دائیں ہاتھ کی طرف ایک پارک تھا جس میں ایک گھوڑا سوار انگریز کا فاتحانہ انداز میں مجسمہ لگا ہوا تھا، میں نے ایک کتابوں کی دکان میں جوشؔ صاحب کی کئی کتابیں دیکھیں اور اُن میں سے "سیف وسبو" خرید لی۔

ایک دن ریڈیو کے دفتر میں حامد علی خاں صاحب انگریزی کا کوئی اخبار پڑھ رہے تھے، اتفاقاً اُن کی نظر فلموں کے ایک اشتہار پر پڑ گئی جس کو دیکھ کر وہ چونکے اور انہوں نے فلم "من کی جیت" کا اشتہار مجھے دکھایا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ گانے جوشؔ ملیح آبادی کے ہیں، وہ چونکے اس لئے تھے کہ فلمی گانے لکھنا بڑے شاعر کی شان کے شایاں نہیں اور میں اُن سے پوری طرح اتفاق رکھتا تھا۔ بہر کیف میں نے جو فلم دیکھنے کا اُس عمر میں شوقین نہیں تھا جب تک یہ فلم دلّی کے چاندنی چوک میں چلتی رہی چار مرتبہ دیکھی چونکہ فلم کا موضوع جاگیرداروں کے خلاف تھا اور میں شروع ہی سے کاشتکاروں کا طرفدار تھا یوں میرے لئے اس میں ایک کشش تھی۔

دفتر کے برآمدے میں گزرتے ہوئے میراجی کا اکثر نظر آنا بھی محاورے میں شامل تھا، یہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ اُن کے ہاتھ میں دو تین کتابیں ضرور ہوا کرتی تھیں جو اُن کی شخصیت کا جزو لاینفک معلوم ہونے لگی تھیں، میں شعر وشاعری پر اُن سے گفتگو بھی کر لیتا تھا جو بیشتر "نئے ادب" کے خلاف ہوا کرتی تھی۔ نیا ادب ایک نئی اصطلاح اُس زمانے میں رائج ہو رہی تھی اور اس نئی اصطلاح کے پردے میں ن۔ م۔ راشد اور میراجی کی شاعری رقصِ جدید کر رہی تھی جس کے ٹھمکوں کے چلت پھرت اور گردشوں کے انداز ہی کچھ اور تھے، میراجی جدید ادب کے معمار کہے جاتے تھے اور نئے ادب کا مذاق اڑانا میراجی سے ملاقات میں میرا شیوہ بن چکا تھا، میں اِس شاعری کو لُولی اور لنگڑی شاعری کہا کرتا تھا کہ اس میں نہ قافیہ نہ ردیف۔ اس کے "مصرعے" چھوٹے بڑے، کوئی پانچ انچ کا مصرعہ ہے تو کوئی ایک سینٹی میٹر کا کوئی ایک، کوئی آدھا، کوئی پاؤ اور کوئی پاؤ کا بھی ایک بٹا دو۔ اور پھر ان "منظومات" کو لکھنے میں تین چوتھائی کاغذ کا زیاں مجرمانہ الگ ہوتا ہے۔ بیشتر سادہ ہی کاغذ رہتا ہے، کہیں ایک سطر میں نو لفظ ہیں کہیں تین ہیں اور کہیں ایک ہی لفظ، معنی اور اظہار کے ابہام سے قطع نظر صُوری طور سے بھی اعصاب پر گراں گزرتی ہیں کیونکہ ان نظموں کی سطریں یکسانیت سے عاری ہوتی ہیں۔

مصرعے برابر کے جا رہے ہوں، ہر ایک کے آخر میں ردیف وقافیہ ہو، مناسب حاشیہ ہو تو شاعری کی کتاب کا ورق نظر نواز ہونے کے سبب صوری طور پر ذوقِ جمال کی بھی تسکین کرتا ہے، انہوں نے میری باتوں کا بالکل بُرا نہ مانا۔ پھر میں نے نئے ادب کا مذاق اڑانے کے لئے اس قسم کا ایک مضمون بھی لکھ دیا کہ شعرا پابند نظمیں لکھنے کی صلاحیت سے نوازے ہی نہیں گئے، ان کے ذہنوں میں رسا ہونے کی توانائی ہے ہی نہیں، یہ ذہنی طور سے سہل پسند لوگ ہیں، محنت سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی تحریر پر سوختہ ہذیان ہی نہیں بلکہ کابوس معلوم ہوتی ہے، گھنونا لگتا اور مبہم۔

صادقین

سفرنامۂ صادقین

جب گزشتہ سال، موسم سرما کے آغاز میں، وزارت تعلیم کی اس تجویز پر کہ فقیر کی خطاطیوں کی ممالک عربیہ اسلامیہ میں نمائش کی جائے سنجیدگی کے ساتھ غور کرکے بالآخر اثبات میں فیصلہ کیا تو حکومت کو میں نے مشورہ دیا کہ یہ سفر اگر جون کے مہینے کی بجائے موسم گرما کے آغاز تک ملتوی کر دیا جائے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔ التوا کی اس گزارش میں موسم و تقویم کا تو اتنا نہیں بلکہ اس سفر کے عملی پہلوؤں کا دخل تھا۔ ویسے میرے پاس میری پہلے کی خطاطیاں موجود تھیں جو محض تجربات تھیں، ایک انداز کی تلاش تھیں، ایک نئے اسلوب کی جستجو تھیں۔ ایک طرزِ جدید کی دریافت کی کوششیں تھیں جن کی میری نظر میں محض ایک سفر کی حیثیت تھی۔ خطاطی میں نئے امکانات کے سمندروں میں میرا سفینۂ فکر و خیال نامعلوم افقوں اور معدوم کناروں کی طرف ڈولتا ہوا جا رہا تھا اور کار دربارِ شوق کے اس طولانی تسلسل میں مجھے میری دانست میں نئے تجربات کا کچھ حاصل بھی مل گیا تھا جس کو میں امکانات کے سمندروں میں چند ٹاپوؤں کی دریافت کہتا تھا۔ اب میری خطاطی کے تجربے ایک اختراعی نشیب و فراز اور تخلیقی پیچ و خم کے راستے سے گزرتے ہوئے ایک منزل تک پہنچ رہے تھے اور مجھے نشانِ منزل دھندلے دھندلے نہیں بلکہ صاف نظر آ رہے تھے۔ علاوہ ازیں اہم بات اس کاغذی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں یہ تھی کہ میرا گزشتہ کام بیشتر وزنی لوحوں پر مبنی تھا اور ہوائی سفر میں اخراجاتِ کثیر کے علاوہ طوالت بے حد کا بھی سبب تھا۔ اس کا یہی حل چاہتا تھا۔ تازہ کام ہو۔ تجربات کا نچوڑ۔ طویل و عریض بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس کا وزن اور حجم بھی کم ہو۔ اور میری پہلی خطاطیاں جو وزنی لوحوں، ہارڈ بورڈوں پر لمبے چوڑے کینوسوں پر ہیں وہ اہل وطن کے لئے یہیں رہ جائیں۔ کیونکہ وہ میری تازہ خطاطی کی نشو و نما کے مختلف مراحل و مدارج تھیں اس لئے مجھے ان سے ایک روحانی لگاؤ تھا اور جن کو میں نے، اپنے دیگر کاموں کی طرح وقفِ عوام کر دیا تھا اور جن کو میں قوم کی امانت سمجھتے ہوئے پاکستان میں ہی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

وزارت تعلیم نے میری یہ گزارش مان لی کہ میں موسم سرما کے آغاز میں مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر روانہ ہو سکتا ہوں۔ اس طرح مجھے نیا کام کرنے کے لئے خاطر خواہ وقت مل گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کس چیز پر کام کیا جائے کہ طویل و عریض بھی ہو اور وزن و حجم کے لحاظ سے قلیل و مختصر بھی ہو۔ سوال یہ تھا کہ اس حد بندی میں کام کاہے پر کیا جائے؟ سو اس مسئلے کے حل کے لئے، ایک شام عزیزی خالد محمود بٹ نے کچھ مشورہ دیا اور دوسرے ہی دن صبح کو ایک آدھا گز عکسی کپڑا جس پر پٹواری لوگ گاؤں کے کھیتوں کے نقشے بناتے ہیں وہ میرے سامنے یہ کہہ کر رکھ دیا کہ اس پر کچھ طبع آزمائی ہو جائے۔ پھر کچھ کرم فرما لوگ آ گئے اور ان سے کچھ شعر و شاعری ہونے لگی اور امتحانِ روشنائی و قلم کی نوبت نہیں آ سکی۔ عصر کے بعد منو بھائی آ گئے۔ اس زمانے میں منو بھائی کی تصویریں ہر قسم کے الٹے سیدھے گتوں اور تختوں پر وقتاً فوقتاً بنائی جا رہی تھیں۔ میں نے خالد محمود بٹ کا لایا ہوا عکسی کپڑا بھی منو بھائی کی تصویر بنا کر آزمایا اور مارکروں سے جھٹکے مار کر عکسی کپڑے کے کارگر ہونے کو دیکھا۔ خیر منو بھائی کی وہ تصویر تو اس پر کوئی ایسی خاص نہیں بن سکی لیکن عکسی کپڑے کی زمین پر خطاطیٔ نو کی کاشت کاری کرنے کے لئے عکسی کپڑے کی زرخیزیت مکمل طور سے ثابت ہو گئی۔ میں نے خالد محمود بٹ سے کہا کہ کل کہیں نہ کہیں سے اس کا ایک رول لے کر آؤ۔ چنانچہ وہ کئی نمونے مختلف رنگ اور عرض کے لائے اور میں نے ایک کا انتخاب کیا اور انہوں نے پسندیدہ رول لا کر خلوت

کد سے کسے کونے میں ایسے زاویئے پر رکھ دیا کہ نظر آ کر مجھ میں ایک اضطرابِ عمل اور کربِ تخلیق پیدا کرے ..

لاہور کے عجائب گھر میں القمۃ الاسلامیۃ کے انعقاد کے بعد مجھے ایک تہ خانے کی دریافت۔ جب میں حبیب میں ایرٹ ہوئی ڈکٹر ہسپتال سے نکل کر پھر عجائب گھر لائبریری سے ملحقہ کمرے میں بود و باش کے لئے آ گیا۔ تہ خانہ پُراسرار تھا۔ اور جن لوگوں کے ساتھ میں نے اس کو دیکھا ان کا کہنا تھا کہ صادقین! یہ اسٹوڈیو بنانے کے لئے بہترین جگہ ہے، وہاں ایک میری پسند کے مطابق قدیم نیلگوں قالین بھی بچھا ہوا تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ تہ خانے میں گیا تھا اُن کے ساتھ بیٹھ کر قالین پر کچھ فی البدیہہ رباعیاں بھی ہوتی رہیں۔ تہ خانہ واقعی بہت پُراسرار اور پُرسکون تھا، موسم بہار گزر چکا تھا اور گرمی کا موسم زور پکڑنا شروع کر رہا تھا۔ اگلے دن قدرے تردد اور تذبذب کے ساتھ میں عجائب گھر کے چیئرمین جناب بی۔ اے قریشی صاحب کے پاس گیا اور میں نے جھجکتے جھجکتے اُن سے یہ درخواست کی کہ میں تہ خانے کو اپنی ورکشاپ بنانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں مشرقِ وسطیٰ میں ہونے والی نمائشوں کے لئے تازہ کام کر سکوں۔ میں ابھی پوری وکالت اور مکمل وضاحت کے ساتھ اپنی بات بھی نہ کہہ پایا تھا کہ اُنہوں نے فوراً کہا کہ ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا کہ اُس کا دوسرا دروازہ تو بالکل ہی آپ کے کمرے کے سامنے ہے اور اُس دروازے کی چابی بھی لے لیں۔۔

اور پھر تہ خانے کے بیرونی دروازے کی چابی مجھے مل گئی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ لائبریری کے نیچے جس کمرے میں فقیر کا بوریا بستر اتھا قریب اُس کے سامنے ہی تہ خانے کا بیرونی دروازہ تھا۔ اس میں بھی کہیں کہیں گوشوں میں چھت کے ساتھ جالے لگے ہوئے تھے اور جالوں سے اپنی روحانی مساوات کھی کی قائم بھی آ رہی تھی۔ اور یہی اپنی مزاج کی کیفیت اور اُفتادِ طبع کی نوعیت کے لحاظ سے آرائشِ در و دیوار کا سامان تھے۔ میں اس زمین دوز تہ خانے کے در و دیوار، زینہ و روشن دان، گوشوں، فرش اور چھت ان سب کے حوالے میں اپنے فنی تصورات پریشاں! اپنے بے راہ روانہ اندازِ فکر اور غیر منظم طریقۂ عمل کو متوازن و مطابق اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شدید گرمی میں تہ خانے کی نعمت، ایک غیر مترقبہ شے تھی اور اس پر سونے پہ سہاگہ کا کام اس کی پُراسراریت تھی ایک دن تو میں نے اس کی پُراسراریت کو اور بڑھا دینے کے لئے در و دیوار پر بیتوں، بھوتوں اور پریوں کی خوفناک اور خوبصورت تصویر بنانے کی ٹھانی مگر یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو یوں نہ پہنچ سکا کہ مشرقِ وسطیٰ کے ہنگامی سفر کے لئے خشک طبیعی کا زادِ راہ تیار کرنا تھا۔

اُسی روز شام کو، عجائب گھر سے ملحق نیشنل کالج آف آرٹس میں، ریٹائرمنٹ کے سلسلے میں کالج کے پرنسپل جناب شاکر علی صاحب کی الوداعی تقریب تھی جس میں شرکت کے لئے یہ فقیر بھی بلایا گیا تھا۔ وہاں سے جب واپس آیا تو حسینوں کی ایک ٹولی بھی میرے ساتھ ہوئی۔ تہ خانے کا تالا کھولا گیا اور روشنی کی گئی، ابھی یہ سلسلہ ہو ہی رہا تھا کہ ایک ٹولی اور آ گئی۔ کچھ لوگ کرسیوں پر اور باقی تمام اُس طویل و عریض بوسیدہ قالین پر کچھ قصے کہانیاں ہوئیں، کچھ لطیفے رہے اور فرمائش پر کچھ ہلکی پھلکی رباعیاں ہوتی رہیں۔

اچھی اچھی صورتیں اگر اردگرد ہوں تو گرد و پیش کی یہ جمالیاتی، رنگین اور حسین صورتِ حال نگاہِ حقیقت آشنا اور قلبِ حق آگاہ میں ایک لطیف کیفیت پیدا کرتی ہے اور جمالِ ہم نشیناں کا تاثر دورانِ خون میں شامل ہو کر محسوسات کو خاکہ کشی میں ڈھال دینے کا اور تصورات کو نقش و نگار میں تبدیل کرنے کا میرے وجود میں خود بخود ہی ایک شدید جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ کاغذ تو پڑے ہی ہوئے تھے۔ میں نے کچھ خیالی رُخ، کچھ نیم رُخ اور کچھ ان دونوں کے درمیان کی صورتِ حال لکیروں کی صورت میں بنانی شروع کی۔ اتنے میں ایک آواز ابھری "صادقین صاحب! میری تصویر بنا دیں"! پھر کسی اور نے یہی بات کہی۔ پھر میں نے جس کی بھی شکل دیکھی تو آنکھوں میں ایک ذرا جھپک کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر ایک کا اصرار تھا کہ "میری تصویر بنا دیں"! میں سب لوگوں کا دل رکھنے کا دل سے قائل ہوں، ہر ایک کے جذبے کا احترام کرتا ہوں، حسن پرست کی حیثیت سے کسی کی بھی دل شکنی کرنا اپنی جمال پرست شریعت میں شامل نہیں ہے۔ اس کے پیشِ نظر میں نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ تم لوگ برابر کی چٹوں پر اپنے اپنے نام لکھ لو اور اس طرح قرعہ اندازی کر کے جس کا بھی نام نکل آئے گا اُس کی تصویر بنا دی جائے گی۔ اس پر ایک صاحبزادی بولیں کہ نہیں لاٹری نہ ڈالیں، تقدیر کے معاملے میں، میں بڑی کچی ہوں۔

بہرکیف قرعہ اندازی کے لیے چٹوں پر لکھ لکھ کر نام مروڑ دیے گئے تو وہاں اُس کو اُٹھانے والا کوئی غیر جانبدار آدمی نہیں تھا۔ میں نے ایسی صورتِ حال کا جو اپنا پُرانا نسخہ تھا اُس کی تجویز کی اور وہ یہ تھا کہ یہ تمام کی تمام مروڑی ہوئی ناموں کی چِٹیں اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے اندر خوب اُچھال اُچھال کر پھر ان کو سیدھے ہاتھ کی مُٹھی میں بند کر کے سامنے کی طرف پھینکوں گا اور اس طرح سب سے آگے جو گرِی نکلی تھی اُس میں سے اُنہی صاحبزادی کا نام برآمد ہوا تھا جو خود کو تقدیر کے معاملے میں ہیٹا کہتی تھیں۔ معاہدے کے مطابق فوراً ہی اُن کی تصویر بنا دی گئی، داد تو ہو ہی رہی تھی حسبِ معمول اُس کی ایک سہیلی نے کہا کہ یہ اتنی خوبصورت کہاں ہے جتنی کہ آپ نے بنا دی ہے' اپنے کچھ ملنے والے اوپر لائبریری میں اپنے رہائشی کمرے میں انتظار کر رہے تھے اور راستے میں ان میں سے کچھ خوش حال لڑکیوں کی گاڑیاں بھی اِدھر اُدھر کھڑی تھیں جن میں ان سب کو ہی جانا تھا اور غالباً یہ "لوگ" اپنی گاڑیوں کے انتظار ہی میں فقیر کے پُراسرار تہ خانے کو "ویٹنگ روم" کے طور پر استعمال کر رہے تھے، پھر بھی ان میں ایک سادہ و معصوم انداز کی ایک صُراحی دار گردن والی صاحبزادی تھی جو قرعے میں نام نہ نکل سکنے کی وجہ سے مضمحل معلوم ہو رہی تھی، میں نے چلتے چلتے اُس کی دِلجوئی اور سب کے تفنّنِ طبع کی خاطر یہ رُباعی سُنائی۔

نقّاش ہوں، یہ خبر سُنا دوں اے شوخ! — قلّاش ہوں، یہ تجھ کو بتا دوں اے شوخ!

رنگوں ہی سے، مُو قلم سے۔ گردن پہ تری — میں کیوں نہ گلوبند بنا دوں اے شوخ!

اب یہ اُس نے "شکریہ" کہا اور اس طرح تہ خانے میں الوان و خطوط کے عمل کا آغاز ہوا اور پھر یہ بولی: "اچھا، صادقین صاحب! خدا حافظ، کل ہم لوگ پھر آئیں گے"، پھر میں اپنے بوریے بستر والے کمرے میں چلا گیا، کچھ مہربان لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اُن سے کچھ گفتگو ہوتی رہی۔ اور میں گفتگو کے دوران آئندہ ہونے والے کاموں کو عالمِ خیال میں دیکھتا رہا۔ کچھ سادے نیلگوں کینوس تہ خانے میں رکھے ہوئے تھے، حُسنِ اتفاق سے منّو بھائی آ گئے، اُن کے نیم رُخ پر کچھ عجیب زاویے سے روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ تہ خانے میں جا کر نیل گوں کینوس پر منّو بھائی کی ایک اور تصویر بنائی جائے، چنانچہ نیچے جا کر ایک نیلگوں کینوس پر جو تین فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا تھا قالین پر بیٹھے ہوئے منّو بھائی کے قد و قامت اور خد و خال پر طبع آزمائی ہوئی اور کوئی سترہ منٹ میں یہ تصویر بن گئی۔ اور پھر بعد میں یاد اللہ کے سلسلے جاری ہو گئے، ایک موٹے گتے کا رول پڑا ہوا تھا، اگلے دن اُس پر منّو بھائی کی لنگوٹ پہنے ہوئے، موہنجو دارو کی مشہور "رقاصہ" والے زاویے میں ایک قد آدم تصویر بنائی اور اس طرح تہ خانے کے در و دیوار، طول و عرض، زینہ و روشن دان سے کام کرنے کا ایک ذہنی رشتہ قائم کیا گیا اور بعد ازاں تخلیقی عمل کا یہ تعارف انتہائی بے تکلفی میں تبدیل ہو گیا۔

اور پھر تہ خانے میں خطاطیوں کی بسم اللہ ہو گئی جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ القمۃ الاسلامیہ کے سلسلے میں نمائشوں کی تیاری میں، دیگر حسینوں کے دوش بدوش عزیزی خالد محمود بٹ کے دوست مختار احمد صاحب نے بھی میرا ہاتھ بٹایا تھا، میں نے خالد محمود بٹ سے کہا کہ مختار صاحب کو بھی بلاؤ اور کام جاری ہو گیا۔

فقیر ربِ بےنیاز و کارساز کا شکریہ ادا کرتا رہا، موسمِ گرما اور تہ خانہ۔ تہ خانہ کیا تھا۔ دھرتی کا آغوش تھا۔ مادرِ گیتی کا بطن تھا، پُراسرار اور پُرسکون، جس میں خطاطی جدید کے خد و خال وضاحت پکڑ رہے تھے۔ تہ خانہ جو قبر کی گہرائی سے چار گنا زیادہ گہرا تھا۔ کیا سکونِ قلب اور روحانی یکسوئی کا حامل تھا، ناجائز دولت کمائے ہوئے دولت مندوں کے ایئرکنڈیشنڈ محلات جس کے سامنے ایسے ہی تھے جیسے سچے موتی کے سامنے کانچ کا ایک ٹکڑا اس تہ خانے میں حسینانِ شہر کی ٹولیاں آکر، آشوبِ زمانہ اور خطراتِ دُنیا سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی تھیں، قالین پر ایک عالمِ رنگ و بُو تھا اور اُس کے سامنے بچھے ہوئے طویل و عریض تختے پر ابجد کے جمالِ ذوالجلالی کپڑے پر ایک نقش و نگار کی صورت میں چمن کھلنا شروع ہو گیا تھا۔ قالین پر بیٹھے ہوئے حسینوں کے ابرو، تختے پر بچھے ہوئے عکسی کپڑے کے آئینے میں مدغم ہو کر نمودار ہو رہے تھے، زلفوں

کے خم و پیچ کے سامنے صفحۂ قرطاس پر حروفِ ابجد کی صورت میں لہریے کھاتے چلے جا رہے تھے، نرگسی انگلیوں میں سے نکلتی ہوئی کرنوں کے سامنے لوحوں پر چشمِ صواد نیم باز ہو رہی تھی اور جب اہلِ بینش داد دیتے تھے تو اپنے دل ہی دل میں اپنی یہ حقیقت پر مبنی رباعی یاد کر لیتا تھا۔

ابجد میں جمالِ نو کا عالم آئے	خطِ طغریٰ کے میدان میں یوں ہم آئے
زلفوں کی گھنی چھاؤں میں لکھنے کے سبب	حرفوں میں نئے پیچ نئے خم آئے

حسن پرستی کی شریعت کے عین مطابق سلسلۂ عبادت جاری تھا یعنی خد و خالِ مہ وشاں میں آیاتِ جمال کی تلاوت ہو رہی تھی۔ جس موقع پر زاہدان باربار لاحول ولا پڑھتے ہیں بعینہٖ اُسی محل پر عارفانِ باصفا صلِّ علیٰ کا وِرد کرتے ہیں۔ اور برکت کے لئے دستِ قدرت کے شاہکاروں سے روشنائیاں بھروائی جا رہی تھیں کہ یکایک ایک فلم کے سلسلے میں جو پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس والے میرے کاموں سے متعلق بنا رہے تھے اُس چکّر میں مجھے مجبوراً کراچی جانا پڑ گیا۔

میں نے چلتے وقت مختار صاحب کو بتایا کہ سورۂ رحمٰن میں جہاں جہاں "فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ" لکھا ہے۔ اُس کا اتنا حاشیہ چھوڑ کر عکس لیتے چلے جاؤ۔ سیلوفین پر سورۂ یٰسین کی ایک بھی لکیروں میں عکسی شکل موجود تھی جس کی بیرونی لکیروں کا مارکر سے عکسی کپڑے پر میں نے عکس لینا شروع کر دیا تھا اور کوئی چار درجن فٹ عکس ہو چکی تھی، دوسرے دن تیز گام کراچی جا رہی تھی۔ اسٹیشن گزر رہے تھے اور میرے تخیلات عجائب گھر کے تہ خانے میں زمین پر رکھے ہوئے تختے پر بچھے ہوئے کاغذوں پر اُبھرے ہوئے حروفِ ابجد کے تمام پیچ و خم میں گردش کر رہے تھے اور اُنگلیاں خلا میں گھوم رہی تھیں۔ فلم کی سفرِ فیات سے فراغت پاتے ہی لاہور واپس آیا اور خانۂ تقدیم سے باہر جا کر گردشِ شام و سحر سے نکل کر، تصورِ روز و شب سے آزاد ہو کر تہ خانے میں ایک فنی چلّے یا تخلیقی اعتکاف کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری ہو گیا۔ میری ۱۳۹۰ھ کی لکھی ہوئی سورۂ رحمٰن میں تمام آیات اپنی خطاطی کے انداز میں از سرِ نو لکھی گئیں معدودے چند مقامات کے فَبِأَيِّ آلَاءِ کی بیرونی لکیریں وہی رہیں جو پہلے تھیں۔ رنگوں کی صورتِ حال پہلے سے مختلف ہو گئی۔ یوں بہت زیادہ نکھرتے ہوئے رنگوں سے بنائی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ سورۂ یٰسین پر بھی مسلسل کام ہوتا رہا۔ اور جب لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ صادقین کیا کر رہے ہو تو میں اُن کو بتا دیتا تھا کہ ممالکِ اسلامیہ میں عنقریب ہونے والی نمائشوں کا ہوائی ایڈیشن تیار کر رہا ہوں؟ ہوائی ایڈیشن؟ یعنی یہ کہ جس کا طبعی وزن کم ہو اور اس کے ساتھ ہی جغرافیائی طول و عرض زیادہ ہو۔ وزن کم اس لئے کہ "ٹریول لائٹ" کے اصول پر عمل کیا جا سکے، اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے سبب کاشتوں کے دائرے سے نکل کر متوں کے خانے میں آ گیا۔ سیکڑوں فٹ کام ہوتا رہا۔ نئی سورۂ یٰسین کے حروف و الفاظ کی ساخت تو عجائب گھر کی اسلامی گیلری والی سورۂ یٰسین کا عکس تھی یعنی اجسامِ الفاظ بعینہٖ وہی تھے صرف اُن کا لباس اور بناؤ سنگھار بدل دیا گیا تھا۔ ہر روز چالیس پچاس فٹ کام ہو رہا تھا جس کا عکس لینے اور روشنائی بھرنے میں حسینوں کے علاوہ مختار صاحب اور ایک نوجوان ظفر بھٹی کا نام لکھنا ضروری ہے۔ منّو بھائی نے بھی کبھی کبھی روشنائی بھری اور ایک دن تو اُن کی بیوی اعجاز نے بھی سیاہی بھری۔ عجیب و غریب نامساعد حالات میں کام ہو رہا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح گاڑی چل رہی تھی اللہ ہی بہتر جانتا ہے یا پھر خالد محمود بٹ۔

سورۂ یٰسین کے ساتھ ہی سورۂ رحمٰن متوازی انداز سے قلمی و موقلمی و لیو قلمونی نشو و نما پا رہی تھی۔ سورۂ یٰسین رول میں تھی آیات کے جو حصے مکمل ہو رہے تھے وہ ایک طرف کو رول کر کے گھما دیئے جاتے تھے لیکن سورۂ رحمٰن الگ الگ ٹکڑوں پر تھی، جس کا جو ٹکڑا مکمل ہوتا تھا اس کو پرانی تصویروں کی پشت پر پنوں سے لگا دیا جاتا تھا۔ پھر روز میں ہی وہ تنگ و تاریک تہ خانہ ایک الوان خطوط کے سیلاب سے مطلعِ انوار بن گیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ صادقین ساکت، جامد اور خوابیدہ رنگوں کی بجائے اس مرتبہ متکلم، متحرک اور بیدار رنگ استعمال کر رہا ہے۔ میں اُن سے کہہ دیتا تھا کہ اس میں میری کوئی اُفتادِ طبیعت کے

بنیادی دخل کی بات نہیں دراصل ہوائی ایڈیشن بنانے کی مجبوریوں کی وجہ سے ایسا ساز و سامان استعمال ہو رہا ہے کہ خطاطیاں نکھرتے ہوئے رنگوں سے بن رہی ہیں۔ یعنی عکسی کپڑے پہ آبی یا روغنی رنگ نہیں چل سکتا۔ صرف رنگین مارکر ہی چل سکتے ہیں اور اس صنعت کے لوگ مارکروں میں نکھرتے ہوئے رنگ ہی ڈالتے ہیں۔ سو مارکروں کی رنگینی کی وجہ سے لامحالہ خطاطیوں کے اردگرد کی بوقلمونی صورت میں دمکتے ہوئے اور کھلتے ہوئے رنگوں میں نمبدہ اُبھر گئی ہے۔ کام مسلسل جاری رہا۔ بزرگوں کی شفقتیں، دوستوں کی بندہ نوازیاں اور حسینوں کی کرم فرمائیاں، ان سب کا ملا جلا سلسلہ غریب شہر پر مستقل جاری رہا۔ لفظوں کے خم و پیچ بنتے رہے اور اُن کے ساتھ ہی ساتھ قصے، کہانیاں، لطیفے اور رباعیاں بھی ہوتی رہیں۔ بوسیدہ قالین پر مولی کی شان سے ایک سلسلۂ رنگ و نور رواں رہا کرتا تھا۔ جمالِ ہم نشیناں کی دلِ حسن پرست پر تاثیر، آئینۂ قرطاس پر حروفِ ابجد کی نوک پلک، توازن و تناسب کا رُوپ دھار کر منعکس ہوتی تھی۔ تہ خانہ کا ہر گوشہ تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ صفائی ممکن ہی نہ تھی، ایک دن جس طویل و عریض تختے پر کاغذ دھر دھر کر بوسیدہ قالین پر وقتِ خوردہ پر بیٹھے بیٹھے میں کام کرتا تھا میں حسبِ معمول کام کر رہا تھا۔ تین چار صاحبزادیاں میرے سیدھے ہاتھ کی طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں کسی حرف کا دائرہ بنا رہا تھا کہ یکایک ایک آواز فکر مند و پریشان اُبھری۔ ”دیکھیں دیکھیں بچھو ہے۔“ میں نے دیکھا کہ میرے اور جس تختے پر کاغذ بچھا کر کام کرتا تھا اُس کے کناروں سے لگا ہوا ایک سیاہ فام بچھو اپنا ڈنک اُٹھائے ہوئے بائیں طرف سے سیدھی جانب جا رہا ہے۔ عکسی کپڑے کے رولوں کو سیدھا رکھنے کے لیے اُس کے کناروں پر کوئی وزنی چیز رکھی جاتی تھی۔ میں نے وہ اُٹھائی کہ بچھو کو کچل دیا جائے اور اسی دوران ایک صاحبزادی نے اپنا اونچی ایڑی کا سینڈل اُتار لیا۔ بچھو تختے کے کنارے سے نکل کر کھلی ہوئی جگہ میں جیسے ہی آیا انہوں نے بھرپور طریقے سے اپنے سینڈل کی ایڑی اُس پر ماری جو بیچوں بیچ لگی اور تادیر اُس پر اپنا وزن ڈالے رہیں بچھو پس گیا اور میں اُن کے سامنے اپنی عقرب افگنی کی بہادری کے اعزاز سے محروم رہ جانے پر شرمندہ سا ہو گیا اور انہوں نے بتایا کہ وہ تو بچھو سے بہت ڈرتی ہیں لیکن بس یہ کارنامہ از خود ہی ہو گیا۔ خیر۔

اب تو مجھے ہر گوشے میں تہ در تہ، برابر رکھی ہوئی تصویروں کے پیچھے خطرناک اور زہریلے حشرات الارض کی ایک فوج عالمِ احساس و خیال میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے خالد محمود سیٹھ کو صورتِ حال کی تشویشناکی سے آگاہ کیا۔ پورے تہ خانے کی زبردست صفائی ہوئی۔ گوشوں میں طرح طرح کی ادویات کی پھواریں چھوڑی گئیں۔ مجھے خود کوئی یہ خوف نہیں تھا کہ بچھو میرے کاٹ لے گا۔ ڈر یہ تھا کہ خدانخواستہ کہیں کسی اور کے نہ کاٹ لے۔ بہرحال ادویات سے تہ خانے کو پوری طرح کھنگال دیا گیا۔

کام جاری رہا۔ اور بکونِ خدائے زمین و زمان و بفضلِ خدائے مکین و مکان انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ہوتا رہا۔ کچھ اہلِ نظر آئے میں انہیں بتا رہا تھا کہ کام کا حجم اور وزن مختصر سے مختصر کرنے کے لیے میں از سرِ نو یہ کام کر رہا ہوں کیونکہ مشرقِ وسطیٰ میرے ساتھ یہ کام جائے گا۔ ہلکا ہو گا تو اس کے فریٹ پر کم خرچ ہو گا۔ حجم میں کم ہو گا تو اس کی نقل و حرکت میں مجھے بھی آسانی رہے گی۔ میں ان لوگوں کو بتا رہا تھا کہ دیکھو یہ (۲۸۰) دو سو اسی فٹ لمبی سورہ یٰسین ہے اگر کھولوں تو یہاں سے کمرشل بلڈنگ کے آخری کنارے تک پھیل جائے گی اور اگر رول کر لوں تو میری بغل میں آ جائے گی تو سترو بھائی نے فوراً کہا کہ یوں کہہ لو کہ یہ تو:

”سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے“

تو یہ تھا اپنے تازہ کام کے ہوائی ایڈیشن ہونے کا اجمال۔ اُس کے دو تین روز کے بعد کسی نے بتایا کہ آج اس عنوان سے سترو بھائی نے کالم بھی لکھا ہے۔ کالم ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اس مصرعہ کی کام کی نوعیت سے موزونیت اور مساوات کا بہتر اندازہ کیا جا سکے

کام ہوتا رہا۔ ہوتا رہا۔ ہوتا ہی رہا۔ اُنگلیاں گھومتی رہیں، گھومتی رہیں اور مسلسل گھومتی ہی رہیں۔

ایک دن برادرم (بریگیڈیئر) سید احمد صاحب کی بیگم محترمہ پروین نفاست مع اپنی بچی شفق کے زینے سے اُترتی ہوئی نظر آئیں۔

تعظیم وسلام وخیریت کے بعد میں نے انہیں کچھ نوخیز حسینوں کے تفننِ طبع کے لیے جو بطورِ خاص رباعیاں کہی جاتی ہیں دانستہ طور پر سنائیں اور وہ کہتی رہیں کہ انسانیت کے اعلیٰ مقاصد، مابعد الطبیعات کی منازل، تصوّف کے مسائل اور فکرِ عمیق کے مراحل ان موضوعات پر لکھو، یہ کیا مانگ جوئی قسم کی شاعری کر رہے ہو، اُن کی اس بات پر میں نے انہیں جان بوجھ کر یہ رباعی سنائی۔

یہ فلسفہ و لسفہ کا دفتر کیا ہے
مابعد طبیعات کا چکر کیا ہے
اِس عالمِ موجود میں آخر یارو!
زلف و لب و رخسار سے بڑھ کر کیا ہے؟

قصہ کوتاہ، جب وہ چلنے لگیں تو مجھے انہوں نے ایک حمائل عنایت کی اور یہ کہا کہ صادقین! یہ اماں (والدۂ سیّد احمد صاحب) نے تمہارے لئے تحفہ دیا ہے، میں نے شکور اور ممنون ہو کر وہ حمائل لے لی۔

میں دو پنسلوں کو ملا کر معمول سے کاغذ کے رول پر سورۂ رحمٰن کی کسی آیت کو لکھ رہا تھا۔ منّو بھائی حمائل دیکھ رہے تھے میں نے نظر جو اُٹھائی تو دیکھا کہ اُس کے آخری اوراق کھلے ہوئے ہیں اور اُن میں برابر دائروں میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ میں نے منّو بھائی کے ہاتھ سے "دیکھوں" کہہ کر حمائل لے لی۔ دیکھا تو اسمائے حُسنٰہ لکھے ہوئے تھے۔ آناً فاناً ایک سوچ دماغ میں آئی، یہ کہ اسمائے حُسنٰی کی بھی خطاطی اپنے انداز میں کی جائے اور میں نیلے کاغذ کے طویل رول پر جس کی پُشت سفید تھی اُس طرف دو پنسلیں ملا کر اسمائے حسنہ کی بیرونی لکیریں بنانے لگا اور اُسی دن کی شام میں میں نے شروع سے ترتیب کے ساتھ کوئی سولہ اسماء کی بیرونی لکیریں بنالیں۔ اگلے دن صبح ہی سے اِن کا عکس عکسی کپڑے پر مار کر سے اُتار لیا۔ ایک خانے میں نقطہ کے اندر سیاہی بھری تو اگلے میں نقطہ کے باہر۔ نقطہ کے اطراف میں نیلے اور دو میں کتھئی رنگ سے باہر باہر تجریدی انداز کے نقش و نگار بنا دیئے۔ اسماء کی یہ صورت قطار در قطار مجموعی طور پر نظر نواز معلوم ہوئی اور پھر ایک ایک دن میں بیس بیس اسماء صبح دس بجے سے لے کر لمحاتِ نیم شبی تک لکھے جانے لگے۔

خطاطی کا یہ نیا چلّہ اب چالیس دن سے آگے نکل چکا تھا اور یہ تخلیقی اعتکاف اکتالیس سے زیادہ راتوں پر محیط ہو چکا تھا۔

یہ بھی کہتا چلوں کہ میں نے اس دوران خدانخواستہ ترکِ دُنیا نہیں کیا تھا۔ کرم فرما بزرگوں سے لے کر یارانِ باصفا تک اور یارانِ باصفا سے گیسوؤں والوں اور ابرو کے کمانداروں تک جو لوگ بھی آتے تھے اُن سے سلسلۂ نیازمندی بھی جاری رہتا تھا۔ ہوتے ہوتے کام پیدا و وصول کرنے کی جو لذّت ہوتی ہے اُس کی بھی آسودگی ہوتی رہتی تھی۔ ہوتا ہوا کام کیا تھا۔ در اصل بنیادی طور پر چند خاص خاص اضافوں کے علاوہ پُرانے ہی کام کا چربہ تھا جس میں حروف و الفاظ کی صورت وہی تھی صرف خطاطیوں کا لباس اور بناؤ سنگھار تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کام کے ساتھ ساتھ جُملہ مصروفیاتِ حیات جاری تھیں۔ "پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس" والے میری یادداشتوں کو ٹیپ میں محفوظ کرنا چاہتے تھے، اُس ٹیپ میں بھی گفتنی اور ناگفتنی سب ہی چل رہی تھی۔ ٹی وی کے پروگرام بھی اسی نہ خانے میں بن رہے تھے اور کیمروں کے سامنے اداکاری بھی یہیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ نیشنل کونسل والے جو ایک رنگین فلم میرے کام پر مشتمل بنا رہے تھے اُس کے سلسلے کی بھی بیشتر کارروائی یہیں ہو رہی تھی، مختلف ممالک کے وفود سے بھی ملاقاتیں یہیں ہوتی تھیں، پرستشِ جمال کی شریعت پر بھی یہیں عمل ہو رہا تھا۔ خدائے دانا و توانا کے عنایت کردہ جوہر کو امانت سمجھ کر بروئے کار یہیں لایا جا رہا تھا۔ گوناگوں مصروفیات کے باوجود روحانی کیفیت اور جمالیاتی احساس کی بدولت امانت میں کوئی خیانت نہیں ہو رہی تھی۔ مکھڑوں اور زلفوں کی دُھوپ چھاؤں میں خطاطیوں کی فصل پک رہی تھی۔ کام کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ نیلگوں کاغذ کی سفید پُشت پر رول کے رول پنسل سے لکھے گئے جو عکسی کپڑے پر منتقل ہوتے گئے۔ سورۂ رحمٰن، سورۂ یٰسین اور اسمائے حُسنٰی، یہ تین طویل کام تھے جن پر بیک وقت کام ہو رہا تھا اور اگست کا مہینہ آ چکا تھا اور یہ تینوں کام دو دو تین تین دن کے فرق سے منزلِ تکمیل میں داخل ہو رہے تھے، ان کے علاوہ کئی درجن چھوٹے چھوٹے کام بھی ہوئے۔ نئے نئے انداز کی بسم اللہ ہیں لکھی گئیں۔ میں ایک ایک دن میں تختے کے جو آٹھ فٹ لیا تھا، اس کنارے سے اُس کنارے تک اُس کنارے سے اِس کنارے لکھتا ہوا، رنگ بھرتا ہوا پیچھے پیچھے سرکتا

چلا جاتا تھا اور کھسکتا چلا آتا تھا، اور اس انداز کی اپنی تمام نقل و حرکت کو ناپا جائے تو تقریباً ایک فرلانگ روزانہ ہو جاتی ہوگی۔ میری بائیں ہاتھ کی ہتھیلی جو زمین پر ٹکی رہتی تھی اس کے نیچے ایک چوڑا سا گٹھا پڑ گیا تھا اور سیدھے ہاتھ میں انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کے بالائی سروں پر چپٹیاں پڑ گئی تھیں۔ عجیب سماں تھا بجلی اکثر فیل ہو جایا کرتی تھی۔ زینے والے دروازے اور روشندان سے آتی ہوئی روشنی تھوڑی دیر میں اتنی ہو جاتی تھی کہ بہرحال کام رکتا نہیں تھا لیکن پنکھے بند ہو جانے کی وجہ سے گرمی شدت اختیار کر جاتی تھی۔ خیر مجھے تو کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا تھا لیکن آس پاس کے "لوگ" گرمی سے اپنے آپ کو اس زاد بیچے سے نکھار کرنے لگتے تھے کہ ہوا مجھ کو بھی لگے جس پر مجھے شرمندگی سی ہوتی تھی۔

عجائب گھر میں مختلف ممالک کے وفود، وزیر اور سفیر، صحافی، معلّم اور طالب علم وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے، ان کے سامنے فقیر کو بھی پیش کیا جاتا تھا، اسلامی ممالک کے لوگوں کو تو میں خط طاہر شعبدے اور غیر اسلامی ممالک کے افراد کو نقاشانہ کرتب دکھا دیا کرتا تھا، کبھی کبھی چھت والی تصویر کے موضوع پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ خطاطانہ شعبدے یہ تھے کہ لوگ میرے سامنے ہوتے تھے اور میں اُلٹی طرف سے خطاطی ایسے کرتا تھا کہ اُن کو سیدھی نظر آئے۔ ایسے ہی طرزِ معکوس میں نقاشی بھی ہوا کرتی تھی۔ اور میرا یہ لوگوں کے تفننِ طبع کے لئے پرانا نسخہ تھا۔ جو ہر موقع پر بڑا کارگر ہوتا تھا۔ ایک دن کوئی ایسی ہی مصروفیت تھی اور ایران کے وزیرِ ثقافت اور دیگر افراد کو میں موقع پر اسی نوعیت کی خطاطیاں کر کے دکھا رہا تھا۔ جب ان سے فارغ ہو کر تہ خانے کی جانب کام کرنے کے لئے جا رہا تھا تو چپراسی نے بتایا کہ ایک بیگم صاحبہ آئی تھیں اور میز پر ایک پرچہ رکھ گئی ہیں۔ میں اپنے بورڈ بیسٹ والے کمرے میں گیا تو چار سطروں کا ایک رقعہ ملا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں آئی تھی اور آپ نہیں تھے اور نیچے مسز اقبال لکھا ہوا تھا۔ میں نہیں پہچانا یہ کون مسز اقبال ہیں؟ پتہ نہیں کون ہیں۔ ہوں گی کوئی۔ میں تہ خانے میں تھا کام پورا کرنے کے لئے جا ہی رہا تھا کہ ایک ملازم نما آدمی ایک کٹوردان لے کر داخل ہوا اور اُس نے ایک رقعہ بھی دیا جو محترمہ بیگم تصدق حسین کا تھا جس میں انہوں نے فقیر کو بہت سی دعائیں لکھی تھیں۔

اگلے دن چند کم گویاں آس پاس تھے، میں حسبِ معمول کام کر رہا تھا، زینے سے اُترتے ہوئے قدموں کی چاپ کی آواز آئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو یاد آیا کہ ڈاکٹر الف ایوب مرزا صاحب نے غالباً انہیں سے ملاقات کرائی تھی۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کل میں جو پرچہ چھوڑ گئی تھی وہ آپ کو ملا یا نہیں؟ پھر مجھے یقین ہوا کہ یہ وہی مسز اقبال ہیں جن کا رقعہ کل میز پر رکھا تھا۔ کام میں انتہائی درجے محویت کے باوجود اگر اجنبی لوگ ملنے آتے ہیں تو اخلاقاً کام چھوڑ کر اُن سے رسمی گفتگو ضرور کی جاتی ہے۔ کم گویوں میں سے ایک کا دو تین روز پہلے خاکہ نیم رُخ بنانے کی فرمائش پوری کی جا چکی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر یہ رُباعی پڑھی:۔

> ٹھکڑے کی تو تنویر سے باتیں کی تھیں
> اور زلف کی زنجیر سے باتیں کی تھیں
> "کل اک تری تصویر بنا کر میں نے"

میں نے ابھی تیسرا مصرعہ پڑھا ہی تھا کہ مسز اقبال نے فوراً کہا "تری تصویر سے باتیں کی تھیں" رباعی کے پس منظر میں قافیوں کے حساب سے تیسرا مصرعہ سن کر اُن کے اس ردِّ عمل سے میں متاثر ہوا اور پھر میں نے چوتھا مصرعہ "پھر کچھ" بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر اور جس کی تصویر بنائی تھی پھر اُس کی طرف دیکھ کر "تری تصویر سے باتیں کی تھیں" پڑھا۔ پھر باقی ماندہ کم گویوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب یہ بات تو طے ہے کہ میں ممالکِ مشرقِ وسطیٰ کی طرف نکل رہا ہوں۔ اپنی وہ تمام تصویریں جو لاہور میں چھوڑ کر جا رہا تھا (اور آج بھی لاہور عجائب گھر کی امانت میں ہیں) اُن کی ایک نمائش تازہ ترین خطاطیوں کی نمائش کے پیش خیمے کے طور پر کر دی جائے۔ ان میں سے اکثر تصویریں غالب کے اشعار پر مشتمل تھیں۔ اوائل اگست ۱۹۷۰ء کا زمانہ ہوگا عجائب گھر کے ہال میں یہ تصویریں آویزاں کر دی گئیں۔ پورا ہال تصویروں سے بھر کر ایک مجموعی اکائی کی حیثیت سے ایک

تاثر چھوڑ رہا تھا۔ چند نظر نواز تصویروں کے علاوہ ایک صلیب و مقتل و دار کی مجموعی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اسی میں میرا ۱۹۶۸ء کے آخر اور ۱۹۶۹ء کے شروع کا کوئی ۵۰ تصویروں پر مشتمل کام تھا جس کے نیچے میں نے اپنی رباعیات جن کے اطراف میں خاکہ کشی ہوئی تھی اُن کے تمام کے تمام ملا ملا کر قلمی خاکے اور خطاطیاں بھی لگا دی تھیں اور یہ چونکہ مختلف فنون کا مرکب قسم کی نمائش تھی تو میں نے ایک لمبے چوڑے تختے پر اس نمائش کا یہ طولانی نام لکھ دیا تھا۔ "بہ صد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم کے انداز میں شہرِ فنون کے گلی کوچوں اور چوراہوں پر صادقین کی آوارہ گردیاں"۔ عجیب بات یہ کہ میں نے "دعوت نامے" کا اس مرتبہ سیدھا سادا انگریزی میں کارڈ بنایا تھا۔ ورنہ ہر ہنگامے کا کارڈ اُردو میں بنایا جاتا تھا جس کی ننگ دھڑنگ عبارت میں ڈھٹائی کا بھی ایک عنصر ہوا کرتا تھا۔

انفرادی تصویر کا تو ایک تاثر ہوتا ہی ہے، مگر یہ کہ تمام کی تمام تصویروں کا ایک مل کر جو مجموعی تاثر کی جو وحدت ہوتی ہے وہ جب ہی ہوتی ہے کہ نقش و نگار میں کیا ہوا اظہارِ فکر ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہو۔ یہ تھے سلسلے جنگاہِ صلیب و دار کے، بربریت سے انفرادی طور پر ٹکر لینے والے سورماؤں کے اصولِ اعلیٰ جس کی بنیادیں انسانیت پر قائم ہوتی ہیں، اُس سے متاثر ہو کر اور جبر و تشدد، سفاکی اور دیگر ظلم کی طاغوتی طاقتوں کے خلاف عملی اعلانِ جنگ کرنے والے مجاہدوں سے متاثر ہو کر تصویروں کا یہ خاندان پیدا ہوا تھا، اس نمائش میں اُن لوگوں کو خراجِ تحسین اور سلامِ عقیدت پیش کیا گیا تھا جو ظلم کے حلقۂ دار سے طلوعِ انصاف کا نظارہ کرتے ہیں، جو رازِ محبت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اور طرح طرح کی صعوبات جھیلتے ہیں۔ بربریت کی طاقتیں اُنہیں ہر طرح کی ایذائیں پہنچاتی ہیں لیکن وہ انسانیت کے اصولِ اعلیٰ پر استقامت کے ساتھ قائم رہنے کی وجہ سے ہر تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کوئی راز جس سے ظلم کی طاقتوں کو تقویت پہنچے اُس کا تحفظ کرتے ہیں۔ سرِ مقتل خنجرِ جلّاد کو بوسہ دیتے ہیں لیکن راز دے کر اصولِ اعلیٰ کی سودے بازی کر کے اپنی جان کو تکلیف سے بچانا ہرگز گوارا نہیں کرتے۔

ناجائز دولت کمانے والے افراد کے کاخ و قصور کے اندرونی در و دیوار کے طول و عرض و رنگ، پردوں، قالینوں اور میز کرسیوں سے لگا کھاتی ہوئی "پکچریں" بنانے والے اور اس طبقے کی نئی پرکھ سے دیوالیہ پن سے فائدہ اٹھا کر مغربی فن کے کم معروف اوسط سے کمتر درجے کے پینٹروں کی نقالیاں کرنے والے کچھ چھبیلا قسم کے لوگ فقیر کے شہرِ فن کے جغرافیے سے ناواقف ہو کر، اس قسم کی تصویریں جن میں، میں اپنا صلیب و دار و مقتل والا ہیر دیتا ہوں تو اُس پیراستہ محلوں کی شہ نشینوں میں بیٹھ کر یہ ریمارک دیتے ہیں کہ صادقین کا آرٹ تو "مار بڈ" ہے "گروٹیسک" "ری پلسیو" ہے تو مجھے ہنسی تک بھی نہیں آتی۔

اگست ۱۹۷۰ء کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اور تہ خانے میں خطاطیوں کے "ہوائی ایڈیشن" کا سفینہ، معیشت کے طوفانی تھپیڑوں میں سمندرِ روزگار کے گردابوں سے گزرتا ہوا، خالد محمود سیٹھ کی ملاحی میں تکمیل کے نتیجہ خیز اور بامعنی کناروں پر تقریباً آ چکا تھا اور اب بے سروسامانی کے ساتھ فریم کے لوازمات اور ماؤنٹ کے تکلفات کے بغیر قیسِ تصویر کے پردے سے نکل کر عریاں طور پر منظرِ شہود پر آیا چاہتا تھا۔ خطاطیوں کا یہ کام جو خلیج اور بحرِ احمر کے ساحلوں، دجلہ و نیل کے کناروں اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلی علاقوں میں دکھانے کے لئے شدائدِ روزگار کے نشیب و فراز اور اضطرابِ تخلیق کے پیچ و خم سے گزر کر گیا تھا، فقیر اس کام کو پہلے اپنے اربابِ وطن کو دکھا دینا اپنا روحانی اور سماجی فریضہ سمجھتا تھا اور سب سے پہلے شہرِ لاہور میں بنائی ہوئی یہ خطاطیاں اہلِ لاہور کو دکھانی ضروری تھیں۔ حسبِ ذیل مضمون کا اطلاع نامہ جس کے سرورق پر طرح طرح کی خطاطیوں کے شائع شدہ عکس چسپاں کر دیئے گئے تھے اہلِ شہر میں تبرک کے طور پر تقسیم کر دیا گیا۔

کوچۂ شہرِ خطاطی لاہور سے ممالکِ اسلامیہ کی جانب فقیرِ صادقین کا کوچ

جو صادقینی مخطوطات کی اسلامی ممالک کے دارالحکومتوں میں لوحِ نمائش کی پرانی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے بزرگانِ شہر کی عنایات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، اکرم فرمایانِ شہر کی نوازشوں پر ممنون ہو کر اور مہ وشانِ شہر کی کرم فرمائیوں پر مشکور ہوتے ہوئے

اور ساکنانِ شہر میں سے خدانخواستہ اگر اُن میں سے کسی کو کوئی شکایت ہو تو اُس کی معافی مانگتے ہوئے، انتہائی درجے کی سخت جانی کا ثبوت دے کر بالآخر شہرِ لاہور سے مشرقِ وسطیٰ کے نخلستانوں اور بحیرۂ روم کے مشرقی اور جنوبی کناروں کی طرف کوچ کر رہا ہے۔

ساکنانِ شہر کو کوچ کی اطلاع دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے اور ممالکِ اسلامیہ میں جو مخطوطات منظرِ شہود پر آئیں گے اُن کو سب سے پہلے صاحب نظرانِ شہرِ لاہور کی خدمت میں پیش کرنا اپنا سماجی اور روحانی فرض سمجھتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی یہ خطاطیاں لاہور ہی کے پانی کی تاثیر کا نتیجہ ہیں۔

یہ "سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے" قسم کا کام انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سادہ سے موقع پر آپ کو شرکت کی دعوتِ شیراز ہے۔ بتاریخ ۲۲ راگست ۴۷ء بروز جمعرات، بوقت چھ بجے شام، بمقام عجائب خانہ لاہور"

تمام خطاطیاں پینلوں سے دیواروں اور اسکرینوں پر ایک ترتیب خاص کے ساتھ لگا دی گئی تھیں۔ نمائش میں داخلے کے لئے "بابِ الفاین" بنایا گیا تھا جو غالبؔ کے اشعار کی اُن وصلیوں سے "تعمیر" کیا گیا تھا جو میں نے اواخر ۱۹۶۸ء میں بنائی تھیں۔ اس میں سے داخل ہوتے ہی بالکل سامنے "شہرِ خطاطی میں دیوارِ اسماء" بنائی گئی تھی جس پر اسمائے حسنہ ترتیب کے ساتھ قطار در قطار لگا دیئے گئے تھے، جن کی سُرخی کے نیچے نظامِ سرمایہ داری کی ہلاکت اور سفّاکی کے خلاف جہاد کرنے والے سورماؤں اور مجاہدوں کے اسمائے اعلیٰ کے نام نمائش کو منسوب کیا گیا تھا۔ دیوار کے اُس طرف خیابانِ بن مُقلہ بنایا گیا تھا اور اس میں چاروں طرف مکمل سورۂ رحمٰن ترتیب کے ساتھ لگا دی گئی تھی۔

نمائش سے اگلے دن میں ایک محترمہ کے ساتھ خود بھی نمائش میں آیا تو دیکھا کہ سورۂ رحمٰن جو چالیس وصلیوں پر مشتمل تھی، اُس میں کی ایک وصلی غائب ہے۔ مجھے کوئی خاص دُکھ تو نہیں ہوا البتہ یہ فکر ضرور ہوئی کہ یہ تو مکمل سورہ تھا اور اس کی ترتیب میں سے ایک جزو کم ہو جانے سے اُس کے "کل" کی "کلیات" قائم نہیں رہی۔ میں نے دیکھا کہ آیت بھی اُتارنے والے نے وہ اُتاری ہے جس میں دوزخ کے شعلوں کی بات کی گئی ہے، خیر کسی وقت جلدی جلدی میں وہ آیتِ گمشدہ دوبارہ بنائی گئی۔ نمائش کے دوران قدردانوں اور کرم فرماؤں کی محفل میں لطیفہ گوئی اور فی البدیہہ قسم کی رُباعی گوئی میں وقت گزرتا رہا، طرح طرح کے معاملاتِ مہر و وفا پیش آتے رہے، ایک شام کچھ یارانِ صدق و صفا کے ہمراہ ایک مقامی ہوٹل چلا گیا تھا، کچھ امریکن پروفیسروں کا ایک وفد آیا ہوا تھا۔ وہاں اس وفد کی ایک رُکن، جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے بھاری بھرکم خاتون سے ملاقات ہوئی۔ اہلِ محفل سے طرح طرح کے مسائلِ تصوف پر گفتگو ہوتی رہی اور آبِ مصفا رگ و پے میں اُترتا رہا اور میں اُس کی لطافت اور نفاست پر عاشقانہ و والہانہ پن سے داد دیتا رہا۔ اگلے دن میں نے دیکھا کہ یہی بھاری بھرکم امریکن خاتون کچھ باوقار اور پُرشکوہ پاکستانی خواتین کے ہمراہ تہ خانے کی سیڑھیوں سے اُتر رہی تھیں اور ہاتھ میں چمڑے کے تھیلے بھی تھے۔ بے ساختہ خلوص اور بے محابا فروش کے ساتھ انہوں نے ملاقات کی نمائش دیکھنے جانے سے پہلے انہوں نے تھیلوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ تمہارے لئے ہیں لیکن خالی تھیلے وہ واپس لے لیں گی، میں نے اندازہ کر لیا کہ میرے لئے ان کے اندر کیا ہو سکتا ہے۔ غالباً خاتون کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فقیر کے خمیرِ وجود میں ایک مادۂ معرفت اور روزمرہ زندگی میں ایک روحانی طہارت کا عنصر بھی موجود ہے۔ تھیلوں میں سے ہسپانیہ اور پرتگال کی نادر و نایاب مینائیں برآمد ہوئیں۔ اُس دن بھی حسبِ معمول حالات اچھے نہیں تھے۔ لیکن فقیر اللہ کی رحمت کی طرف سے مایوسی کو ایک گناہ سمجھتا ہے جب وہ چلی گئیں تو خالد محمود بٹ سے آسمانوں سے اُترے ہوئے اور اس خاتون کے وسیلے سے تہ خانے میں آئے ہوئے تحفے کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا: "ہر ایک رِندکی ہوتی ہے غیب سے امداد"

اگلے دن امریکن پروفیسروں کا پورا گروپ میری تصویریں اور خطاطیاں دیکھنے آیا اور مجھے بھی اپنے فن پر کوئی تقریر نما شے کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ تقریر تو خیر کیا لیکن جو کچھ بات چیت ہوئی اُس کے دوران مجھے اس بات کا مسلسل احساس جاری

رہا کہ میرے ازار بند کے سرے میرے کرتے کے دامن سے کچھ نیچے نظر آ رہے ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے میں ایک غیر آرام دہ صورتِ حال میں تھا۔ اہلِ وفد کے سامنے کھڑے کھڑے گفتگو ہو رہی تھی اور میں نے ازار بند نہ گھرسنے ہی میں خیریت اور عافیت پائی اور میں اپنا فنی نقطۂ نظر اُن کے سامنے واضح کرتا رہا۔ حُسنِ اتفاق کہ جیسے تہ خانے میں اُن کو تصویریں دکھا رہا تھا تو وہ تصویر جو مارٹن لیوتھر کنگ کی شہادت سے متاثر ہو کر ۱۹۶۸ء میں بنائی تھی بالکل ہی سامنے اُوپر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے تفصیلی طور پر اُس پر روشنی ڈالی۔ ان سب کو وہ بہت پسند آئی اور فرداً فرداً ہر ایک کے ساتھ اس تصویر کے پسِ منظر میں فوٹوگرافی ہوتی رہی۔ کچھ پروفیسر خطاطی میں بے حد دلچسپی لے رہے تھے بلکہ قیمتاً حاصل کرنے کی فکر میں تھے جب روز ان کا وفد امریکہ واپس جا رہا تھا الوداعی شام میں مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ میں نے وہاں بھاری بھر کم خاتون کو بلائی پر بنی ہوئی ایک تجریدی تصویر اور ایک معتبر پروفیسر کو عکسی کپڑے پر کی ہوئی خطاطی تحفے کے طور پر پیش کر دی۔ مہر و وفا سے بھرپور دلچسپ ڈرامہ رہا۔

اسی نہج کی مصروفیات جاری تھیں مگر میں یہ بھی سوچتا رہا کہ یہ نمائش صرف لاہور میں ہی کر دینے سے فرائضِ فنکارانہ سے سبکدوشی نہیں ہوتی۔ ملک کے دیگر شہروں میں بھی یہ نمائش دکھائی جائے گی اور یہ کہہ کر کہ کام مشرقِ الاوسط کے شہروں میں دکھانے کے لیے لے جا رہا ہوں تاکہ اگر کوئی صاحبِ نظر اس کو اس لائق نہ سمجھے تو مجھے اس کام کی نمائشیں نہ کرنے کا نیک مشورہ دے۔ نمائش لاہور میں جاری رہی اور فلم کے سلسلے میں مجھے اسلام آباد جانا پڑا۔ نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے ڈائریکٹر جنرل خالد سعید بٹ سے ملاقات ہوئی اور یہ طے پایا کہ ۱۰ ستمبر ۷۴ء کو اسلام آباد میں بھی نمائش ہوگی جس میں اُن ممالک کے سفیروں کو خاص طور سے مدعو کیا جائے گا جن کے ملکوں میں یہ نمائش جانے والی تھی۔ خالد محمود بٹ اور میں لاہور واپس آ گئے۔ اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں ہونے والی نمائش کا کارڈ انگریزی میں بہت سادہ مضمون کا بنایا گیا یہ سوچ کر کہ یہ کارڈ غیر ملکیوں کو بھی دیئے جائیں گے تو میں نے اس میں لفاظی کی بازیگری نہیں کی تھی، کسی گمک کی گنجائش نہ تھی، باقی کارڈوں کی ٹیپ ٹاپ وہی تھی جو لاہور کی نمائش کے کارڈ کی تھی۔

ستمبر ۷۴ء کی چھٹی تاریخ کو رات کو پونے دس بجے راولپنڈی روانہ ہونے والی گاڑی پکڑنے کے لیے عجائب گھر سے کوئی نو بجے لاہور اسٹیشن کی طرف چلے، لاہور کے اسٹیشن پر ہمیں کچھ لوگ چھوڑنے بھی آئے بلکہ اُنہی کی گاڑی میں ہم لوگ اسٹیشن پہنچے تھے۔ خالد محمد بٹ نے کچھ کھانا اور کچھ پینا بھی ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ گجرانوالہ، جہاں ان کے دادا کی قبر ہے جب آیا تو اسٹیشن پر ایک سورۂ فاتحہ جناب محمد اسماعیل مرحوم و مغفور کے لیے پڑھی گئی۔ یاد اللہ ہوتی رہی۔ راولپنڈی صبح ہم لوگ پہنچے تو جناب سید احمد صاحب کے یہاں سے گاڑی آئی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر اُن کے یہاں قیام کر کے پھر اسی گاڑی میں اسلام آباد روانگی ہو جائے گی۔ انہوں نے اور اُن کے جملہ اہل و عیال نے پھر آنے ہی نہیں دیا۔ میں نے نمائش کی مجبوریاں بتائیں تو اگلے دن یعنی ۸ ستمبر کی صبح کو کوئی دس بجے ہم لوگ "پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس" کے دفتر پہنچے اور نمائش کو آویزاں کرنے کے مسائل پر گفتگو کر کے پھر کمیونٹی سنٹر اسلام آباد کا جائزہ لیا گیا۔

سید عابد علی شاہ صاحب کا اسلام آباد سے لاہور تبادلہ ہو چکا تھا۔ زمانۂ قدیم سے دستور چلا آ رہا ہے کہ جس شہر میں وہ ہوں اُس شہر میں اگر جانا ہو تو ڈیرہ اُنہی کے گھر پر لگایا جاتا ہے۔ اس مرتبہ مع بوریئے بستر کے جناب نور الحسن جعفری اور آدا جعفری صاحبہ کے مکان پر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ کیونکہ نمائش اسلام آباد میں ہی ہونی تھی۔ ۱۰ ستمبر کی شام کو اسلام آباد کے کمیونٹی سنٹر میں خطاطی کے اس تازہ بہ تازہ نو بہ نو کام کی نمائش شروع ہو گئی۔ کرم فرماؤں اور قدر دانوں کی اچھی خاصی تعداد آئی لیکن پھر بھی میری توقعات سے کم۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دعوت نامے طرح طرح کے نمونوں کے تھے اور مخلوقِ خدا میں ایک ایک تقسیم ہونے کے بجائے تقسیم کنندگان نے خود ہی اُن کی ذخیرہ اندوزی کر لی۔ پھر بھی کچھ غیر ملکی سفیر سید جاوید احسن کے ذاتی تعلقات کی بنیاد پر آئے ہوئے تھے۔ اگلے دن خالد سعید بٹ صاحب نے فرداً فرداً خود سفارت خانوں میں ٹیلی فون کیے تو جملہ سفارت خانوں کے سفیر

وغیرہ آئے لیکن میں دوسری مصروفیات میں رہا اور غائبانہ طور پر اُن کے مبارکباد کے پیغام وصول ہوتے۔ احسن صاحب لاہور جا چکے تھے اور خالد محمود بٹ صاحب لاہور سے اسلام آباد آ گئے تھے۔ ہم نے لاہور میں شدید مصروفیات کے باعث اسلام آباد کی نمائش ۱۳ ستمبر ء، کی شام کو ختم کر دی تھی اور ۱۴ ستمبر کو میں اور خالد محمود بٹ لاہور آ گئے اور اب خطاطیوں کو ایک باقاعدہ شکل دینی تھی کیونکہ غیر ممالک میں اِن کو دکھانا تھا، اِن کی پوشش درست کرنی تھی۔ سورۂ رحمٰن کی تمام خطاطیوں کی ماؤنٹنگ شروع ہوگئی جو مختار صاحب اور خالد محمود بٹ صاحب نے خود ہی شروع کر دی تھی۔ یہ کام اس کام کے ماہر لوگ نہیں کر رہے تھے۔ ماؤنٹ ہونے سے خطاطیاں خوبصورت تو لگ ہی رہی تھیں مگر ساتھ ہی ساتھ خراب ہونے سے محفوظ ہو رہی تھیں۔ سورۂ یٰسین اور اسمائے حسنہ کے علاوہ جتنی بھی خطاطیاں تھیں انہیں ماؤنٹ کیا جا رہا تھا۔ اہلِ شہر کو معلوم تھا کہ صادقین کا کوچ ہونے والا ہے، تہ خانے میں ایک ہنگامہ جاری تھا۔ لوگوں کا آنا جانا، انواع و اقسام کی فرمائشیں طرح طرح کے مطالبے، کوئی تصویر بنوانے آ رہی تھیں تو کوئی خطاطی لینے آ رہی تھیں۔ اِدھر ٹی وی کے لوگ بھی کارروائیاں کر رہے تھے تیز روشنیاں اور کیمرے اور انہی کے بیچوں بیچ ایک دن کچھ لوگوں کو اپنا ناپ بھی دینا ہوا کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ یگی اور عنایت کرنا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ کچھ اور۔ خالد محمود بٹ خطاطیوں کو لے جانے کے لئے جست کے، ایک خاص لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں بکسے بنوا رہے تھے، حرکت و عمل کی سرگرمی اپنی انتہا پر ہو رہی تھی

ایک مدّت سے پاکستان نیشنل سنٹر کی کشور ناہید ایک شام کی فرمائش کر رہی تھیں۔ اس قسم کی شاموں میں فقیر اپنے دوستوں سے اپنی مدح سرائی کا ہرگز قائل نہیں ہے بلکہ دُو بدو۔ تلخ اور شیریں، سچی سچی اور کھری کھری بات چیت کرنے میں اعتقاد رکھتا ہے میں یہ نہ سوچتے ہوئے کہ لاہور سے مشرقِ وسطیٰ جا رہا ہوں، ویسے میں اس بات کا ڈھنڈورا تو پہلے ہی سے پیٹ رہا تھا پھر سوچا کہ اہلِ لاہور کی محبت کا شکریہ پاکستان نیشنل سنٹر میں ایک شام کے بہانے سے ادا کر دیا جائے۔ کشور ناہید صاحبہ نے ۲۱ ستمبر ء کی ایک شام کے لئے جب بات محکم ہوگئی تو اُس کے اطلاع نامے کی عبارت میں نے اردو میں بنا کر ڈاکٹر انوار الاسلام کو دی کہ اشفاق احمد صاحب کے پاس جائیں اور اس کا ٹھیٹ اور ٹکسالی پنجابی میں ترجمہ کرا لائیں۔ پھر میں نے ترجمے کی عبارت آڑے انداز سے خود کتابت کی اور پوسٹ کارڈوں پر چھپوا کر اہلِ شہر کو محظوظ کرنے کے لئے تقسیم کر دی گئی۔ عبارت ذیل میں پیش ہے:-

سوہنیو!

حالوں بے حال، گھروں بے گھر، ات خدا دے چینڑے، بہت روحیاں رتیڑ، دھپ سٹر کرڑے کائیاں! بے منزلا، بے مُراد فقیر صادقین، چِن مٹیاراں دے شہر دیوں، بھُل سارگوریاں دے نگراں دے تے ٹرن تو اک دن پہلاں تہانوں سلام کرن لئی ۲۱ ستمبر ہفتے کے دن چار وجے پاکستان نیشنل سنٹر الفلاح وچ حاضر ہوئے گا۔

ایہہ بے بنیادا سائیں لاہور دیاں خاص تے پنجاب دے وسنیکاں دا عام گھلا شکریہ ادا کرے گا۔ تے سیس نوائے گا۔ پر ضرور آیا جے کیوں جو تہاڈا وجود اس فقیر دی چومصری دا چوتھا مصرعہ بعد سے گا۔ تے تہاڈے بغیر اوہ چومصری پوری نہیں ہونی۔

ص ق ن

اس شام کے ڈرامے کے آغاز سے پہلے محترمہ کشور ناہید نے مجھ سے آہستہ سے کہا کہ دیکھیں آج حسینوں کی بات نہیں ہوگی کیونکہ یہ رمضان کا مہینہ ہے یہ جو حسینوں کی گفتگو نہ کرنے کی وجہ اُنہوں نے بتائی میری سمجھ میں نہیں آئی، فقیر جس کے یہاں حسن پرستی عبادت کا جزوِ اعظم ہے، دل ہی دل میں اور بھی اس بات پہ آمادہ ہوا کہ حسینوں ہی کی بات ہوگی اگر انہوں نے رمضان کے مہینے کا عذر نہ دیا ہوتا تو میں شاید کوئی اور گفتگو بھی کر دیتا۔ لیکن اب تو اپنا دین و ایمان خطرے میں تھا۔ اپنی شام ہوتی ہی "ون مین شو"

ہے۔اس میں نہ کوئی صدر ہوتا ہے، نہ مہمانِ خصوصی ہوتا ہے، نہ اہلِ دانش قصیدوں کی صورت میں مقالے پڑھتے ہیں۔ سامعین میں سے داد و تحسین تعریف و توصیف کرنے والوں پر دستورِ زبان بندی نافذ کر دیا جاتا ہے اور صرف خنجرِ اعتراض اور سنگِ دشنام لانے والوں کو حقِ گفتار و اعتراض دیا جاتا ہے۔ انتہائی گزارشانہ اور مودبانہ طریقے سے۔ میں نے اپنے تنگ دھڑنگ طریقے سے سب سے پہلے تو سامعینِ محفل کو یہ بات بتائی کہ اس حق پرست فقیر پر یہ قدغن لگا دی گئی ہے کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے ذکر کے بغیر کروں، میں نے سامعین کی محفل کی رائے لی کہ دراز ریشوں والے سقراط و افلاطون و ارسطو کے مابعد الطبیعاتی افکار کے تحت کی بات کروں یا زہرہ و ناہید و ثریا کے زلف و لب و رخسار کی جمالیاتی بہار کے تاثر کا تذکرہ، خیریت ہوئی کہ سامعین محفل نے آخر الذکر کے حق میں یک زبان فیصلہ دیا۔ ورنہ اول الذکر بات تو مجھے کرنی بھی نہیں آتی۔ قصہ مختصر کچھ بھرم رہ گیا۔

ایک آدھ لطیفے کے بعد شہرِ لاہور کے مزاج اور کردار پر اپنی خط طی کے پس منظر میں بات کر رہا تھا۔ قصہ کچھ یوں چل رہا تھا کہ اگست ۱۹۴۴ء کے تیسرے ہفتے میں جب مغرب کی طرف سے اتحادی فوجیں پیرس کی طرف یلغار کر رہی تھیں تو اتحادی ہائی کمان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اخلاقاً سب سے پہلے کیونکہ پیرس فرانسیسیوں کا شہرِ ناز ہے تو اس کی آزادی کے لئے سب سے پہلے فرانس کی دوسری بکتر بند ڈویژن جو جنرل لکلرک کی قیادت میں تھی وہ پیرس میں داخل ہوگی۔ اس ڈویژن کے ایک نوجوان فرانسیسی سپاہی کے ساتھ ایک نوجوان امریکن سپاہی بھی دوش بدوش آگے بڑھ رہا تھا۔ اور پیرس میں داخلے کے تصور سے اس کے دل میں ایک عجیب انداز کی گدگدی ہو رہی تھی اور وہ بار بار فرانسیسی سپاہی سے کہہ رہا تھا کہ کہتے ہیں کہ پیرس دیکھو اور مر جاؤ۔ فرانسیسی سپاہی سن کر ٹالتا رہا۔ جب امریکن نے کئی بار یہ بات دہرائی تو اس نے تنگ آ کر کہا کہ محاورہ یوں نہیں۔ یوں ہے۔ "نیپلز دیکھو اور مر جاؤ"

یہ بتانے کے بعد ایک محفلِ مہ وشاں میں کہی ہوئی یہ بات میں نے کہی کہ بھائی ہم نے تو پیرس بھی دیکھا، نیپلز بھی دیکھا۔ اپنا ان دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ بھی مرنے کو دل نہیں چاہا۔ اپنے خیال میں تو محاورے کو یوں ہونا چاہیئے۔ "لاہور دیکھو اور مر جاؤ"

پھر یہ رباعی پڑھی ؎

نیپلز کا چمن لئی ڈر جاواں گا ایہہ اکھاں گا پیرس میں جیکر جاواں گا

ایہہ سوچ کے لاہور جیو آیا میتھوں دل آکھیا کہ ایتھے ای مر جاواں گا

اس کے بعد اردو کی یہ رباعی پڑھی :۔

شہروں سے مٹے عشق پہ آیا ہوں خود اپنے کفن کو میں سیئے آیا ہوں

یہ سوچ کے اک اچھی جگہ مر جاؤں لاہور میں مرنے کے لئے آیا ہوں

میں نے اہلِ محفل سے کہا کہ سنتے ہیں کہ شہرِ لاہور شہنشاہ جہانگیر کو پسند تھا اس فقیر کو بھی پسند ہے، جہانگیر کے دربار کا ملک الشعرا طالب عاملی جب دلی سے قندھار لاہور سے گزرتا ہوا جا رہا تھا تو اس نے لاہور ہی میں ڈیرے ڈال دیئے تھے اور خوبانِ دلی کی شان میں قصیدے اور نگارانِ لاہور کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اشعار لکھ رہا تھا۔ یہ فقیر بھی جب اکتوبر ۱۹۵۰ء، میں روم، پیرس، نیویارک، پیرس اور بالآخر سارا پالو کے سفر پر جانے سے پہلے لاہور آیا تو اس نے بھی اپنا پڑاؤ یہیں ڈال دیا اور یہاں کے حسینوں کے نہ صرف خد و خال ہی کو آئینۂ قرطاس میں نقش و نگار کی صورت میں منعکس کیا بلکہ "زبانِ یارانِ من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے باوجود پنجابی میں بھی سانولے مکھڑوں پر رباعیاں کہیں ویسے یہاں ایک بات قدرے سنجیدگی کے ساتھ کہتا چلوں کہ میرا خیال یہ ہے کہ کسی علاقے کی ثقافت اور تہذیب اس علاقے کے جغرافیئے کی پیداوار ہوتی ہے اور زبان تہذیب کے جسم کا دل ہوتی ہے، کوئی وجہ ہے کہ ٹیمز کا پانی پینے والے انگریزی، سین کا پانی پینے والے فرانسیسی، ٹیگس کا پانی پینے والے ہسپانوی، نیل، دجلہ و فرات کا پانی پینے والے عربی، رہائن، وسچولا اور ایلب کا پانی پینے والے جرمن، والگا کا پانی پینے والے روسی، یانگ ٹی سی۔۔

کیانگ اور ہوانگ ہو کا پانی پینے والے چینی ، بالکل اُسی طرح راوی اور چناب کا پانی پینے والے پنجابی بولتے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ زبانی کی تاثیر کی بات ہے کہ پنجابی میں رُباعیاں ہوئیں، اگرچہ بزرگوں کی زبان قرنوں سے عربی اور صدیوں سے فارسی اور بالآخر اُردو کی صورت میں چل رہی تھی اور جاری ہے۔ پنجابی کی رُباعیاں تفننِ طبع یارانِ قریب و نگارانِ عزیز کے قطع نظر، اس دعوے کے ثبوت کے لئے بھی کہی گئی تھیں کہ زبانیں دریاؤں کے پانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور فقیر پچھلے دو سال سے مسلسل راوی کا پانی پی رہا ہے۔ اگر اس میں زبان کی کوئی غلطی ہو تو اُس کی ذمہ داری اس سلسلے میں اپنے "استادوں" پہ عائد کی جائے جن میں شیخ کرامت علی، مسعود اللہ خان صاحب اور منّو بھائی شامل ہیں۔

پانی کی اسی بات سے یہ بات نکلی کہ ہر شہر کی جغرافیائی آب و ہوا مختلف صنعتوں، حرفتوں، مختلف فنون اور مختلف حرکات کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ میں ثابت کر رہا تھا کہ ہالی ووڈ کی آب و ہوا فلم سازی کے لئے، کانپور کی آب و ہوا چمڑے کی صنعت کے لئے، کولون اور اوساکا کی آب و ہوا کیمرے بنانے کے لئے، لاس ویگاز کی آب و ہوا جوا کھیلنے کے لئے موزوں ہے۔ مختلف فنون کے پس منظر میں، میں نے کچھ ملکوں کے نام بھی لئے۔ جرمنی کا جغرافیہ ایسا تھا کہ وہاں بڑے بڑے موسیقار پیدا ہوئے، فرانس کی جغرافیائی صورتِ حال فنِ مصوری کی نشو و نما کے لئے سازگار تھی اور وہاں بڑے بڑے مصور پیدا ہوئے۔ انگلستان کا مطلع ابر آلود شعر و شاعری کے لئے موزوں تھا چنانچہ وہاں بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔

ملک ملک کی طبیعت ہوتی ہے اور شہر شہر کا مزاج ہوتا ہے، کوئی سوال ہی نہیں کہ میں نے اپنے گزشتہ ماہ و سال پیرس میں گزارے ہوتے تو میں وہاں خطاطیاں کر رہا ہوتا۔ میں وہاں یقین ممکن تھا کہ عصرِ حاضر کے فن کی انتہائی مافوق الآزادیہ عریاں تصویریں بنا رہا ہوتا کیونکہ سین کے پانی کی تاثیر عربی خطاطی کی نشو و نما کے لئے موزوں نہیں۔ خلاصہ تمام گفتگو کا یہ تھا کہ شہر لاہور کا مزاج اور کردار فنِ خطاطی کی نشو و نما کے لئے سازگار ہے، لاہور کے طویل قیام میں میری خطاطی بمراحل ایک منزل تک پہنچی، یہ راوی کے پانی کی بات ہے، راوی کا پانی حروفِ ابجد کی فصلوں کے لئے اسی طرح موزوں ہے جس طرح سین کا پانی تصویروں کی کاشت کاری کے لئے اچھا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت کے طور پر میں نے موقع پہ ایک رُباعی پڑھی:-

نقاشی کی اندور کا پانی پی کر	کی شاعری بجنور کا پانی پی کر
جب مرکزِ خطاطی میں آیا، میں نے	خطاطی کی لاہور کا پانی پی کر

میں یہ ثابت کر رہا تھا کہ لاہور خطاطی کا مرکز ہے، اُسی طرح جیسے پیرس مصوری کا اور ہالی ووڈ فلم سازی کا۔ اور میری خطاطی کے جوہر کو لاہور کی آب و ہوا نے پروان چڑھایا۔ اور جو میں نے کراچی میں اس فن میں تجربات کئے تھے اعلیٰ پیمانے پر اُن کے مظاہر لاہور میں ہی ممکن ہوئے۔ اگر، وہیں ساؤ پالو چلا گیا ہوتا تو خطاطیاں نہیں بالکل ہی نہ جانے کس انداز کی تصویریں بنا رہا ہوتا۔ میرے وجود کے اندر کی تخلیقی توانائی مختلف گرد و پیش اور مختلف آب و ہوا میں پتہ نہیں کیا رُوپ دھار رہی ہوتی۔ اور میری حُسن پرستی خدا جانے کن راہوں پہ گامزن ہو رہی ہوتی۔

اتنے میں کسی بوالہوس نے حسن پرستی کے مفہوم کو اپنے شیشے سے دیکھ کر مجھ سے کوئی سوال کر لیا۔ میں نے اچانک طور سے اُس کا جواب کچھ اس طرح دیا:

سنتے ہیں کہ اب سے کوئی ایک ہزار سال قبل شہر نیشاپور میں ایک قلندر رہا کرتا تھا جو ہر روز جھومتا جھامتا، ہر ٹے کھاتا ہوا تنگ دھڑنگ مستانہ وار شہر نیشاپور کے گلی کوچوں، چوکوں اور شاہراہوں سے گزرتا تھا۔ اور مہ وشانِ نیشاپور اُس کے گشت کے وقت اپنے مکانوں کی ڈیوڑھیوں سے باہر نکل آتے تھے۔ اور قلندر اُن میں سے جس کسی کو چوم لیتا تھا اُس کو سندِ حُسن و جمال مل جاتی تھی۔ پیکر و شانِ نیشاپور ایک خاص تمنا کی نظر سے قلندر کو دیکھتے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول قلندر اپنی گشت پہ تھا اور جھومتا جھامتا

ٹکڑوں کو چومتا چاٹتا گزرتا چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے اُسے کچھ فتنہ و فساد کی آواز آئی۔ کچھ لوگ ایک بوالہوس کو اُس کی بدتہذیبی پر لتاڑ رہے تھے اور کوئی دوشیزہ اُس کو بدتمیز اور بدتہذیب کہہ رہی تھی، لوگ بوالہوس سے کہہ رہے تھے کہ یہ کیا کرتا ہے اور بوالہوس کہہ رہا تھا کہ میں قلندر کی تقلید کر رہا ہوں۔ قلندر کا یہ کہنا تھا کہ وہ ناک کی سیدھ میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، دونوں جانب حسینانِ نیشاپور کے دل ٹوٹے گئے اور انہوں نے سوچا کہ قلندر نے چومنا تو درکنار ہماری طرف کو دیکھا تک بھی نہیں، قلندر تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا، چلتا رہا اور بوالہوس اُس کے پیچھے پیچھے، بالآخر قلندر ایک نان بائی کی دُکان پر رُک گیا جہاں گرم گرم توے پر ایک روٹی پک رہا تھا، نان بائی نے اُسے توے پر جیسے ہی   اُتارا قلندر نے کھول کر اپنے ہونٹ توے پر رکھ دیئے اور اُس کے لعابِ دہن کی چھن چھن چھن چھن کی توے سے آوازیں ابھر رہی تھیں تو شروع ہو رہا تھا اور پورے توے کو قلندر نے گیلا کر دیا تھا وہ آدھ پون گھنٹے تک مشغول رہا تو پھر لوگوں نے زبردستی اُس کے شانے اور بازو پکڑ کر اُسے اٹھایا اور وہ اٹھ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ بوالہوس پیچھے کھڑا ہوا ہے قلندر نے بغیر اُس کی طرف دیکھے ہوئے ہاتھ سے توے کی طرف اُس کو اشارہ کیا اور کہا: "قلندر کی تقلید اب کر۔"

قلندر حسن پرست تھا، وہ بوس و کنار کے ذریعے دادِ جمال دیتا تھا۔ یہ فقیر بھی مولیٰ کے کرمِ خاص سے جمال پرست ہے اور صفحۂ قرطاس پر حسینوں کے خد و خال کے نقش و نگار بنا کر اُن کو دادِ جمال دیتا ہے۔ قلندر اور فقیر کی منزل ایک ہی ہے۔ محض راستوں کا فرق ہے۔

باتوں باتوں میں کچھ معاشرتی مسائل پر بات چیت چل نکلی۔ اخلاق و تہذیب کے قصے اٹھ کھڑے ہوئے، میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری تمام کی تمام اخلاقیات کی عمارت منافقت کی بنیادوں پر قائم ہے اور باطل کی اس عمارت کے در و دیوار کی اینٹوں کے اوپر صرف حق کا لیپ پُتی ہوتی ہے اور ان ایوانوں میں بیٹھے ہوئے منافقانِ زر پرست ایمان کا لبادہ تو اوڑھے ہوئے ضرور ہوتے ہیں لیکن اس لبادے کے اندر خود ننگے ہوتے ہیں۔

اس پس منظر میں میں اپنے ہیرو کے بارے میں بات کر رہا تھا، اُس کی جملہ صفات میں سے ایک یہ صفت کہ معاشرے کے مسلمہ آداب و اخلاق پر اگر اُسے جانچا جائے گا تو اُس کو بدتمیز آدمی کہا جائے گا اور اسی معیار کے مطابق میں کہہ رہا تھا کہ میرا ہیرو بدتمیز تو ضرور ہے لیکن جھوٹا نہیں ہے۔ سچ بولتا ہے۔ اعلیٰ طبقے کے اخلاق و آداب کیا ہیں؟ مثال کے طور پر اگر لوگ خواتین کے ساتھ کہیں بھی جائیں تو "خواتین پہلے" کا آداب و اخلاق دکھایا جاتا ہے، وہ چاہے کوئی ریستوراں ہو، تصویروں کی نمائش ہو کسی عمارت کا کشادہ قالین سُرخ بچھا ہوا زینہ۔ خواتین آگے چلتی ہیں اور حضرات پیچھے اور دیکھنے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ مہذب لوگ ہیں اور اس طبقے کی خواتین ایسی جگہوں پر جانے سے پہلے خود بھی، بڑے اہتمام و التزام کے ساتھ، مختلف آئینوں کی مدد سے، اپنے وجود کی جملہ جہات کا آرائشِ رُخ و گیسو اور زیبائشِ قد و قامت کرتے وقت جائزہ لیتی ہیں۔ خود آگے چلتی ہیں اور حضرات لوگ پیچھے۔ میرا ہیرو ایسا نہیں کرتا۔ وہ خود پہلے آگے چلتا ہے اور مستورات بعد میں۔ اُس کا یہ انداز دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ آداب و اخلاق نہیں جانتا ہے۔ خواتین کے پیچھے چلنے والی صورت میں ایک تو وہ اُن کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے کہ اُن کو ہراول یا اپنی سپر بنا لیا، کوئی بہادری نہیں ہوئی دوسرے پیچھے چلنے کی صورت میں میرے ہیرو کی نگاہ آوارہ ہو جاتی ہے، وہ اُن کی گردن کے لوچ اور گدی اور شانے کے خمِ چوگاں سے جھلکتی ہوئی بازوؤں کی گولائی میں گردش کرتی ہوئی بدن کے اُتار چڑھاؤ سے گزرتی ہوئی، کولہوں کے خم سے پھسلتی ہوئی پشت کے پورے سراپا کا مجموعی اکائی کی صورت میں جائزہ لیتی ہے۔ اس لئے میرا ہیرو اُن کے پیچھے نہیں آگے چلتا ہے۔ وہ اپنے پردۂ نگاہ کی طہارت کا جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا۔ ہیرو کے آدابِ محفل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایک لطیفے کے ذریعے مزید وکالت کی گئی۔

قصہ یوں سُنا گیا کہ مارلن منرو نے خودکشی کرلی اور مرحومہ کا نامۂ اعمال خدائے بزرگ و برتر دانا و توانا کے سامنے رکھا گیا تو وہ اس کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا نامۂ اعمال سیاہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے لوگوں کے دل توڑے ہیں، بے شمار لوگوں کو گناہ کی طرف

مائل کیا، ہزاروں افراد کے اپنی چال سے ایمان توڑ دیئے۔ بہت سے نیک بندوں کو گنہگار بنا دیا۔ اپنی کرسئ عدالت سے خدا نے اس کو جہنم کی سزا سنائی اور وہ واصلِ جہنم کر دی گئی، دوزخ میں اُس کے شب و روز بہت سخت گزر رہے تھے، کوئی جیل میں معمولی قیدی ہو تو یسوع مسیح کے ذکر سے، یا ہسپتال میں کوئی بیمار ہو تو خدا کی قدرت سے شفا پا جانے کا دلاسہ دینے کے لئے قیدی بیمار کو معمولی پادری چلے جاتے ہیں۔ یہاں معاملہ دوزخ کا تھا، کسی آرچ بشپ یا پوپ کی حیثیت نہیں تھی کہ وہ دوزخی مارلن منرو کی ہمدردی یا عیادت کرنے اور دلاسہ دینے جاتے، حوصلہ بندھاتے، روحانی طور سے اُس کو بلندی کی طرف لے جاتے۔ یہ درجہ سینٹ بارتھی لومیو کو حاصل تھا۔ وہ اُس کو دلاسہ دینے کے لئے جایا کرتے تھے، وہ سینٹ سے دوزخ کی شدید کربناک تکلیف کا ذکر کرتی اور کہتی کہ سینٹ مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی صورت نکالیں۔ سینٹ خود مجبور تھے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آخری اور اٹل فیصلہ تھا۔ مارلن منرو دوزخ کے شعلوں میں جلتی رہی۔ اور وقت گزرتا رہا اور مجبور و بے بس بارتھی لومیو دیکھا کئے۔ ایک دن اُنہوں نے کہیں یسوع مسیح سے مارلن منرو کی سفارش کر دی اور کہا کہ اس کو دوزخ کی مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ مسیح نے کہا کہ خدائے مطلق کا فیصلہ ہے۔ اس معاملے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ وقت گزرتا گیا لیکن مسیح کے ذہن میں یہ بات رہی ضرور اور انہوں نے ایک دن خدائے مطلق کو اچھے موڈ میں پا کر تردد و تذبذب کے ساتھ جھجکتے جھجکتے خدائے مطلق سے مارلن منرو کی دوزخ سے نجات کی بات کر دی۔ خدا نے کچھ دیر غور کیا اور سوچنے کے بعد اس نے مسیح سے کہا کہ ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ جہنم اور جنت کو ملانے والا جو ایک پل ہے اُس پر جاتے ہوئے اس کے دل میں کوئی بُرا خیال نہیں آنا چاہیئے۔ ورنہ پل کی زمین جس قدم پر بھی بُرا خیال آئے گا وہیں پھٹ جائے گی اور وہ اس میں گر کر اور بھی زیادہ قہرناک جہنم میں جا پہنچے گی۔ مسیح نے خوش ہو کر سینٹ بارتھی لومیو کو یہ بات بتائی اور سینٹ بہت خوش خوش مارلن منرو کو خوشخبری سنانے کے لئے گئے لیکن شرط بتاتے ہوئے اُن کو ذرا تشویش بھی ہو رہی تھی۔ مارلن منرو تشکر کے جذبات سے لبریز ہو کر سینٹ کے قدموں میں گر گئی۔ سینٹ اُس کو دوزخ سے جنت پہنچانے خود گئے۔ پل پر لپک لپک کر اور ٹھمک ٹھمک کر مارلن منرو نے پیچھے سے ایک زوردار "دھڑام" کی آواز سنی اور مڑ کر دیکھا تو زمین پھٹ چکی تھی اور سینٹ غائب ہو چکے تھے۔

پھر میں نے کہا کہ جب بڑے بڑے بزرگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں تو ہم تو ہیں ہی کس گنتی میں۔ اس لئے اپنا ہیرو "خواتین پہلے" والے اخلاق و آداب کا قائل نہیں ہے۔ وہ اُن سے پہلے خود چلتا ہے اور ہمارے معاشرے کے مسلّمہ آدابِ محفل کے معیار سے بدتمیز اور بدتہذیب ہے۔

اس کے بعد میں نے پھر اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ زبانیں جغرافیئے اور دریاؤں کے پانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اردو کی رُباعیاں سنانے سے بیشتر پنجابی میں رباعیاں سنانی شروع کر دیں اور ساکنانِ شہر کی محبت اور کرم فرمائی پر اُن کے شکریوں پر اپنی اُس شام کی بات چیت ختم کر دی۔

۲۱ ستمبر گزر چکی، اپنی کراچی کی طرف روانگی ایک ایک دو دو دن کے لئے کچھ کاموں کے سمیٹنے کے لئے اور کچھ پبلک کے اصرار پر ملتوی ہوتی رہی۔ اس درمیان فرمائشیں کرنے والوں کی یورش اور رختِ سفر باندھنے کی تیاریاں جاری رہیں۔ شدید مصروفیات اور عجیب کیفیات میں وقت گزر رہا تھا۔ ایک جیل پہل تھی تو اور ایک افراتفری بھی۔ حتی المقدور میں سب کی فرمائشیں پوری کر رہا تھا۔ اپنی تمام کی تمام تصویریں اور خطاطیاں عجائب گھر میں امانت کے طور پر رکھوا دی تھیں جن کو عجائب گھر والوں نے بڑی احتیاط سے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ اس ہڑبونگ میں اُس وقت تالوں کو کھلوانا ناممکن تھا کیونکہ عجائب گھر بند ہو چکا تھا اور ایک خاتون کی اُنہی منتقل خطاطیوں میں سے کسی ایک بڑی خطاطی کی فرمائش بھی تھی۔ میں نے مجبوری بتائی تو انہوں نے کہا کہ ابھی دو، تم لاہور سے جا رہے ہو، میں نے کہا لاہور سے جا رہا ہوں ان شاء اللہ جیسے ہی آؤں گا تو آپ کو پیش کر دوں گا۔ وہ بغیر خدا حافظ کہے اُڑ کر کراچی گاڑی میں جا بیٹھیں، گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کی۔ میں نے اُن کو سلام کیا اور وہ بغیر جواب دیئے برق رفتاری سے اپنی

ایک ہی کالی شیروانی پر گزارا ہو رہا تھا وہ بھی میرے والد صاحب کی تھی جو سالہا سال سے موسمِ سرما کے آغاز سے کچھ پہلے ہی استعمال ہونی شروع ہو جاتی تھی اور آئندہ موسمِ گرما کے آغاز کے بعد تک وضع داری کے ساتھ میرا ساتھ دیتی تھی اور اب گردشِ مہ و سال کے ساتھ بوسیدگی اور خستگی کی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ کالر والا بالکل اُدھڑ گیا تھا اور جیبیں کبھی کی پھٹ چکی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ کیونکہ باہر ملکوں میں جا رہا ہوں اگر پھٹے حال میں جاؤں گا تو قومی آبرو کو گزند پہنچے گی۔ اپنی روانگی کی تاریخ سے کوئی ایک عشرہ پہلے مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے پاس دو نئی شیروانیاں بھی ہونی چاہئیں۔ میں نے اپنے ایک دوست اسحاق صاحب سے ڈیڑھ ہزار روپے لئے تاکہ اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو ممالکِ اسلامیہ میں جانے کے لئے بااخلاق، باتہذیب اور باآبرو بنایا جائے۔ ۲۴ اکتوبر کو جلد اور متعلقات کی خریداری بھی کی گئی، جہاں تک شیروانی کے اندر کی ستر پوشی کا معاملہ تھا اُس کا انتظام لاہور میں کسی کرمفرما خاتون نے پہلے ہی سے کر دیا تھا۔

۲۴ اکتوبر ۸۴ء دن کی صبح تک آثارِ سفر انتہائی غیر واضح رہے، دوپہر میں معلوم ہوا کہ شام کے جہاز سے جناب زیڈ اے شاہ اور جاوید صاحب جملہ کاغذاتِ ضروری لے کر پنڈی سے کراچی پہنچ رہے ہیں۔ برادرم خالد محمود بٹ ایک دن پہلے لاہور سے کراچی آگئے تھے اور انہوں نے بتایا کہ ۲۴ کی شام کو لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز جاوید احسن بھی آ رہے ہیں۔ تمام دن آرٹس کونسل ہی میں گزارا اور پنڈی اور لاہور سے آنے والے حضرات کے انتظار میں وہیں کچھ لوگوں کے ساتھ شعر و شاعری ہوتی رہی۔ سلطان احمد اور اُن کے کچھ دوست بھی موجود تھے، شام کو زیڈ اے شاہ صاحب اور دیگر لوگ بہت تاخیر سے ایئرپورٹ سے آرٹس کونسل پہنچے۔ جملہ کاغذات اُن کے پاس تھے۔ سامان تو بکسوں میں دن ہی میں منگوایا جا چکا تھا۔ درخطاطیوں سے بھرے ہوئے وہ بکسے آرٹس کونسل کی عمارت کے ایک ستون سے ملحق رکھے ہوئے تھے، دیگر کرمفرما دوست صورتِ حال کی تنظیم میں میری کافی مدد کر رہے تھے جن میں اخلاق احمد شاد صاحب پیش پیش تھے، میں نے سورۂ رحمٰن کی دو سو کاپیاں چمڑے کی جلد میں تیار کرالی تھیں جو مشرقِ وسطیٰ کے افرادِ خاص کو تحفے میں دینے کے لئے تھیں، ان کے علاوہ کچھ بروشر بھی تھے، ان سب کی پیکنگ ہو رہی تھی کیونکہ سامان کا حجم، ہوائی ایڈیشن ہونے کے باوجود بھی کچھ کم نہیں تھا تو جناب زیڈ اے شاہ کو اُس کی ہوائی جہاز میں گنجائش پیدا کرانے کے سلسلے میں ہوائی اڈے سے آرٹس کونسل پہنچنے میں تشویشناک حد تک تاخیر ہو گئی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ سامان کسی ویگن ہی میں ہوائی اڈے پہنچ سکتا تھا اور رات کے چار بجے اس کی نقل و حرکت ممکن نہیں تھی اور ویگن شام کے وقت بھی دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اونٹ گاڑی پہ سامان لے جایا جائے۔ بہرکیف اس اثنا میں کرتیوں پہ جلی حروف میں، اپنا نام اور پاکستان لکھ رہا تھا اور سلطان احمد اور شہریار مرزا کے دوست جاوید نے کہا کہ وہ ویگن لا سکتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ویگن لے آئے اور یہ طے پایا کہ وہ سامان کو ابھی لے کر کراچی کے ہوائی اڈے کی طرف چلے جائیں اور تاصبح ہم لوگوں کے وہاں پہنچنے تک سامان کی چوکیداری بھی کرتے رہیں۔ اس کے بعد میں آرٹس کونسل سے کچھ لوگوں کے ہمراہ اخلاق صاحب کے یہاں چلا گیا اور اُن کی بچیوں کے لئے مختلف تصویریں بناتا رہا پھر اپنے گھر گیا تو شب بیداری کا ہی سلسلہ جاری رہا۔ رات کو کوئی تین بجے بعدِ انتظارِ بسیار سید جاوید احسن بھی آگئے اور رت جگا جاری رہا۔

نورکا تڑکا ہونے سے کچھ پیشتر ۲۵ اکتوبر ۸۴ء کو اپنے والد صاحب سے کچھ کان تین پڑھوانے کے بعد اور اپنی دونوں بھابیوں سے امام ضامن بندھوا کر گھر سے ایئرپورٹ کی طرف روانگی ہوئی، وہاں جاوید سامان کی رکھوالی کرتے ہوئے ملے۔ کونسل کے جناب زیڈ اے شاہ اور جاوید صاحب بھی موجود تھے، وزنی ساز و سامان کی نقل و حرکت میں کافی دشواریاں پیش آ رہی تھیں، کونسل کے حضرات پی آئی اے کے کاؤنٹر والوں سے کافی ملکھٹ پڑھت اور دلیل و دلائل کرتے رہے، خالد محمود بٹ اور دیگر اپنے دوست خود ہی سامان اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر کرتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب اپنی ہی سرزمین پر اپنے ہی لوگوں میں اس قدر طوالت و تکرار ہو رہی ہے تو آگے کیا ہوگا۔ اسی دوران کچھ رواداری میں کرمفرمایانِ لاہور کو ایئرپورٹ پہ ہی مختصر رقعے لکھے گئے اور خالد محمود بٹ کو دے دیئے گئے۔ جو لوگ ساتھ تھے اُن سے خوب کس کس کر بغل گیر ہو کر اور پھر خدا حافظ کہہ کر احسن اور میں جہاز میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

جب جہاز بلندیوں میں داخل ہوگیا تو ایئر ہوسٹس نے پوچھا کہ "کوئی خدمت" میں نے اُن سے کہا کہ آپ سے تو نہیں ذرا اسٹیوارڈ صاحب کو یہاں بھیج دیں، وہ آئے اور میں نے اُن سے کہا کہ فضائی بلندیوں پر اگر شغل ہُوکرتے رہیں تو ہمارے اعصاب ٹھیک رہتے ہیں ایک جِن عنایت کردیں، چنانچہ جِن کے دو جُرعے پیئے اور دُبئی کے ہوائی اڈے پر ہمارا جہاز اُتر گیا۔ جہاز کے عملے کے ایک جوان نے بتایا کہ نیچے آپ کا انتظار ہورہا ہے۔ جب ہم نیچے اُترے تو پاکستانی کونسلر جناب چودھری صاحب اُن کے دیگر ساتھی لوگ اور کچھ عرب حضرات سے ملاقات ہوئی اور ایک عربی لباس میں عرب فوٹوگرافر نے کچھ فوٹو کھینچے، ہم لوگ ہوائی اڈے کے وی آئی پی روم میں بیٹھے رہے اور حکومت دبئی کے محکمۂ تعلیم و شباب کے نوجوان ڈائرکٹر جنرل سے کچھ تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلا کہ ہمارا ساز و سامان کب اُترا اور کن کاؤنٹروں سے گزرا اور کس طرح نمائش گاہ چلا گیا۔ نمائش دبئی کی میونسپل لائبریری میں ہونا طے پائی تھی، چودھری صاحب سے میں نے کہا کہ اپنی جائے قیام جانے سے پیشتر میں لائبریری کا جائزہ لینا چاہتا ہوں تاکہ نمائش آویزاں کرنے کے سلسلے میں کوئی بات سمجھ میں آنی شروع ہوجائے۔ ہم لوگ لائبریری میں گئے، کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہی الماریاں دیواروں کے ساتھ قطاروں میں رکھی ہوئی تھیں۔ خطاطیوں کا آویزاں کرنا بغیر اسکرینوں کے ایک مسئلہ تھا۔ ۲۶ راکتوبر کو نمائش تھی یعنی یہاں سے وارد ہونے کے اگلے روز۔ الماریوں کے اوپر سورۂ رحمٰن کی خطاطیاں ملا کر ترتیب کے ساتھ پہلے ہی دن رکھ دی تھیں، اگلے دن یعنی نمائش کے دن اسکرینیں آنے کی توقع تھی جو کہ شارجہ سے آنے والی تھیں لیکن بڑی تاخیر کے بعد آئیں۔ شام کو ساڑھے چار بجے نمائش ہونے والی تھی اور ساڑھے دس بج چکے تھے، جو اسکرینیں وہاں موجود تھیں وہ بہت ہی ناکافی تھیں۔ ایسے موقع پر تنگیٔ وقت سے جو بے چینی اور پریشانی ہوتی ہے وہ ہورہی تھی جب چوڑائی میں سورۂ رحمٰن کی خطاطیاں کی تھیں اُن میں سے ایک کو الماری پر جاکر دیکھا تو الماری کی چوڑائی بالکل خطاطی کی چوڑائی کے برابر تھی۔ ڈوریوں کے ذریعے اِن سورۂ رحمٰن کی برابر کی خطاطیوں کا مسئلہ حل ہوچکا تھا۔ پاکستانی اسکول کے اسکاؤٹ لڑکے بڑی مستعدی، ہنر اور پھرتی سے میری ہدایات کے مطابق انہیں ڈوری سے الماریوں پر ترتیب کے ساتھ ٹانگتے چلے جارہے تھے اور میں اُنہیں شاباش دے رہا تھا۔ دوسری طرف جاوید احسن اسکرینوں پر خطاطیاں لگانے کے لئے کچھ کارپینٹری کر رہے تھے۔ سورۂ رحمٰن کے نیچے سورۂ یٰسین کی پٹی کا سلسلہ لگا دیا گیا تھا اور نمائش کا نقشہ جما شروع ہو گیا تھا۔ پریشانی اطمینان میں جب تبدیل ہورہی تھی تو میں جاوید احسن سے کہہ رہا تھا کہ یہ بات غیب کے ہی علم میں تھی کہ اُس کے بندوں کو دبئی میں بغیر اسکرینوں کے نمائش کرنی پڑے گی لہٰذا الماریوں کی چوڑائی اور خطاطیوں کی چوڑائی کا برابر ہونا ڈھیل کی بات نہیں ہے بلکہ قضا و قدر کا کوئی نکتہ ہے۔ کوئی تین بجے تک ہال کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اُس کے بعد بیرونی حصوں میں بڑی بڑی خطاطیاں لگادی گئیں۔ سورۂ یٰسین کے رول میزیں برابر بچھا کر اُن پر پھیلا دیئے گئے۔ لائبریری کی عمارت کے باہر بڑی بڑی رنگین پینٹ کی ہوئی خطاطیاں لگادی گئیں جو پانیوں کے پار والی عمارات سے جن کا فاصلہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ ہوگا وہاں سے نظر آرہی تھیں۔

نمائش کے مورچے کو اسکاؤٹ لڑکوں کی بے حد مدد سے خوبصورتی سے جما کر میں اور احسن اپنی رہائش گاہ چلے گئے تاکہ مزدوروں والی حالت کو بدل لیا جائے۔ وقتِ مقررہ پر اقبال صاحب جو پاکستانی سفارت خانہ سے وابستہ ہیں اُن کے ساتھ نمائش گاہ پہنچے تو فوراً ہی چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ دبئی کے وزیر شباب و تعلیم جن کو نمائش کا افتتاح کرنا ہے وہ آچکے ہیں اور بس آپ کا ہی انتظار ہورہا ہے۔ خیر فوراً فیتہ کاٹا گیا۔ مقامی باشندوں کے علاوہ بیرونی ممالک کے بھی کافی خواتین و حضرات موجود تھے اور اُس کے دوش بدوش پاکستانی برادری کے لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ حکومتِ دبئی کے جملہ وزیر لوگ بھی تشریف لائے۔ قومی اسمبلی کے صدر جناب تھاری بن عبداللہ بھی موجود تھے۔ نمائش نے ایک میلے والا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ اُس دن یعنی ۲۶ راکتوبر ۷۷ء کو ابوظبی سے چھپنے والے اخبار الاتحاد میں اپنی آمد اور نمائش کی اطلاع بھی چھپ گئی تھی۔ چہل پہل ہوگئی تھی۔ اکثر و بیشتر لوگ خطاطیوں کو خریدنے کی پیش کش کر رہے تھے جس کو خوبصورتی کے ساتھ مسترد کرایا جارہا تھا۔ نمائش میں مہمانِ خصوصی

اور دیگر اکابرین مقامی و بیرونی کے ساتھ تصویر در تصویر گشت کرنے کے تکلفات کے بعد پھر میں اُن کو میزوں کے کنارے پر لے آیا جن پر سورۂ یٰسین کے سلسلے بچھے ہوئے تھے اور میں نے وہیں تیز رفتار کی رواں دواں خطاطیاں موقع پر ہی پکڑ کر دکھانی شروع کر دیں، اُلٹی طرف سے خطاطیاں کرنے کے شعبدے والا نسخہ استعمال ہوا جس طرح مداری کے چاروں طرف لوگ جمع ہو جاتے ہیں بالکل وہی نقشہ اب بھی تھا نسخہ کارگر ثابت ہوا اور میں نے سوچا کہ یہ کاری گری اگلی نمائش میں بھی دکھائی جائے گی۔ حلقہ وسیع تھا اور اس گنجان حلقے میں امریکہ اور یورپ کے خواتین و حضرات تھے تو میں نے اُن کی خاطر سے ایک دو چہروں کے اُلٹی طرف سے خاکے بنا ئے۔ ایک امریکن میاں بیوی کا جوڑا مجھ سے کچھ نہ کچھ ہر قیمت پہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مارکروں کی مدد سے ایک بڑے سے کاغذ پہ اُن کے جذب و شوق کا احترام کرتے ہوئے، کھڑے کھڑے ایک رنگین تصویر بنا کر اُن کو پیش کر دی۔ انہوں نے بہت تاکید کی کہ میں بانولولو آؤں اور اُن کا مہمان رہوں اور اپنا پتہ دیا جو میں نے حسبِ عادت و معمول کھو دیا۔

نمائش میں انبوہ کچھ کم ہو چلا تھا کہ اتنے میں جناب کمال حمزہ تشریف لائے جو دبئی کے بلدیہ کے چیئرمین ہیں، یہ فقیر کے میزبان تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ان کے فن کی فہم اور ذوق کا معیار اعلیٰ ہے، انہوں نے فرداً فرداً ہر خطاطی کو بڑے غور سے دیکھ کر جائزہ داد دی۔ میں نے اِن کو اور ان کے ساتھ دوسروں کو خطاطانہ شعبدے کر کر کے دِکھائے۔ یہ بھی میری کئی خطاطیاں حاصل کرنا چاہتے تھے مگر میں نے معذوری کا اظہار کر دیا اور ایک سورۂ رحمٰن کی جلد انہیں پیش کر دی۔

اُس دن کتنے ہی طلباء کو دستخط کر کر کے دیئے گئے، کتنی ہی بسم اللہ ہیں لکھ لکھ کر تقسیم کی گئیں۔ نمائش کا ڈرامہ کامیاب رہا۔ بے شمار محبت کرنے والے پاکستانی خواتین و حضرات سے ملاقاتیں رہیں اور اسکاؤٹ لڑکوں جنہوں نے نمائش کے ڈرامے کا اسٹیج بنانے میں بہت جذبے سے کام کیا تھا۔ اُن کو یہ کہہ کر رُخصت کیا کہ کل آپ لوگوں کو بروشر نام لکھ لکھ کر تقسیم کئے جائیں گے۔ رات کے پونے دس بج چکے تھے میں اور احسن اپنے رہائشی کمروں میں چلے گئے۔ جہاں دن میں تحفے میں آئی ہوئی نادر و نایاب شئے بھی رکھی ہوئی تھی۔ رات گئے تک یا داللہ کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ پاکستانی خواتین و حضرات بھی تھے اور صبح کاذب تک محفلِ شعر و سخن جاری رہی۔

اگلے دن یعنی ۲۷ اکتوبر ۷۰ء کو میں اور احسن نمائش گاہ تاخیر سے پہنچے۔ اچھی خاصی گہما گہمی تھی۔ چہل پہل تھی۔ میں نے جب اس سرزمین پر ایک دو روز پہلے قدم رکھا تھا تو میرا قیاس تھا کہ یہ قحط النساء کا علاقہ ہوگا مگر نمائش کے دن ہی پتہ چل گیا تھا کہ فقیر کا خیال غلط تھا۔ بہر کیف چشم و دل و نگاہ کے لئے اس خیال کا غلط ہو جانا بڑا طمانیت بخش ثابت ہوا۔ میں اسکاؤٹ نوجوانوں کو ایک ایک بروشر بسم اللہ اور اُن کے نام لکھ لکھ کر انعام اور شکریے کے طور پر دے رہا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ دستخط لے رہے تھے، اس اثناء میں کچھ مصریوں اور شامیوں سے بھی ایک فہم کی مساوات قائم ہو چلی تھی اور اُن سے "شکراً" وغیرہ قسم کے الفاظ سیکھے جا رہے تھے، فن جاننوں میں جانے کی کہ چلے جاری تھی۔ تصویریں خریدنے والوں سے معذوری کا اظہار ہو رہا تھا۔ آٹوگراف چل رہے تھے۔ مجمع میں ایک آدمی بروشر لئے ہوئے آیا۔ میں نے لکھنے کے لئے اُس کا نام پوچھا۔ نام سے پتہ چلا کہ وہ ہندو ہے، میں نے فوراً اُس بروشر پہ ہندی میں بڑا بڑا "اوم" لکھ کر نیچے اُس کا نام لکھ دیا۔

لائبریری کا عملہ اب مجھ سے اور احسن سے کافی وابستہ ہو چکا تھا۔ لائبریری کے انچارج نے بتایا کہ موسیو کمال حمزہ کا ٹیلی فون آیا تھا اور وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے، بہر کیف دن اسی طرح گزرتا رہا۔ نمائش کی خبر سُن کر ابوظہبی سے بھی کچھ لوگ آ گئے تھے جن میں عباس نقوی صاحب بھی شامل تھے۔ دوپہر میں خوب کشتی رانی ہوتی رہی۔ ہمارے ساتھ ایک شامی نوجوان احمد جہاد نامی بھی تھے۔ ملاح سے چپو لے کر احسن نے خود ہی خلیج کے پانیوں میں کشتی چلائی۔

شام ہوگئی۔ ہم لوگ پھر لائبریری آئے۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ ایک لڑکی جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اُس کا شوہر شدید اصرار کر رہا تھا کہ میں اُس کی عروسِ نو کا ایک خاکہ بنا دوں۔ ہال سے ملحقہ کمرے میں بھی لوگ تھے، وہاں بڑی بڑی میزیں بچھی ہوئی تھیں اور وہاں دیگر خواتین کے ساتھ ایک غیر ملکی خاتون بھی کھڑی ہوئی تھی جس پر تاثر چھوڑنے کے لئے اور اپنی طرف اُس کی توجہ مبذول کرنے کے لئے میں کوئی نقاشانہ شعبدہ دکھانے کے بہانے کی فکر میں تھا۔ میں نے اس پاکستانی شوہر سے یہ سوچ کر کہ نئی بیاہی لڑکی میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوگی اور شوہر کی فرمائش بھی پوری ہوجائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی خاتون کو ذہنی طور پر اپنی طرف متوجہ کرنے کی سیاست بھی کامیاب ہونے کا امکان روشن ہوجائے گا۔ اُس سے کہا کہ تمہاری بیوی کی تصویر بنائے دیتا ہوں۔ خاکہ کافی توجہ سے بنایا۔ میز کے چاروں طرف ہجوم۔ پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو ایک جھرمٹ کی چمکدار آنکھوں سے سامنا ہوا جن میں سے ایک نے سلام کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ پہلے کہاں کہاں مل چکی ہیں۔ پھر میں نے جان بوجھ کر اُن کی طرف سے غفلت برتی اور خاکہ بنانے میں اس طرح کی اداکاری کی جیسے بڑی محویت، انہماک اور بڑے جذب و شوق سے بنا رہا ہوں۔ تاکے پر دادِ تحسین کا بھی چاروں طرف سے سلسلہ جاری تھا۔

اتنے میں غیر ملکی خاتون نے نزدیک آکر لکنت آلود انگریزی میں کہا کہ کیا تم میری چھوٹی بہن کے لئے آٹوگراف دے سکتے ہو؟ سیاست کی یہ ترکیب کامیاب ہوچکی تھی۔ میں نے پوچھا کہ تمہاری چھوٹی بہن کہاں ہیں؟ اس پر اُس خاتون نے کہا کہ میں ابھی اُس کو لے کر آتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ مغربی انداز کے سیاہ لباس میں "پری پیکر، نگار، سرو قد، لالہ رخسار ہے" کا مجسّم اطلاق ایک "پیچیدہ مو، نگار، سن بو، غزال خو" کے قدو قامت کی صورت میں فقیر کے روبرو ہے۔ الاماں! کیا دُزدیدہ نگاہی تھی۔
تجلی بھرپور ہوئی، بے ساختہ ہوئی اور زود اثر ہوئی اور تجلی کی تاثیر صفحۂ قرطاس پر ایک نقشِ خیالی کا رُوپ دھار کر آنے کے لئے میرے وجود میں مضطرب ہوئی۔ اس ردِ عمل میں یقیناً کچھ "شرارت" کے عنصر کا نمک بھی شامل تھا۔ میں نے مارکر سے، ایک کاغذ پر آئینے کے سامنے آرائشِ جمال کرتی ہوئی دوشیزہ کی خیالی تصویر بنائی جس کا لباس سیاہ تھا اور بیچ کی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ ساتھ میں ایک گلدان بنا دیا۔ خوب خوب رنگ بھرے اور آن کی آن میں تصویر بن گئی۔ میں نے پوچھا کہ کس ملک کی رہنے والی ہو، معلوم ہوا کہ قاہرہ کے نزدیک کسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ نقشِ خیالی پر داد مل رہی تھی اور پیچھے سے پیلا ٹم کلاس کی پاکستانی خواتین کی بھی دادِ تحسین کی آوازیں آرہی تھیں اور اس دوشیزۂ مصری کے لئے تصویر بنانے میں درپردہ ان پاکستانی خواتین سے بھی ایک سیاسی چال چلی جارہی تھی۔ اور میں اُن کی داد و تحسین کا گویا کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ سامنے اور دائیں جانب جو خواتین و حضرات تھے اُن سے محبت میں کوئی کمی بھی نہیں ہورہی تھی۔ بائیں طرف اور افراد کے ساتھ وہ دونوں مصری نژاد ہمشیرگان کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے تصویر پر دستخط کرکے اُن کی ہمشیرۂ کلاں کو دی کہ وہ اپنی ہمشیرہ کوچک کو اپنی طرف سے عنایت کردیں۔ اس پر ان دونوں نے "شکراً" کہا اور جواب میں، میں نے یکدم "عفواً" کہا۔ "شکراً" پر "عفواً" کہنا اپنے شامی شناسا السید احمد جہاد سے میں نے اور احسن نے ایک دن پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔

نمائش والے ہال میں کچھ لوگ اپنی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ مختلف گروپ بن رہے تھے اور بین بین دستخطوں کے سلسلے چل رہے تھے، مصری ہمشیرگان نے بھی مجھ سے کہا کہ اُن کے ساتھ بھی فوٹوگراف کھنچوالوں۔ انکار کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کتنے ہی پاکستانی تھے جو کہہ رہے تھے ہمارے گھر چلیں۔ پیل باٹم کلاس والی پاکستانی خواتین بھی کہہ رہی تھیں کہ ہمارے گھر چلیں "ڈرنک ورنک" کریں اور کھانا کھائیں۔ ان میں سے ایک بولی اٹھیں ہمارے گھر پر کاغذ اور قلم بھی آپ کے لئے رکھے ہوتے ہیں۔
دراصل ان کا تعلق پاکستان کے سرمایہ دار طبقے کے ایک خاص خاندان سے تھا اور کیونکہ میں نے اس طبقے کی خواتین میں

بھی لُوٹے وفا کا فقدان دیکھا ہے، یعنی یہ کہ جہاں اُن کو ایک دو خاکے میں نے حُسن پرستی میں بنا کر دے دیئے اُس کے بعد اُن کی شکلیں ہی نظر نہ آئیں اور خاکہ لینے سے پہلے ایک ایک دن میں دو دو مرتبہ آکر شکل دکھاتی تھیں۔ اگرچہ میں حُسن پرستی کے سلسلے میں اپنے رویۂ حیات کو طبقاتی شعور سے بے نیاز رکھتا ہوں۔ اگر اخلاق و آداب اچھے نہ ہوں، خلوص اور وضع داری نہ ہو تو پھر مجھے ایسے لوگوں کی صورتیں بھی جمالیاتی کشش سے خالی نظر آتی ہیں۔ یعنی مطلب نکل جانے کے بعد ان کا انسانی سطح پر میل ملاپ ختم ہو جاتا ہے۔ خیر میں تو کسی خاتون کا دل رکھنے کے لئے، خواہ وہ سرمایہ دار طبقے ہی کی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ فرمائش پر بنا کر دے ہی دیتا ہوں، اُس کے بعد وہ اگر بے رُخی بھی کر جائیں تو اُس سے بھی مجھے خدانخواستہ کوئی دُکھ نہیں ہوتا ہے لیکن جب ان کو دیا ہوا خاکہ زردار کے شیش محل کی دیوار پر لگ جاتا ہے تو کیا اُس کے گھر آنے والے یہ نہ سوچتے ہوں گے کہ یہ اس سیٹھ نے صادقین سے خریدا ہو گا۔

میں نے ان بیل باٹم خواتین سے عذر کیا کہ آج رات اپنے ہی یہاں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ اس پر اُنہوں نے کہا۔ "کل"۔ میں نے کہا کل تو میں ابوظبی چلا جاؤں گا۔ اس پر وہ بولیں "ہم بھی وہیں آجائیں گے"۔

آخر کار رات کے دس بجے عباس نقوی صاحب اور اُن کے کچھ دوستوں کے ساتھ میں اور احسن اپنی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ نقوی صاحب کے ایک دوست کسی ریستوراں کے مالک تھے۔ بہترین کھانا وافر مقدار میں لائے۔ اور وہ ہم لوگوں نے ایک عالم ہاؤ ہو میں تکلف اندوز ہو کر شکم سیر ہو کر کھایا۔ لمحات نیم شب تھے اور ۲۷ اکتوبر کو ۲۰ اکتوبر ہوئے چند ہی گھنٹے گزر سے تھے کہ یہ مذاقی محفل برخواست ہو گئی۔

اگلے دن ہم لوگ میونسپل لائبریری پہنچے۔ آج کام اور ہی نوعیت کے تھے یعنی نمائش کی 'دکان' جس پر دوا تھے درد دل کا سودا ہوتا تھا، وہ بڑھا کر تیسرے پہر ابوظبی کی طرف پرواز بھی کرنی تھی۔ لائبریری پہنچتے ہی ایک بزرگ نے جن کا نام نہیں یاد مگر ہم لوگ ان کو ڈاکٹر صاحب کہتے تھے انہوں نے بتایا کہ موسیو کمال حمزہ کے دفتر چلنا ہے۔ معلوم ہوا کہ بلدیہ کی عمارت کے لئے کچھ کام چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں باذوق تو پہلے ہی پایا تھا لیکن مجھے ان کے دفتر میں احساس ہوا کہ ان کی مصروفیات بھی بے حد ہیں۔

میں نے جس خطاطی کو بلدیہ کے لئے بڑا بنوانا چاہتے تھے، تنگیِ وقت کے باعث وہ چھوٹی خطاطی بلدیہ ہال کے لئے تحفۃً دینے کی پیش کش کر دی، اُس کے بعد میں اور احسن یہ خطاطی لینے کے لئے دوبارہ لائبریری آئے، خطاطی جس میں اُوپر جھنڈے سے ایک سمت میں لہراتے ہوئے چلے جا رہے تھے اور ہرا دل جھنڈے سے یہ کلمۂ طیبہ لکھا ہوا تھا اور نیچے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ جلی حروف میں تحریر تھا۔ یہ خطاطی لے کر جب دوبارہ بلدیہ کی طرف جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی حرکت میں آئی ہی تھی کہ لائبریری میں سے ایک صاحب آئے اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کا ٹیلی فون ہے، میں نے جا کر ریسیور اُٹھا کر "ہلو" کہا تو اُس طرف سے چودھری صاحب بول رہے تھے، اُنہوں نے بتایا کہ گیارہ بجے متحدہ امارات کے نائب صدر جناب شیخ راشد المکتوم سے ملاقات کے لئے وقت طے ہے اور میں آپ کو لینے کے لئے آ رہا ہوں، میں نے کچھ بڑے بڑے سادہ کاغذ، موٹے مارکر کچھ مطبوعہ خطاطیاں سورۂ رحمٰن وغیرہ اپنے ساتھ لیں کہ نائب صدر کو پیش کر دوں گا۔ اتنے میں چودھری صاحب آئے تو انہوں نے کہا کہ ایک اور مجمل خطاطی بھی تحفے میں دی جائے گی تو قومی سطح پر بات اچھی رہے گی۔ میں نے کہا کہ بڑے شوق سے اور بڑی خوشی کے ساتھ۔ میں ایک قلمی خطاطی بھی پیش کر دوں گا اور پھر میں اور چودھری صاحب نائب صدر کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ اچھی خاصی ڈرائیو تھی۔

نائب صدر کے دفتر کے افراد نے چودھری صاحب کا پُرتپاک استقبال کیا اور ہم لوگ ایک آراستہ ہال میں بٹھا دیئے گئے اور چند لمحات کے بعد جناب شیخ راشد تشریف لائے۔ چائے کا فنجان پینے کے دوران اُن کے پروٹوکول افسر کی ترجمانی کے ذریعے میں نے اپنی دبئی میں مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور پھر مطبوعہ خطاطیاں وہیں آداب و القاب کے ساتھ نام لکھ کر پیش خدمت کر دیں۔ قلمی خطاطی دیوار پر لگا کر دکھائی اور پھر کاغذوں پر اُلٹی جانب سے رواں دواں خطاطیاں بھی کر کے دکھائیں۔ داد و تحسین کا

سلسلہ بھی رہا۔ میں نے شیخ راشد سے آٹوگراف لئے کیونکہ لاہور میں کسی بچی نے کہا تھا کہ سربراہانِ ممالک سے میرے لئے آٹوگراف ضرور کرا کے لائیے گا۔

یہاں سے چودھری صاحب نے لائبریری کا بینچا یا تو احسن بلدیہ سے واپس آ چکے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہ چھوٹی خطاطی بلدیہ کے ہال میں آویزاں بھی ہو چکی ہے۔ ہم لوگوں نے پھر نمائش اتارنی شروع کر دی۔ خطاطیوں کو جست کے بکسوں میں قرینے کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے اس مرحلے پر بھی بہت کام کیا۔ دن کا کھانا چودھری صاحب اور اقبال صاحب کے ساتھ کسی او پنجے اسٹائل ریستوران میں کھایا گیا اور اسٹیک سے لگا کھاتی ہوئی یا دہٗ ارغوانی کا ایک جام بھی سامنے رکھا گیا۔ کیونکہ سفر سوار تھا تو اشتہا کچھ خاص نہیں تھی۔

خطاطیوں کے کریٹ سڑک کے راستے سے ابوظبی کے لئے روانہ کئے جا چکے تھے۔ اب ایئرپورٹ پر چودھری صاحب اور اقبال صاحب کا شکریہ ادا ہو رہا تھا اور اہلِ دبئی سے اُن کی مہمان نوازیوں پر متشکرانہ کثیر قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ سعودی عرب کے کونسلر بھی موجود تھے جو فرانسیسی بہت اچھی بول رہے تھے، چودھری صاحب کی بھی فرانسیسی خاصی تھی لیکن میں فرانسیسی بولنے میں اس لئے احتراز کر رہا تھا کہ چودھری صاحب سمجھیں گے کہ صادقین کی فرانسیسی ٹوٹی پھوٹی ہے۔

میں اور احسن "خدا حافظ" کہہ کر اور "فی امان اللہ" سُن کر خطوط طیران الخلیج کے ایک چھکڑا نما چھوٹے جہاز میں اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے اور پاس کھڑی ہوئی لبنانی نژاد ایئرہوسٹس سے کچھ تختیاں کرنے کی ایک ناکام کوشش کی جس پر اُس نے بھرپور مگر مصنوعی مسکراہٹ سے ہمیں نوازا۔ پھر جہاز میں سے طیران کے دوران ۲۸ اکتوبر ۷۰ء کے سورج کو مغرب کی طرف غروب ہونے کا منظر دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ایک شہر کی جگمگاتی ہوئی روشنیاں نظر آنی شروع ہوئیں اور جہاز اُتر گیا۔ اُس وقت کچھ "دوحہ دوحہ" کا لفظ اعلان میں آ رہا تھا۔ ہم لوگوں نے سمجھا کہ اس کے بعد ابوظبی آئے گا۔ سوچا کہ چلو نیچے چل کے ہوا کھائی جائے، میں تو اتر کے نیچے آ گیا۔ احسن جہاز کے عملے کے کسی آدمی سے گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے جہاز میں ہی سے کہا۔ "بھائی جان! یہ تو ابوظبی ہی ہے"!

جب ہم لوگ کاؤنٹروں پر اپنے پاسپورٹ اور ویزا دکھا رہے تھے تو کاؤنٹروں کی اُس تنگنائے سے آگے ہال میں ایک بلند قامت وجیہہ نوجوان گرتے اور شلوار میں نظر آ رہے تھے اور ہماری طرف دور ہی سے وہ خود بھی متوجہ تھے جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو انہوں نے بڑھ کر ہمیں خوش آمدید کہا اور "حسن سرمد" کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔ ان سے غائبانہ طور پر ایک دن پہلے ہی دبئی سے فون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ ہال سے نکل کر برآمدے میں آئے تو ایک اُردنی نژاد نوجوان سے ملاقات ہوئی جو ابوظبی میں محکمۂ اطلاعات سے منسلک تھے۔ زاخر ہوٹل میں ہمارے قیام کا بندوبست تھا۔ سڑکوں پر رنگ برنگی تیز روشنیاں تھیں۔ راستے میں معلوم ہوا کہ نمائش فندق ہلتون کے ہال میں ہونا طے پائی ہے، میں نے حسن سرمد سے کہا کہ سامان ہوٹل میں ڈالتے ہی ہم لوگ نمائش والے ہال کا جائزہ لیں گے تاکہ اُس کے در و دیوار اور زاویے ذہن نشین ہو جائیں اور رات میں یہ سوچنے کا موقع مل جائے کہ نمائش کس طرح اس میں لگائی جائے گی۔ زاخر ہوٹل میں سامان رکھتے ہی ہم لوگ فندق ہلتون کی طرف روانہ ہوئے۔ ساتھ ہی عباس نقوی صاحب بھی تھے۔

خلیج کے کنارے کنارے کورنش پر ڈرائیو پُر لطف تھی اور ساحل کے پیچ و خم کے ساتھ دور دور تک بجلی کے کھمبوں کی قطار اور روشنیاں ایک نظر فریبی کر رہی تھیں۔ میں نے گاڑی میں سے پُشت کی طرف مڑ کر دیکھا تو سامنے جیسا ہی روشنیوں کا لہریے کھاتا ہوا سلسلہ نظر آ رہا تھا جو نقطۂ غائبانہ تک چلا گیا تھا۔ فندق ہلتون کی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ وہاں ارشاد علی بخاری صاحب سے بڑی گرمجوشی سے اچانک اور غیر متوقع طور پر بغل گیر ہوئے۔ ہلتون کی لابی میں سے ہال

کا جائزہ لیا گیا ۔ ہال میں اُسی شام کو کوئی پارٹی ہو رہی تھی جو بڑی رنگین قسم کی تھی ۔ لابی میں کو چوں پر اور گوشوں میں صوفوں پر مخلوط قسم کی آدم و حوّا کی اولاد بیٹھی ہوئی تھی ۔ اولادِ آدم کی عبائیں جس قدر ڈھیلی اور دراز تھیں اولادِ حوّا کی قبائیں اُسی قدر چُست اور مختصر تھیں ۔ ابنِ آدم کا چہرہ بھی گھونگھٹ کے سبب کم ہی نظر آتا تھا ۔ اور بنتِ حوّا کی جوانی کی بالائی گولائیاں بھی صاف نظر آ رہی تھیں ۔ ارشاد علی بخاری صاحب نے وہاں کے میخانے میں آنے کی دعوت دے دی تھی ۔ چنانچہ میرے ساتھ جتنے لوگ تھے اُن میں سے کوئی بھی ذوق مئے گلفام نہیں رکھتا تھا ، میں اُن کے ساتھ داخل میخانہ ہوا ۔ ذرا مدھم روشنیاں تھیں جن میں کچھ چہرے بھی جگمگا رہے تھے اور ایک گوشے میں ارشاد صاحب کسی انگریز کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے ۔ ہم لوگ وہاں کچھ دیر بیٹھے ، اپنے ساتھیوں نے تو کچھ نہیں البتہ میں نے ایک جامِ آتشیں سے اپنے خشک کام و دہن کی ترادت کی ۔ پھر ہم لوگ ہوٹل آگئے ۔ یہاں میرا اور احسن دونوں کو ایک ہی کمرہ ملا تھا ۔ کچھ کرم فرما لوگ آئے اور کچھ قلب و نظر کی زندگی کے بندوبست کے ساتھ یعنی نادر و نایاب قسم کی دُخترِ انگور کو بغل میں لے کر گپ ہوتی رہی ۔

۲۹ راکتوبر ۷۴ء کی صبح کو میں اور احسن فندق ملتون پہنچے ۔ ہال بند تھا ۔ کٹر قدامت اور اٹل روایت کے اس ریگستان میں فندق ملتون کی لابی میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوا کہ زلف و لب و رخسار کے ایک گھنے نخلستان میں ہم لوگ داخل ہو گئے ۔ بازوؤں کی شاخیں ، لب و رخسار کے پھول اور زلفِ طرح دار کے برگ و بار ، کیسے کیسے مہ وشانِ شوخ و شنگ کوتہ قبائی اور چستیٔ لباس کے ساتھ اُدھر سے اِدھر کلیلیں کر رہے تھے ۔ ایک عالمِ رنگ و بو تھا ۔

کچھ دیر انتظار کے بعد ہال کھُل گیا ۔ چھت میں جھاڑ ٹنگے ہوئے تھے ، ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک قالینِ سُرخ بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر گلابی رنگ کا مخمل لگا ہوا تھا ۔ پانچ بجے شام نمائش کا افتتاح ہونا تھا ، اسکرینوں کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا ۔ خطاطیوں کے کریٹ نیچے سے اوپر ہال میں آ رہے تھے ۔ ہوٹل کے انتظامیہ کے عملے کے افراد سے 'پبلک ریلیشنگ' بھی چل رہی تھی ۔ وقت گزر رہا تھا اور گھبراہٹ بڑھ رہی تھی ۔ ہال میں داہنی جانب دروازے سے دروازے تک لکڑی کی پینلنگ تھی ۔ میں نے احسن کو مشورہ دیا کہ پینلنگ پر ٹیپ سے اِدھر سے اُدھر تک اسماء حُسنہ کے رول اوپر سے نیچے تک لگا دو ۔ سامان کے بکس کھولے گئے ۔ فندق ملتون کے منتظمین نے ہم سے پورا پورا تعاون کیا اور جب یہ کہا کہ مخملیں دیوار میں کیل مت ٹھوکیے گا تو میں نے کہا کہ اگر بالفرض آپ اس کی اجازت بھی دیں گے تو ہم پھر بھی کیل نہیں ٹھونکیں گے کیونکہ اس کی نفاست اور صفائی جتنی آپ کو عزیز ہے اتنی ہی ہمیں بھی عزیز ہے ۔

اتنے میں اسکرینیں آگئیں ۔ یہ وہی اسکرینیں تھیں جو دبئی میں تاخیر سے پہنچی تھیں ۔ اسکرینوں کے اسٹینڈ ٹوٹے ہوئے تھے اور ان میں کہیں کہیں وہ کیلیں بھی نہیں تھیں جن کے اُوپر بورڈ کو رکھا جاتا ہے ۔ میرا خیال تھا کہ اسکرینوں کو فرش کے متوازی قطار میں رکھ دیا جائے گا اور اُن پر خطاطیاں لگا دی جائیں گی ۔ لیکن اُن میں اس سلسلے میں مرمّت کا کام بہت تھا جس میں وقت لگتا تھا ۔ اگرچہ فندق ملتون کے چیف انجینئر قاضی صاحب نے تمام کاریگر ہمارا کام کرنے کے لیے متعین کر دیئے تھے اور خود بھی نگرانی کر رہے تھے ۔ میں نے یہ سوچ کر کہ وقت کم ہے اسکرینوں کے اسٹینڈ پر ایک مقررہ زاویے پر برابر برابر فاصلے پر چاروں طرف رکھوا دیئے اور اُن کے اُوپر اسکرینیں زمین پر ٹیک کر فرش سے عمودی طور پر لگوا دیں اور اُن پر تلے اُوپر سورۂ رحمٰن کی خطاطیاں ترتیب کے ساتھ لگوانی شروع کرا دیں اور عمودی انداز سے رکھی ہوئی اسکرینوں کی پیشانی پر سورۂ یٰسین کے رول کی پٹی کا مسلسل سلسلہ لگوا دیا ۔ درمیان میں میزیں بچھائی گئیں اور ان پر دیگر خطاطیوں کے سلسلے بچھا دیئے گئے ۔ فندق ملتون کے انجینئرنگ کے عملے کے بے حد تعاون کے سبب نمائش کا مورچہ بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ جم گیا ۔ مورچہ جمانے کے دوران میں ہی الوحدہ ، الفطرہ اور الاتحاد کے نمائندہ صحافیوں کو انٹرویو بھی دیا جاتا رہا ۔ پوری ٹیم محبت اور عقیدت کے ساتھ کام کر رہی تھی اور ہم لوگ وقت کو قابو میں لے آئے تھے ۔ اس اثناء میں فندق ملتون میں غیر ملکی

خود بروہال کے دروازے سے بیٹھے تاک جھانک کرتے رہے اور کچھ ہال کے اندر بھی خرام ناز کرتے رہے لیکن کام کی شدت اور وقت کی تنگی کے سبب اُن کو لفٹ نہ دینے کا گناہ ہم سے مجبوراً سرزد ہوتا رہا۔

القصّہ نمائش بہت خوب صورتی کے ساتھ کوئی چار بجے تک سجادی گئی، جب میں اور احسن نمائش لگانے کے بعد، غسل کرنے اور لباس بدلنے کے لئے زافرہوٹل کی طرف جا رہے تھے تو لگی ہوئی نمائش پر مجموعی اکائی کے طور پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی گئی اور خود بھی یہ محسوس کیا کہ واقعی ایک سماں پیدا ہوگیا ہے یعنی ایک ڈراماتی صورتِ حال، اور پاکستان میں کبھی کیونکہ اتنے شاندار ہال میں نمائش نہیں ہوئی تھی لہٰذا پاکستان والی نمائشوں سے اس نمائش کا مجموعی تاثر بہت زیادہ گہرا تھا۔

فندق زافر میں غسل خانوں میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ جگ میں پانی منگوا یا گیا اور منہ دھونے پر اکتفا کیا گیا۔ پھر میں اور احسن فندق ہلٹون پونے پانچ بجے پہنچے۔ ایک ایک کافی کی پیالی پی گئی۔ کچھ اور کرم فرما بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔

یہ ۲۹ر اکتوبر کی شام تھی اور پانچ بجے کا وقت تھا۔ اب ہم لوگ ہال کی طرف جا رہے تھے۔ ہال کے سامنے ہی کافی خواتین وحضرات جمع ہوگئے تھے جن میں فی الحال پاکستانیوں کی اکثریت نظر آ رہی تھی۔ لابی میں لوگوں کی تعداد لمحات گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی میں کچھ پاکستانی حضرات سے گفتگو کر رہا تھا کہ اُدھر مجمع میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور اُنہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میرا نام جمیل حسن ہے ۔ ابوظبی میں پاکستانی سفیر انتہائی نستعلیق باذوق اور ذہین آدمی معلوم ہوئے ۔ اتنے میں مہمانِ خصوصی جو متحدہ عرب امارات کے دفترِ خارجہ میں سیکریٹری ہیں اُن کی آمد ہوئی اور فیتہ کاٹنے کے افتتاحی تکلفات کا سلسلہ جاری ہوا۔ خواتین وحضرات کا بین الاقوامی نوعیت کا مجمع تھا اور ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مہمانِ خصوصی اور دیگر اکابرین کے ساتھ خطاطیوں کی وضاحت کرنے کی رسم بھی ادا کی جا رہی تھی۔ قدم قدم پر فوٹوگرافی بھی ہو رہی تھی۔ نمائش میں اکابرین کے ساتھ ساتھ گھومنے کے تکلفات کے بعد میں نے ایک گول میز پر اُسی طرف سے خطاطیوں کا آزمودہ زود اثر نسخہ استعمال کیا۔ میز کے چاروں طرف خواتین وحضرات کا ایک انبوہ تھا اور میں خطاطانہ شعبدے سے بازیاں کر رہا تھا۔ مہمانِ خصوصی کے نزدیک ہی جرمن کونسلر بھی کھڑے تھے جو عربی بہت اچھی بول رہے تھے اور خطاطیاں کرنے کے دوران میں نے اپنی نقشہ نویسی کا کمال دکھانے کا موقع جرمن کونسلر سے گفتگو کے دوران نکال لیا۔ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ بنایا جس میں ابوظبی اور میونخ کے شہروں کے نقطے لگائے، کچھ فلکے بھی بنے اور لوگوں کو بر دو شروں پر بسم اللہ ہیں اُن کے نام اور پھر اپنے دستخط، یہ سلسلہ کئی گھنٹے تک جاری رہا۔ سر اُٹھانے کی مہلت نہیں ملی۔ نمائش میں میری اُمیدوں سے کئی گنا زیادہ رنگینی اور رونق تھی۔ بیرونی ممالک کے لوگوں کے علاوہ ابوظبی کے مقامی باشندے اپنی خطاطیوں کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر میں تھے، میں اور میرے قریبی حلقے کے لوگ اس سلسلے میں اپنی معذوری کا اصول خوبصورتی کے ساتھ بتا دیتے تھے۔

صفحہ ۲۲۷ کا باقی

تھوڑی دیر پہلے میں بیاض کے رباعیوں والے حصے پر صفحوں کے نمبر لکھ رہا تھا تو جمالیاتی رباعیوں کے مصرعوں سے بنی المصرعجات کی چلمنوں میں سے اُن جملہ حسینانِ آشنا کے دمکتے ہوئے مکھڑے جھانکتے ہوئے نظر آرہے تھے جن کے چھوڑے ہوئے جمالیاتی تاثر میں یہ رباعیاں کہی گئی تھیں، "اُن جملہ گیسوؤں والوں کا ابرو کے کمانداروں کا" دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جن کی کرم فرمائیاں ان رباعیوں کی تحریک میں تبدیل ہوگئیں۔

شہر پاروں کا رقیب، مسکین وغریب آیات کا کاتب، بندۂ مرزا اسد اللہ خاں غالب، مضطر، بیکل، بے چین،

صادقین (عفی عنہ)

سبطین منزل، ناظم آباد، کراچی بروز منگل ۲۹ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ (۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء)

مکاتیبِ صادقین

PARIS
29.1.64

پیارے سلطان احمد —!

کل صبح جب تمھارے چچا جان سو کر دن کے کوئی ساڑھے چار بجے جاگے — (جاگے کیا بلکہ "جگائے گئے") بیڈ ٹی کی بجائے کافی پیتے ہیں۔ کافی پیتے ہیں۔ اُن کو تمھارے ابا جی اور اماں جی کی صحت کی طرف سے فکر اور تشویش ہو رہی تھی کیونکہ ان کا وجود روحانی طور سے ہی نہیں بلکہ خالص دنیاوی اور مادّی طور سے بھی غنیمت ہے اور جب تک بھی یہ لوگ جی جائیں ہمارا تمھارا ہی بھلا اور بہتری اور فلاح ہے۔ بہرکیف فکر تھی کہ تمھارے ابا جی کا خط ملا اور یہ پڑھ کر کہ اُن کی صحت اچھی ہے خود اپنی صحت بھی اچھی ہو گئی اور انہوں نے لکھا ہے کہ اماں جی کی صحت بھی ماشاء اللہ اُن کے سِن اور اعضاء کے لحاظ سے اچھی ہے اطمینان ہوا۔ ان لوگوں کو بھی فرخ کا عرق پینے اور پلانے کی تجویز کرتے رہا کرو تاکہ ان کی تندرستی اچھی رہے اور ہمارے تمھارے سر پر ان کا سایہ اور شفقت جاری رہے —

بہرکیف تمھارے ابا جی کا خط ملا اور جواب تم کو لکھ رہا ہوں —

اس سے پیشتر تمھارے بھائی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جو کہ اُن کو جیسا کہ اندازہ ہوتا ہے مل گیا ہے۔ اُمید ہے کہ ایک دو روز میں اُن کا جواب ملے گا۔ بہرکیف بہت عمدہ خط لکھتے ہیں۔ اگر لکھتے رہا کریں تو اچھا ہوگا مگر زیادہ نہ لکھیں — کیونکہ اُن کی پڑھائی اور مطالعہ میں فرق پڑ جائے گا۔ مگر بہت زیادہ پڑھنا بھی اچھی بات نہیں ہے — تفریح اور سیر بھی ضروری ہے اور مطالعہ کی یکسرگی اور یکسوئی میں رنگا رنگی پیدا کرنے کے لیے اس قسم کا شغل جیسے کہ خط لکھنا یا میز پر سے گرد صاف کر دینا یا سیمنی فاطمہ کو چوزگی کی سیر کرا دینا یا ریڈیو پر کوئی گانا سن لینا یا کسی سے دوستی کرنا۔ وغیرہ وغیرہ بھی ضروری ہے —

ابا جی نے لکھا تھا کہ بابا صاحب کی بھی کوئی ترقی ہوئی ہے — کوئی انفارمیشن کا سیکشن یا محکمہ یا کیا بہرکیف کھلا ہے۔ غالباً اُسی میں ہوئی ہوگی — بہرکیف — سن کر خوشی ہوئی۔ تفصیل لکھیں۔

ابا جی اور اماں جی سے یہ کہہ دینا کہ وہ جو کچھ بھی دعائیں کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں وہ قبول ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ تمھارے چچا جان پر جو قوم سب سے زیادہ مہربان ہوتی ہے وہ نہ جانے کیوں بنی اسرائیل کے لوگ ہوتے ہیں — بنی اسرائیل کے ذریعہ — جو کام انجام ہونے ہوتے ہیں، ہو جاتے ہیں۔ بڑے مشکل کام — جو خیال و خواب میں بھی نہیں آتے — کہہ دینا کہ دعائیں اجابت کا شرف حاصل کرتی ہیں اور اُن کا ظہور بنی اسرائیل کی مہربانی اور الطاف میں جو ریشم اور جامہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، ہوتا رہتا ہے —

امریکہ میں بھی بنی اسرائیل ہی مہربان تھے —

اور پیرس میں بھی یہی حضرت موسیٰ کی اُمت پیش پیش ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں سمجھیے کہ نصاریٰ کی طرف سے کوئی کمی ہے — بہرحال —

اچھا — ایک خبر یہ اور سنو کہ فرانس کے بڑے شہروں میں ایک گھومتی ہوئی نمائش ہونے والی ہے (یعنی ایک شہر کے بعد دوسرے شہر میں) اس میں تمھارے چچا جان کی بھی تصویر شامل ہے — یہ فرانس کی ثقافتی اُمور کی وزارت کی طرف سے منظم ہو رہی ہے — جس شہر میں بھی ہوگی اُس کے میوزیم میں ہوگی اور یہ سلسلہ اکتوبر ۶۵ تک جاری رہے گا۔ بابا صاحب سے کہہ دینا کہ ابھی اس خبر کو روکے رہیں اور جب متعدد اس قسم کی چیزیں ہو جائیں تب خبر بنائیں —

ہاں — تو — تمھارے چچا جان صبح کے چھ بجے سوتے ہیں اور چار پانچ کے درمیان میں دن کو پیالہ کافی پیتے ہیں۔ بڑے اطمینان کے ساتھ — شاعری کرتے رہتے — آج کی رات، تمھیں خط لکھ رہے ہیں اور اس فکر میں ہیں

صبح کو ۸ بجے کس طرح اٹھیں۔ کیونکہ ہم کو پیرس کے ایک بہت بڑے
نشر و اشاعت و طبع کے ادارے کے منتظم خاص سے ملاقات کرنی ہے۔
وہ اپنے ہی گھر پر آئیں گے۔ اور معاملہ یہ ہے کہ فرانس کا ایک بڑا اچھا
اور مشہور ادیب البرٹ کامو ہے۔ یہاں کے نئے ادب کا معمار ہے اور
یورپ کے جدید ادب کا ستون ہے۔ اس کا ۱۹۶۰ میں ۴۷ سال کی عمر میں
انتقال ہو گیا تھا۔ بہر حال کامو کو نوبل پرائز بھی ملا تھا۔ کامو کی ایک
کتاب یعنی ناول ہے جس کا نام ہے "لا اتر انژے" جو کہ اس ادارے کی
طرف سے شائع ہو رہا ہے اور پیرس کے کچھ بڑے آرٹسٹ اس کتاب
میں نقش گری کا کام کرنا چاہتے تھے۔ تمھارے چچا جان بھی کوشش کر رہے
تھے۔ نقاشیوں کو منتخب کرنے کے لیے پیرس کے خواندہ اور برگزیدہ
آرٹ کے جاننے والوں کی جیوری تھی اور آخر آج اس جیوری نے اپنا آخری
فیصلہ شام کے چھ بجے یہ دیا کہ کامو کی اس کتاب میں نقاشیاں تمھارے چچا جان
کریں گے۔ بیشتر کام پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب صرف پریس کے مسودوں پر مختلف
رنگوں میں اس کو اتار دینا ہے۔ یعنی سیریگرافی کرنی ہے۔ رنگین۔ اور
پھر پیسے بھی ملیں گے۔ یہ کام فرانس اور خاص طور سے پیرس میں آرٹ کے لحاظ
سے بہت اہم کام سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال۔ دن میں پریس میں کام ہوگا اور رات
کو نمائش کے لیے تصویریں بنتی رہیں گی۔
تمام اپنا پروگرام تمھیں بتلا رہا ہوں۔
اب تم یہ بتاؤ کہ دودھو و ڈوڈو بھی سب ہو کر بیٹھیں اور تمھارے چھوٹے بھائی
کیا کر رہے ہیں۔ اپنے بھائی صاحب سے کہنا کہ جنوبی فرانس کے گوشت کھانے کے بعد تمھارے
چچا جان اس نتیجے پر آئے ہیں کہ ذائقہ، لذت اور خستگی کے لحاظ سے خرگوش کے
گوشت کا کوئی جواب نہیں ہے۔ انتہائی تر اور لذیذ ہوتا ہے۔
سلمان احمد کو یاد کر دینا اور اپنے آپ کو بھی یاد کر دینا۔ نسرین، شیریں
عرفان اور یسمین کو یاد کر دینا اور پیار۔
ادا جی سے کہہ دینا کہ میرا خیال تو یہ تھا کہ ان کا پاسپورٹ بنا ہوا ہے۔
اگر نہیں ہے تو بنوا لیں۔ اور کہہ دینا کہ ان کا گزشتہ خط بھی ملا تھا۔ پاؤں
کی تکلیف کا عجیب حال ہے۔ بہر کیف بقول شخصے گزارا ہو رہا ہے۔
ابو جی۔ اماں جی کو سلام کہہ دینا۔
بابا صاحب۔ باجی اور چچا جان کو سلام کہہ دینا۔
اور کیا۔ خط فوراً لکھنا اور اپنے دیگر مشاغل پر روشنی ڈالنا۔
اور اپنے بہن بھائیوں کے حالات لکھنا۔

تمھارا — چچا جان

پیرس - ۱۸ر جولائی - ۱۹۶۲

پیارے سلمان احمد —

وارے نیارے ہیں اور رنگ رلیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

کئی روز ہوئے کہ تمھارا خط ملا تھا اور امروز و فردا ہوتے ہوتے
آج کا دن آ گیا کہ جواب نہ لکھا جا سکا۔ اور اس وقت بھی جس
رواروی میں یہ رقعہ لکھا جا رہا ہے، کچھ نہ پوچھو۔ اُدھر تمھاری
اماں جی کو خط نہ آنے سے تعلقِ خاطر پیدا ہو رہا ہوگا اور اِدھر
تمھارے چچا جان کو رنگ رلیوں سے اور رت جگوں سے فرصت
نہیں مل رہی۔ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل اگر نہ لکھی
جائے تو تمھاری اماں جی کو خواہ مخواہ میں تردّد ہوگا۔
مطلب یہ ہے کہ کاروبار اور فکر و کاوش کا سلسلہ جاری ہے
اور اطمینان اور سکون کے ساتھ (ذہنی طور سے نہیں)
فراغت اور آسودگی کے ساتھ بود و باش ہو رہی ہے۔ اور
کوئی موقع کبھی ایسا نہیں آتا جہاں کسی سرپرستی کا احساس
یا بے لطفی کی کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ اور تو اور بڑے
بڑے امریکن اور جرمن رئیسوں کی بھی خاطر مدارات کر دی
جاتی ہے۔

"بود و باش ہو رہی ہے" یہ وہ محاورہ ہے جو تقریباً ہر
خط میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۴ر جولائی کو پیرس شہر میں چراغاں ہوتا ہے اور بڑی
زبردست قسم کی آتش بازیاں چھوٹتی ہیں۔ دیکھنے ہی سے تعلق
رکھتی ہیں۔ اُن کو دیکھنے کے دوران میں تم لوگوں کو یاد کیا گیا
خاص طور سے شمون کو۔

اب تو تم لوگوں کے امتحان کے نتیجے معلوم ہو گئے ہوں گے۔
تحریر کرو۔ اور اگلے سال پیرس آنے کی تیاری ابھی سے شروع
کر دو۔ اور پھر یہیں تعلیم کا سلسلہ جاری کرنا۔ انگلستان،
تمھاری لائن کے لیے یورپ کے مقابلہ میں پس ماندہ ملک ہے۔
اور پھر یہ کہ وہاں جانا کوئی خاص بات بھی نہیں ہے
اس بات کی تفصیل لکھو کہ تمھارے بھائیوں اور بہنوں
کے کیا مشاغل رہتے ہیں۔
اچھا۔

کاموں کی کتاب پر کام ہو رہا ہے۔ یہ کام پتھروں پر ہو رہا ہے اور ہر رنگ کے لیے ایک الگ پتھر پر کام۔ اگر ایک تصویر میں پانچ رنگ ہیں تو پانچ پتھروں پر وہ بنائی ہوتی ہے اور وہ پانچوں پتھر جب ایک ہی کاغذ پر چھپ جاتے ہیں تو چیز مکمل ہو جاتی ہے۔ داب دستی پریس میں ہوتی ہے اور پیرس کا بہت مشہور اور اہم چھاپہ خانہ اپنی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اِس طریقے کو لیتھو گرافی کہتے ہیں۔ کتاب کے کچھ اوراق چھپ کر تیار ہو گئے ہیں لیکن اُن کا قد و قامت اتنا ہے کہ وہ آسانی سے پوسٹ نہیں کیے جا سکتے۔ خاص قسم کا لفافہ چاہیئے۔ کتاب کی دو کاپیاں مجھے بھی ملینگی اور ابھی سے لوگ اُن کا بھی سودا کر رہے ہیں۔ یعنی ایک ایک کتاب کے ایک ایک ہزار فرینک کا آفر ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اُس قسم کی نہیں ہے جیسی بازار میں ہوتی ہیں۔ اور جب مکمل ہو جائیگی تب نمائش ہوگی۔ کتاب کو چھاپنے والا ادارہ حد درجہ خوش ہے اور مطمئن ہے۔ اور بہت داد ملتی رہتی ہے۔ اور پھر یہ کہ راستے بھی کھلتے رہتے ہیں۔

پرسوں صبح ایک بہت چھوٹی سی تصویر بکی تھی جس کا قد اِس ورق کی برابر تھا جس پر تحریر شدہ حصہ ہے اِس خط کا۔ اور پھر کل ایک اور تصویر جو بڑی تھی اور دو سال پہلے پیرس ہی میں بنی تھی معلوم ہوا کہ وہ بھی بک گئی اور پرسوں یعنی پیر کے دن اُس کے تین ہزار روپیہ مل جائینگے۔ یہاں کے ۱۳ روپیہ کے اپنے یہاں کی گورنمنٹ جس پا ۲۲ روپیے دیتی ہے اور چور بازار میں تو اور بھی زیادہ۔ اب سمجھ لو کر یہاں کے تین ہزار وہاں کے کتنے ہوئے۔ مگر یہ کہ کھلے ہوئے ہاتھ کے لوگ ہیں اور صرف مہنگی ہی جگہیں پسند آتی ہیں۔ تم جب آجاؤ گے تو پھر کوئی قاعدے کی صورت کی جائیگی۔

کوئی مصرعہ موزوں کرنا چاہتا ہوں۔ تمھارے سندھ میں "انبہ و بیضہ و مرغ و ماہی" کے سلسلے میں مگر اِس وقت ہو نہیں رہا۔ ویسے ایک بات ہے جب ندی کا وجود اور جستہ دیکھتے ہوئے جب ندی کا سیلاب' گنگا کے سیلاب سے بڑھ کر ہے۔

مصرعہ نہیں ہو رہا۔ اصل میں یہ مصرعے زبانی ہی اچھے ہو[تے] ہیں۔ میرے پر اور جب کہ تمھاری باجی بھی دُور سے سُن رہی ہو[ں] اور ہنس بھی رہی ہوں۔

اچھا۔ اور کیا۔ بس گھر والوں کو یاد کر دو اور یہ [کہہ] بھی دو کر ستمبر کے آخر میں حد سے حد دس بارہ دن کے لیے کراچی آنے کی اگر ممکن ہو سکا تو پوری کوشش کی جائیگی۔ کیونکہ کام آدھورے ہیں تو آنا مشکل ہے۔ کاروباری طور پر پیرس میں اتنا ملوث ہوں کہ ایک دو دن کے لیے بھی پیرس چھوڑنا مشکل ہے۔ ورنہ قریب میں اور بھی ملک ہیں جہاں سے لوگ بلاتے بھی ہیں لیکن جانا نہیں ہو سکتا کیونکہ کام کا حرج ہوتا ہے۔

ابا جی۔ اماں جی۔ بابا صاحب۔ باجی اور چچا جان کو سلام کہدو اور یاد کر دو اور تم کو، سلطان احمد کو، نسرین فاطمہ و شیریں فاطمہ کو، اور عرفان احمد و سیماں فاطمہ کو دعا اور پیار۔

اور اماں جی سے کہو کہ مٹھو کو ایک اکنی دیدیں۔

اور سلطان احمد سے کہو کہ خط لکھیں۔

اور کیا۔

تمھارے

چچا جان

PARIS
3.3.64

بادشاہ سلطان ــ !

سب سے پہلے ایک خبر سنو۔ یہ بعد میں لکھوں گا کہ تمھا[را] خط ملا۔ خبر یہ ہے کہ تمھارے چچا جان کے دو بال سفید ہو[گئے] ہیں۔ ایک ماتھے کے پاس اور ایک اُن کی طرف سے بائیں [اور] تمھاری طرف سے داہنی کن پٹی کے قریب۔ مگر دھوپ [میں] سفید نہیں ہوئے، پیرس کی شاموں میں جو رنگین روشـ[ـنیاں]

ہوتی ہیں اُن میں سفید ہوئے ہیں۔ پیرس میں اپنے
جاننے والے لوگ بہت خوش ہیں۔ یہ سفید دو بال اِن ہی
لوگوں نے کرید کر نکالے ہیں۔ چلو اچھا ہے۔
آج کل رات دن کام ہو رہا ہے اور بہت اچھا ہو رہا
ہے۔ بڑی بڑی تصویریں بن رہی ہیں۔ دن اور رات بڑی
تیزی سے گذر رہے ہیں۔ یہ خط ایک کیفے میں بیٹھ کر لکھ
رہا ہوں... لکھا جا رہا ہے۔ اور صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ راتیں کام
میں گذر جاتی ہیں۔ مگر کام اچھا ہو رہا ہے۔

کئی روز ہوئے کہ تمھارا ایک بہت اچھا خط ملا تھا۔
پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ اس وقت وہ خط کیونکہ
میرے پاس نہیں ہے تو تفصیل سے ہر بات کا جواب نہیں
دے سکوں گا۔ مختصر یہ ہے کہ تمھاری زبانی تمھارے
اور تمھارے بہن بھائیوں کے اور گھر والوں کے حالات
معلوم ہو کر خوشی ہوئی اور اِس خبر سے خوشی ہوئی کہ تمھاری
قیامت خیز اور معرکۃ الآرا شیروانی آج کل شیر عرفان احمد
کے کام آ رہی ہے۔ خیر۔ اب تو موسم گرما آ رہا ہے۔ وہ
اپنے ایک دوست فرحباس ہیں۔ آپنوا لے ہیں یہاں۔
اُن کا دفتر ریکس سینما سے ذرا پہلے SKYLINE TRAVELS
وہاں جا کر تم اور بھائی صاحب اپنی "ضروریات" کی
چیزوں کی تفصیل دیدو اور اُن سے کہدو کہ وہ پیرس سے
اشیاء لیکر آئیں۔ پہننے کی چیزیں۔ وہ ۱۵ مارچ تک
کراچی چھوڑ دیں گے اور ایک ماہ کے اندر واپس چلے جائینگے
اور کیا تقشے ہیں۔ کیا سلسلے ہیں۔ آج کل کیا شاغل
ہیں اور کیسی بود و باش ہے۔ کھیل، کود، دنگا، اور
پڑھائی کا توازن ٹھیک ہی ہوگا۔

پیارے۔ یہ خط اصل میں خط نہیں ہے بلکہ تمھارے
گذشتہ خط کی رسید ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کو یاد کر دینا
اور جملہ گھر والوں کو خوب یاد کر دینا۔ دعا و سلام کہدینا۔
اور بابا صاحب سے کہنا کہ اُن کا خط کافی دنوں سے نہیں
آیا۔ اچھا۔ اور کیا۔ پیارے اب تو کاغذ بھی بھر گیا۔

یہ جاپانی قلم اچھا ہے جس سے خط لکھ رہا ہوں۔

تمھارا　　چچا جان

پیرس - ۲۰ اپریل ۶۴ء

پیاری ـــــ شیرین فاطمہ شہزادی

یہ بتاؤ کہ اِس وقت سمّو کیا کر رہی ہے۔ تم نے آج
سمّو کے بال کس طرح بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ سُرمہ ضرور
لگا دینا۔ اور - عرفان احمد تمھارا اور تم اُن کا خیال رکھتی ہوگی
نسرین فاطمہ کیا کرتی رہتی ہیں۔ پڑھتی تو زیادہ نہیں ہیں
اگر زیادہ پڑھا کریں تو اُن سے کہا کرو کہ ابو چل اب
کھیلیں۔ اور تمھارے بھائی صاحبان سید سلمان احمد اور
سید سلطان احمد تمھارا خیال رکھتے ہوں گے۔
اور اباجی کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ تمھاری امی
بہت محنت سے پڑھ رہی ہیں اور بقول اباجی کے کہ اللہ
اُن کی محنت کی راحت دے اور کامیاب کرے۔
تم بھی پڑھ رہی ہو۔ کھیلا بھی کرو۔
باجی کی طبیعت کیسی ہے۔ اُمید ہے کہ اُن کی صحت

اچھی ہوگی اور آرام کی طرف توجہ کرتی ہوں گی۔
اچھا۔ ممتو صاحب کو تین چار روز ہوئے خط لکھا تھا۔ اُمید ہے کہ مِلا ہوگا۔ اُس میں یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ عنقریب شیریں فاطمہ کو خط لکھوں گا۔
سب گھر والوں کو — اباجی اور اماں جی کو سلام کہدینا۔ ممتو صاحب۔ باجی اور امی کو سلام کہدینا اور یاد کردینا اور اپنے بہنوں بھائیوں کو چچا جان کی طرف سے تم خود ہی پیار کرلو پیاری۔
آج پڑھنا کچھ نہیں۔ کھیلنا۔ اور اماں جی سے ایک دو آنی لیکر ابو کے ساتھ کچھ چٹورپن کرنا اور سیمین کو بھی کھلانا۔
یہ جگہ جہاں سے بیٹھ کر یہ خط تم کو لکھا جارہا ہے بند ہورہی ہے۔ اس لیئے خط بھی ختم ہورہا ہے۔ اب اور کیا لکھا جائے بس یہ کہ چچا جان تمہیں اور تمھارے بہنوں اور بھائیوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

تمھارے — چچا جان

16, Boulevard MAILLOT,
Neuilly - PARIS

یکم جنوری ۶۷ء

پیارے — ! آج پہلی جنوری ہو چکی ہے۔ تمھیں اور تمام گھر والوں کو یہ نیا سال مبارک ہو۔
— یہ پہلے ہی معلوم ہو چکا ہوگا کہ تمھارے چچا جان — کراچی سے چلتے وقت کوئی اکیاسی ہزار روپے کے مقروض تھے — ایک تصویر پرواز ان میں اور ایک پیرس میں آکر بنائی اور یہ تمام قرضے اُتر گئے۔ اب سبکدوش ہیں۔ ادائیگی کردی گئی ہے۔ اِس بات پر اماں جی سے کہو کہ ذرا زیادہ مٹھائی پر نیاز کرادیں۔ اور کیا صورت ہے۔ پڑھائیاں کیسی ہورہی ہیں۔ اباجی کے خط سے مفصل خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ — اپنے معاملات یہاں ٹھیک ہیں۔
گھر والوں کو بہت بہت یاد کردینا اور سلام کہدینا۔ خط لکھو اور ذرا تفصیل کے ساتھ۔ اپنی اور اپنے بہنوں بھائیوں کی خیریت اور دلچسپیاں تحریر کرو۔ اباجی۔ اماں جی اور چچا جانی کو سلام کہدو اور یاد کردو۔ سلطان احمد، نسرین اور شیریں کو دعا اور پیار — عرفان اور ممتو بھی آنے ہی والے ہوں گے۔ اور زیادہ کیا لکھوں۔ تمھارا — چچا جان

LAUSANNE

۲۰ ستمبر ۶۶ء — پیارے سلطان احمد! تمھارا دلچسپ خط ملے ہوئے بھی دو ایک دن ہو چکے ہیں۔ مفصل تھا اور میں نے دو مرتبہ پڑھا۔ اصل میں دوسری مرتبہ اپنے ایک دوست کو سنانے کے لیئے پڑھا۔ اُن دوست نے بھی تمھارا اسٹائل اور دلکشی پسند... اُمید ہے کہ تمھارا نتیجہ آگیا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ ٹھیک ہی آیا ہوگا۔ سلطان احمد کے سلسلے میں یہ ہے کہ اگر محنت کرجائے تو ٹھیک ہے... میں تو یہ کہتا تھا کہ اگر کورس کے جملہ مضامین میں سے ایک میں بھی پاس ہوجائے تو بھی بڑی بات ہے۔ لیعنی یہ کہ اگر فیل بھی ہو تو ... بڑا تیر لگ جائیگا۔ بہرکیف کمال ہوگیا۔ مگر آئندہ محنت کرنیکی شدید ضرورت ہے۔ بھائی تصویر کے کالج میں اُمید ہے کہ سلسلہ ٹھیک رہیگا۔ نسرین، شیریں کے نتیجوں کی تفصیل سے اباجی نے مطلع کیا تھا۔ بہت اچھے نمبر تھے۔ اُدھر پنڈی میں عرفان اور سیما کا دل بہت لگ رہا ہے۔ اپنے نتیجے سے مطلع کرنا۔ ظاہر ہے کہ اچھا ہی ہوگا۔ مگر میں عنقریب پیرس جا رہا ہوں۔ وہاں میرا پتہ کیا ہوگا؟ خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن یہ کہ وہاں جانے کے بعد اپنے پتہ سے مطلع کردونگا۔
ویسے یہاں اپنے جملہ حالات اچھے ہیں۔ دو ایک دن ہوئے موسیو ژاں فورژ بھی پیرس سے یہاں آگئے تھے۔

میری ہی دعوت پر آئے تھے - اب باقاعدہ اور باضابطہ کام پیرس ہی میں کیا جائے گا۔ اُمید ہے کہ حالات اچھے رہیں گے -
اُمید ہے کہ گھر پر جملہ صورتِ حال ٹھیک ہوگی اور سب خیریت سے ہوں گے۔
تمام گھر والوں کو یاد کر دینا اور چچا جان کا سلام اور دعا کہہ دینا -
باقی پیرس جا کر تفصیل سے لکھوں گا - تمھارا - صادقین

PARIS.

مورخہ ۲۰ اکتوبر ۶۲ء

پیارے سید سلمان احمد -

مدت سے گھر سے کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی - فکر ہے - اُمید ہے ہر طرح خیریت ہوگی - اور تم لوگ پڑھنے میں اور ساتھ ہی ساتھ کھیل کود میں بھی مشغول ہوگے، اباجی اور اماں جی اپنی دلچسپیوں میں وقت گذار رہے ہوں گے - مختصر یہ ہے کہ سب کی بود و باش، اپنی اپنی طرح، اچھی ہو رہی ہوگی -

اِس سے بیشتر ایک خط لکھ چکا ہوں - اب تک اُس کا جواب آ جانا چاہیے تھا - ابھی اپنا پیرس میں مستقل پتہ طے نہیں پایا ہے - دوست کوشش میں ہیں - بہر کیف میں ابھی تک اُسی ہوٹل میں ہوں جس کا پتہ گذشتہ خط میں لکھ چکا ہوں - یا اُس ہوٹل کے یا موسیو ژاں فوژز کے پتہ پر خط فوراً لکھو - تاکہ خیریت معلوم ہو -

آج سے پورے ایک ہفتہ کے بعد، بروز جمعرات بتاریخ ۲۵ اکتوبر کامو والی کتاب "لا اترانژے" کا جشن خاص بوقت شام منعقد ہوگا - پلاس ڈی لا کانکورڈ کے نمبر ۶ میں - پیرس کی سب سے زیادہ پرشکوہ جگہ ہے - میڈام کامو بھی آئیں گی - اُمید ہے کہ اپنی ایک روا روی میں نمائش بھی ہو جائے - بہرکیف کتاب بڑی ہی شاندار چھپی ہے - اِس جشن تقسیم کتاب کے بعد کچھ آثار اچھے نظر آئیں گے - ویسے اب بھی بہت اچھے ہیں - اُس میں بیشتر بنی اسرائیل کی مہربانیاں شامل ہیں - کام ہو رہا ہے - اور عجیب و غریب قسم کا -

اور زیادہ فی الحال کیا لکھوں - خیریت سے جلد مطلع کرو - اور سب کو یاد کر دو -

تمھارا ... صادقین

Epoq Hotel,
34, rue Rouelle
PARIS 15e.

۲۴ اپریل ــــ سلمان احمد و سلطان احمد و نسرین فاطمہ، شیریں فاطمہ و عرفان احمد و یاسمین فاطمہ　　دعائیں

صبح ہوتے ہی چچا جان ایک دوسرے ہوٹل میں چلے جائیں گے جو بہت اچھا ہے اور بہت اچھی جگہ واقع ہے - وہاں سے پیرس کے تمام اہم علاقے نزدیک ہیں - یوں سمجھو کہ پیرس کے بیچوں بیچ میں واقع ہے - وہاں جانے کے بعد اباجی یا بابا صاحب کو خط

لکھیں گے تاکہ اگر وہ خط لکھیں تو اُسی ہوٹل کے پتہ پر لکھیں ۔ امی کا بھی ... اور بابا صاحب کا بھی خط ملا لیکن ابھی تک جواب
نہیں لکھا جاسکا۔ اُمید ہے کہ تم لوگ، ممو کے علاوہ خوب پڑھ لکھ رہے ہوگے ۔ اماں جی نے لکھا تھا کہ تمھیں یہاں کے ٹکٹ
درکار ہیں۔ جس لفافے میں یہ خط ہے اِس پر کئی طرح کے ٹکٹ لگا دیئے ہیں اِن کو اُکھیڑ لو ۔ آئندہ جو خط آئیں گے اُن پر
سے بھی اُکھیڑ لینا۔

سب بڑوں کو سلام کہہ دینا اور خیریت کہہ دینا۔

خط کا جواب اگلا خط آنے تک مت دینا۔

HOTEL Pension SELECT,
10, Rue Des Terreoux,
LAUSANNE,
(Switzerland)

مورخہ ۱۰ر اگست ۶۶

پیارے سلطان احمد۔

اُمید ہے کہ گھر پر ہر طرح خیریت ہوگی ۔

میں نے پیرس سے چلتے وقت تم کو اپنی خیریت کا خط تحریر کر دیا تھا اُمید ہے کہ مل گیا ہوگا ۔
راولپنڈی کو بابا صاحب کو خط لکھو تو میری خیریت لکھ دینا ۔ میں خود خط لکھتا مگر پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ
سے نہیں لکھ سکا ہوں ۔ بہرحال یہ خط ملتے ہی خیریت کا خط تحریر کرو اور اپنے نتیجے اور دیگر حالات سے
مطلع کرو ۔ سلطان احمد میرے خیال میں ابھی پنڈی ہی میں ہیں ۔ کب تک آ رہے ہیں؟ اگر آ گئے ہوں
تو اوپر لکھے ہوئے پتہ پر وہ بھی خط لکھیں ۔

ہاں تو میں آج کل سوئٹزرلینڈ میں ہوں ۔ یہ دنیا کا سب سے بڑھ کر خوبصورت علاقہ مانا جاتا ہے ۔
پہاڑ، سبزہ زار، آبشار، جھرنے، جھیلیں، وادیاں، پھول، ہریالی اور بڑے خوبصورت شہر
اور بڑے اخلاق والے یہاں کے لوگ ہیں ۔ اماں جی کو خبر کرنا کہ چچا جان کی صحت بھی اچھی ہو رہی ہے ۔
اور اور بھی اچھی ہو جائیگی اُمید ہے ۔ رنگ نکھر آیا ہے ۔ اگرچہ جانب تنگ کر رہی ہے ۔ کھانے میں
دقت ہو رہی ہے اور ادھر سے بھوک بھی لگتی ہے ۔ وقت فی الحال سیر میں ہی کٹ رہا ہے ۔ کاموں
کے راستے تلاش ہو رہے ہیں ۔ اُمید ہے کہ وہ تصویر اچھی بن جائیگی ۔
اور فی الحال کیا لکھوں ۔ اب تم دیگر احوال سے مطلع کرو ۔
گھر پر سب کو سلام اور دعا کہہ دو ۔ خط اماں جی بھی لکھیں ۔ جملہ حالات ۔ مفصل طریقے سے ۔
اور پنڈی کو اگر خط لکھو تو میری خیریت لکھ دینا ۔ فقط ۔

تمھارا چچا جان

Galerie PRESBOURG
20, Avenue KLEBER.
PARIS 16

مورخہ ۳۱ جولائی ۶۹ء

پیارے سلمان احمد ! یوں سمجھو کہ یہ تمھارے خط کے جواب کی دوسری قسط ہے۔
تقریباً ہر خط میں ہی کامو کی کتاب کا ذکر ہوا ہے۔ بقول تمھارے اتنی کامو کامو ہوئی کہ اب سیمیں فاطمہ کے ذخیرۂ الفاظ میں کامو کا لفظ بھی شامل ہو گیا ہوگا۔ آج پھر ذکر ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سوچتے ہوگے کہ جب شیروانی نہیں پہنی جا رہی تو چچا جان کا حلیہ کیا ہوگا۔ خلش ہوگی۔ ہے نا؟ جب کامو کی کتاب دیکھو گے تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ تمھارے چچا جان کی پیرس میں دھج کیا ہے کیونکہ اِس کی جلد ۲۵ رنگین تصویریں دراصل سب کی سب ہو بہو سیلف پورٹریٹ ہیں۔ کوئی فرق نہیں ہے۔ کتاب کا جو مرکزی کردار ہے اُس کو شیروانی نہیں پہنائی جا سکتی تھی کیونکہ جس علاقے کا ماحول اِس میں ہے اُس میں کسی نے شیروانی دیکھی بھی نہیں ہوگی۔ بہرکیف تمھاری خلش کہ چچا جان کا کیا نقشہ ہوگا اِس کتاب کو دیکھ کر دور ہو جائے گی۔ خود کامو نے اِس ناول میں شاید اپنا ہی خاکہ بنایا ہے کسی حد تک۔

کتاب چھپنی شروع ہو گئی ہے۔ سرورق چھپ چکا ہے۔ اپنا نام ذرا زیادہ نمایاں چھپا ہے کیونکہ کتاب بنانے والوں کی خواہش یہ تھی کہ میرے دستخطوں کا بلاک بنا کر سرورق پر چھاپا جائے اور نیلے رنگ میں۔ میں نے انکار بھی کیا کہ کیونکہ میرے دستخطوں سے لوگ واقف نہیں ہیں تو ٹائپ میں ہی موزوں رہیگا لیکن یہ کہ وہ نہیں مانے اور اپنا اور مولف کا نام نیلا چھپنے کی تجویز ہوئی اور کتاب کا نام اور ادارے کا نام سیاہ۔ بہرنوع۔ ابھی طولانی کام ہے۔ یوں سمجھو کہ ابھی بلو پرنٹ تیار ہوا ہے۔ کتاب کا سائز ۳۵ سنٹی میٹر ضرب ۲۵ سنٹی میٹر ہے۔

آج تمھارے بابا صاحب کا بھی مختصر سا خط ایک اور صاحب کے خط کی پشت پر لکھا ہوا ملا ہے۔ اُمید ہے کہ اِس دوران میں میرے خط مل گئے ہوں گے۔ ابھی کل ہی خط لکھ چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ ملے گا۔ کتاب مکمل ہونے کے بعد میں کچھ دنوں کے لیے آنے کی کوشش کروں گا۔ اور پھر واپسی پر نمائش کی جائیگی۔ ورنہ آنے میں اور بھی دن لگیں گے۔

اچھا۔ اور کیا صورت ہے۔ کیونکہ گھر والے بھی اِس خط کو دیکھیں گے تو ہنسی مذاق کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ کم عمر لڑکیوں سے گفتگو کے دوران یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو ہم تمھارے بزرگ ہیں دراصل ہمارے بھتیجے سے دوستی کرنے کی عمر ہے تمھاری۔
آج کل تو وہاں گرمی بہت ہوگی۔ تم لوگ کرتے پہن رہے ہوگے۔ آج کل اماں جی کا

جو چلا سب سے زیادہ کس پر ہے۔

بابا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ چچا جانی صرف انگریزی میں فیل ہوئیں۔ تعجب ہوا۔
اِس پر تعجب ہوا کہ صرف انگریزی میں بلکہ ورنہ اور مضمونوں میں بھی فیل ہونے میں
کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ بہرحال بہت غنیمت بات ہے۔ ضمنی امتحان میں پاس ہونے کا
امکان ہے۔

تم لوگوں کے نیچے نہیں لکھے۔ تم خود ہی لکھو۔ باجی سے کہو کہ جلد ہی ایک غزل (۵) آئے گی۔
سید سلطان احمد کیوں خاموشی اختیار کیئے ہوئے ہیں۔ اُن سے کہو کہ خط لکھیں تو
اُن کو جواب میں ٹکٹ روانہ کیئے جائیں۔ سب نے خط لکھے۔ نسرین فاطمہ گول کر گئیں۔
شیرین فاطمہ۔ عرفان احمد اور سیمین فاطمہ کا بھی خط آیا تھا۔

ابا جی۔ اماں جی۔ بابا صاحب۔ باجی اور چچا جانی کو سلام کہدو اور یاد کردو اور تم کو،
سید سلطان احمد۔ نسرین فاطمہ۔ شیرین فاطمہ۔ سید عرفان احمد اور سیمین فاطمہ کو
دعا اور پیار۔

اور کیا لکھوں۔ نقشے ٹھیک ہیں۔

تمھارے چچا جان

(۵) غزل آموں سے متعلق ہوگی اور اِس کا مضمون مسلسل نہ ہوگا کہ اوّل کے لیئے جو بہترین تیار چیز ہے کہ آم ہیں قدرت نے بنائے اور دوم (کوچک) کے واسطے گٹھلی پیدا کی ہے اور کیسا آم پیدا کیا ہے۔ گٹھلی اِس لیئے پیدا کی ہے کہ وہ کیسا آم پر اپنا رحم کا اخراج کرے۔ صنعت لف و نشر ہوگی۔
پیرس۔ ۱۷ر جون ۶۶ء۔

پیاری شمون۔ سیمیا۔ سیمین فاطمہ

اپنے بھائی جان سید سلطان احمد کو یہ جتنے ٹکٹ اِس لفافے میں ہیں دینے کے بعد بتاؤ کہ یہ اِس جرمانے میں
روانہ کیئے جا رہے ہیں کہ لفافے پر ہمیشہ ایک ہی نمونے کا ٹکٹ روانہ کیا جاتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نئے فرینک کا ٹکٹ
جو پاکستان خط روانہ کرنے کے لیئے ہونا چاہیئے اُس کا صرف ایک ہی نمونہ ہے اور اگر ایک فرینک کے کئی ٹکٹ لیے جائیں
یعنی جن کی مجموعی قیمت ایک فرینک ہو تو وہ چپکنے میں جگہ زیادہ گھیر لیتے ہیں اور پتہ لکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور
پھر مہریں بھی لگتی ہیں تو اور بھی گھچ پچ ہو جاتا ہے۔ خیر یہ اِس بات کے جرمانے میں یہ ٹکٹ روانہ ہو رہے ہیں اور
اگلے خط میں اور بھی روانہ کیئے جائیں گے۔

یہ ٹکٹ سید سلطان احمد کو دینے کے بعد اپنی اماں جی کو بتاؤ کہ وہ آخر کونسی شام ہے جس میں چچا جان
کا عشرت کو یاد کرتے ہوں۔

جب رکابیوں پر نئی نئی قلعی ہوتی تھی اور گھی ڈال کر ساگ گوشت کھایا جاتا تھا تو پوری رکابی سپوٹنے کے
بعد بھی رکابی کا رنگ سبز پتی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ چمکتا ہوا سبز رنگ۔ یہاں تانبے کی رکابیاں نہیں ہوتیں
چینی کی ہوتی ہیں۔ مگر اُن میں جو سالن ہوتا ہے اُس کو ختم کرنے کے بعد جو کیفیت اور رنگ ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا
ہے جیسے کہ سالن کا عشرت کا پکایا ہوا تھا اور پھر سالن کا ذائقہ ——— اور بوٹیوں کی خستگی اور تری اور مصالحہ

اور اُٹھتی ہوئی بھاپ جسم آتھو کے والو اگر خواب میں بھی دیکھ لیتے تو ارو بے سے برس آ گئے ہوتے۔ اور جو خاتون
کھانا میز پر رکھتی ہے اپنے انداز اور مزاج اور صورت میں صادقی تصویر سے ملتی ہوئی ہے۔ یہ جگہ ہے تو بہت مہنگی اور
ہے بھی اپنی ہی گلی میں مگر کھانا بہت اچھا ہوتا ہے۔۔ اور تمہارے چچا جان کھانے جاتے ہیں اور ان کا عشرت
کو یاد کرتے ہیں اور صادقی تصویر کو بھی یاد کرتے ہیں۔ بوتیاں یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کہ گلاب کا تازہ تازہ کھلا
ہوا پھول ہے۔ پھول کیا ہے پورا گلدستہ ہے۔ اور اُن کی تری، خشکی اور گداز اور آب و نمک اور
درجۂ حرارت اور خوب صورتی۔۔ اور اس سے بیشتر تمہارے چچا جان اپنی اماں جی کو بتادوں کہ شوروا بھی پیتے
ہیں اور کبھی کبھی اُس میں ٹکڑے بھی ڈالتے ہیں۔ اُس وقت بھی کا کا عشرت کو یاد کرتے ہیں۔

مگر کھانے میں کاہلی کی اور کام کی زیادتی کی وجہ سے فرصت نہ ہونے کے باعث کھانے شام میں ہی ہیں اور
دن میں گول کر جاتے ہیں۔۔ کام کرتے رہتے ہیں مگر رات کو خوب کھاتے ہیں۔ کھاتے کیا ہیں۔ کھانے کی کوشش
کرتے ہیں کیونکہ بھوک کم ہو گئی ہے ———

یہ خط چاہ رہا تھا کہ مکمل ہو جائے اسی طریقے پر لیکن موقع نہ ملنے کے باعث رہ گیا اور اب پھر
روا روی میں لکھا جا رہا ہے ورنہ اگر ہو گیا تو رہ گیا اور پوسٹ نہیں ہو سکیگا۔

۱۰ / جون ـــ [illegible]

اپنے بابا صاحب کو مطلع کر دو کہ اُن کو اس سے پیشتر ایک رقعہ اور ایک کاغذ تحریر کیا جا چکا ہے۔ اُمید
ہے کہ مل گیا ہوگا اور یہ بھی بتا دو کہ چچا جان ان دنوں کامیو کے ناول پر کام کر رہے ہیں اور اس کی اشاعت
کے بعد نمائش ہوگی تو پیرس کے اسٹار اکسپرس جینیم متوالیان برگزیدہ کا مشورہ یہ ہے کہ اُس وقت
زیادہ سونا اور چاندی آئیگا کیونکہ کتاب کی اشاعت کرنے والا کلب فرانس کے مالدار ترین
لوگوں پر مشتمل ہے اور وہ لوگ نمائش میں تصویریں بھی خریدینگے۔ یہ اُسی صورت میں ہوگا جب
کتاب چھپ جائیگی۔ اُس کا چھپنے میں صرف اپنی ہی طرف سے دیر ہے۔ مختصر طریقے پر یہ کہہ دو
کہ معاملات اعلیٰ ترین سطح پر ہیں۔

اور اپنے بہنوں اور بھائیوں سے کہو کہ پڑھا کم کریں اور مجھے پیار زیادہ کیا کریں اور
جو چیز کھائیں اُس میں سے زیادہ مجھے کھلایا کریں ——— اور اپنی اماں جی سے ابھی ابھی ایک
دو آنے لے لو۔

ابا جی اور اماں جی کو یاد کر دو اور سلام کہہ دو اور بابا صاحب۔ باجی اور چچا جان کو بھی۔
اور سید سلمان احمد۔ سید سلطان احمد۔ نسرین فاطمہ۔ شیریں فاطمہ اور
عرفان احمد کو دعا و پیار ———

تھوڑے تھوڑے خط لکھا جا رہا ہے۔
یہ ٹکٹیں سید سلطان احمد کو دیدو اور اُن سے کہو کہ چچا جان کو تمہارے اس خط کا
جواب وہ لکھیں گے تو اور بھی ٹکٹ روانہ کیے جائیں گے۔

تمہارے چچا جان

پیرس - ۱۴ اپریل ۹۲ عیسوی

بھائی جان -

اُن کے اباجی کے خط سے معلوم ہوا کہ سمُون آموں کی رکھوالی کر رہی ہیں - اور بکھر بھی رہی ہیں - بہر حال اُن کی بیٹیاں اور شیریں فاطمہ کو مطلع کر دو کہ اُن کے خط کا جواب جلد از جلد یعنی ایک دو روز میں آنے والا ہے - سوفیان احمد کا بھی خط آیا تھا - اُمید ہے کہ بکرے ہو رہے ہوں گے اور چھوٹی آپو کی جملہ خدمات میں وقت گذارتے ہوں گے - نسرین فاطمہ کیا کہتی ہیں - سلطان احمد کے کیا تیور ہیں؟ اور سلطان احمد کے کیا مشاغل اور مصروفیات ہیں - بہر حال اِن لوگوں سے یہی کہدو کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے - دیر آید درست آید - کچھ نہ کچھ آ ہی جائے گا - انوار صاحب تھوڑی دیر پیرس میں ٹھیرے اور پھر اپنے ہی مشاغل میں پھنس گئے اس وجہ سے کچھ خریداری کرنے کی نوبت نہیں آئی اور وہ خط جس میں تم نے نام لکھی تھیں وہ بھی جیب میں نہیں تھا - پھر ایک اور آپ صاحب میں کچھ لیا بھی جاتا تو وہ اچھا ہونے کے امکانی طور پر بہت کم امکانات تھے - بہر کیف اور سب اپنی افتادِ طبع اور انتہا پسندی اور اِس قسم کی اشیاء کے خریدنے میں اپنا انداز ہی ہے - مثلاً مرحوم نانا میرا سے اگر یہ کہا جاتا کہ عطر اور ریشم لادو تو یہ اُن کے بس کی بات نہیں تھی - مزاجی افتاد اور رویہ کی بات ہے - آم - امرود یا ارن خربوزہ تا لَہ شیرا خریدنے کے لیے ایک رویہ رکھتے تھے ایک ڈھنگ اور ایک مزاج رکھتے تھے - ریشم اور عطر ؛ جیسے کا تیل خریدنے کے لیے جو رویہ چاہیے وہ اُن کے برادر کلاں میں یقیناً ہوگا - وہ کہیں جاؤ اپنے ابا ہی کے لو - دکانوں میں جا کر مختلف کپڑوں کا جائزہ لے کر اُس میں سے ایک منتخب کرنے والا رویہ اُن میں بھی نہیں ہے - بایک بڑے کے کسی جولاہے نے جو کچھ دیدیا وہ ٹھیک ہے اب وہ اگر ماموں صفدری کو دیتے کہ بھائی میں آپ کی شیروانی کے لیے کپڑا لایا ہوں تو وہ یہ کہتے کہ نیا میاں یہ کیا اُٹھا لائے ہو - عطر ریشم خریدنے والا رویہ مثلاً ماموں مشتاق حسن میں پایا جاتا ہے - اُن سے اگر یہ کہو کہ ارن خربوزہ خرید کے لادو تو اُن سے نہیں لایا جائے گا - میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو نہ تو ارن خربوزہ ہی ٹھیک خرید سکتا ہے اور نہ ریشم ہی - رویہ ہی نہیں - جن میں رویہ ہوتا ہے وہ خواہ مخواہ (چاہے خریدنا ہو کہ نہ ہو) پھر بھی جبلی طور پر غیر ارادی طور پر اِن چیزوں کو دیکھتے رہتے ہیں - اور چیز نظر میں رہتی ہے کہ کونسی اچھی ہے اور جیسے ہی خریدنے کا وقت آتا ہے جھٹ سے فوراً خرید لیتے ہیں - مزاجی افتاد کے اعتبار سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ ہی چیز نہ ارن خربوزہ نہ کپڑا کچھ بھی اچھا نہیں خرید سکتے - اِن لوگوں میں بابا ہیں اور جہاں تک میرا اندازہ ہے بھائی سوز بھی اور چھوٹے ماموں اور میں - جیسے تنو دو بیٹیوں کی چھٹیوں میں غازی آباد سے آتے ہیں تو بھائی سوز اُن کو قلفیاں کھلا رہے ہیں - یا چھوٹے ماموں کے ساتھ ہم لوگ تاشے اور وہی جلیبیاں کھا رہے ہیں یا میں سوفیان احمد کو آئس کریم کھلا رہا ہوں - ہم لوگوں کا (بھائی سوز، چھوٹے ماموں اور میں) یہ رویہ اور یہ طریقہ ہے - مزاجی افتاد کی بات ہے یہ - اب اگر سلطان احمد اور اُن کے برادری کے لوگ یہاں ہوتے تو آئس کریم کھا رہے ہوں وغیرہ وغیرہ - میں یہاں سمُو کی عمر کی ایک بچی کو اکثر جیسے یاد کرتا ہوں اور نسرین شیریں کی ہم عمر بچیوں کو کبھی کبھی کینڈی (مٹھائی شوکولا) وغیرہ دلائی جاتی ہے - بہر کیف سلطان احمد اور اُن کی بہنوں بھائیوں سے یہ کہدو کہ "دیر آید درست آید" چچا جان اپنے اندر رویہ پیدا کر رہے ہیں اور کوئی اچھی سی چیز آئے گی -

رویہ اور جذبہ دو الگ چیزیں ہیں - قوتِ خرید کے باوجود بھی اگر کچھ نہ خریدا جائے تو کرب ناک بات ہے اور میں اِس کرب سے دوچار ہوتا ہوں - اِس کو تاویل یا معذرت سمجھنا - بہر کیف - پرچہ بڑا آباد - کرسچیال ڈیور کے یہاں کی کچھ ٹائیاں نظر میں ہیں اور وغیرہ وغیرہ - اگر چہ یہ اب یہ ہے جیسا کہ نانا شیرا کا چنبیلی کا تیل خریدنا یا بھیا بڑی کا کوئی تجریدی آرٹ کا مجسمہ خریدنا اور پسند کرنا - خیر - اگر پسند نہ آئے تو اُس میں اپنا قصور نہیں ہوگا - اندازی لائن پر عمل کرنا اور پھر یہ کہ اپنی اپنی نگاہ ہے - کسی کو کچھ اچھا لگتا ہے اور کسی کو کچھ -

گذشتہ دنوں میں کوئی چیز نہ بھیج سکنے پر بچے مایوس ہوئے ہوں گے اور بعض کو غصہ ہوتی ہوگی اور مجھے کرب - اگر چہ تم نے تو آئی ایس فرمائش ہی نہیں کی - معمول اور طفیل کا اپنا جذبہ ہے تو اُس سے کچھ زیادہ ہی دینے کا ارادہ تھا مگر سکت بھی اور گنجائش بھی - پھر بھی نہیں ہو سکا - کرب ناک بات ہے - خیر اماں سے کہو کہ سلطان احمد اور اُن کی برادری کو آج معمول سے زیادہ جیسے دیدیں اور جو رویہ کا کھلا ہوا لائسنس ہی - مگر یہ کہ جوڑ رنگی سے آگے جانے کی ممانعت ہے - سلطان احمد نے لکھا تھا کہ وہ جنگ میں تھی کچھ پیس انداز کر رہے ہیں - اللہ اللہ - اِن جنگ پر یاد آیا کہ دہاں یونائیٹڈ بنک والوں کا جو بیان خط آیا تو اُس سے معلوم ہوا کہ ابھی کچھ اور بھی مزید دوران باقی ہے اگر ہمیں تنخواہیں نہ مل رہی ہوں تو گنجائش ہے - ایک رقم اور لکھا جا سکتا ہے - اُن کے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تم ۳ فنک داخل کرو تو قانونی معاہدہ میں اُس کے ۲۰ روپیہ مانے جائیں گے - خیر دیکھا جائے گا -

آج شام ہی اپنی ایک چھوٹی سی تصویر کوئی دو فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی دو ہزار تین سو فرنک میں بکی - ایک اور بھی بکنے والی - جو تصویر بکتی ہے اُس میں سے چالیس فی صدی گیلری کا ہوتا ہے - اپنی گیلری کا مالک انتہائی شفیق

اور مہربان اور خلیق اور رئیس و مہذب آدمی ہے۔ تصویر اگر کھنچی ہے تو اس میں تصویر میں تو تھوڑا بہت آرٹ
ہوتا ہی ہے لیکن اُس کے پیچھے میں اور بھی زیادہ آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گیلری کی چابی میرے ہی پاس رہتی ہے۔
ہاں جس مکان میں میں رہتا ہوں اس کے زمین دوز حصے میں جس کے روشن دان سڑک پر ہیں بہت بڑے بڑے
کمرے اور کوریڈور ہیں اور روشن جگہ ہے۔ کام کرنے کے لیے آئیڈیل۔ یہ جگہ تمام کی تمام اچھا اسٹوڈیو بن گئی ہے۔
اور یہ واحد مکان ہے جس میں باغ بھی ہے کیونکہ اس علاقے کی زمین کا ہر انچ کارآمد ہے لہٰذا گارڈن کی لگژری غیر معمولی
چیز ہے اور پھر یہ کہ موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ تیتلیاں نکل پڑی ہیں اور اپنے پاس اتنی جگہ ہے اسٹوڈیو میں کہ میں ایک
پریس خریدنے کو سوچ رہا ہوں تاکہ کندہ کاریوں وغیرہ کے پرنٹ اپنے ہاتھ سے ہی نکال لیا کروں۔ کام کرنے کے لیے بہترین
صورت حال ہے۔ اور پھر یہ کہ بولینی ہے۔ یہ غیب کی بے حساب مدد ہے۔ ورنہ۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔
بالائی حصے پر اپنی رہائش ہے۔ اور وہی پابندی اور قدغن (اپنی ہی طرف اور اپنی ہی طبیعت کی وجہ سے) ہے جو گھر
پر ہوا کرتی ہے۔ یعنی بزرگوں کے سامنے شرفا کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات آ نہیں ہو سکتی۔ کتنا شفیق اور خلیق
بزرگ ہے جس کے مکان میں ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ یہ سب اپنے گیلرسٹ موسیو ژان فورنر کی مہربانی ہے۔ کاروباری
وجہ سے نہیں بلکہ رئیس الطبع ہونے کی وجہ سے۔ چشم سیر ہونے کی وجہ سے یہ شخص مہربان ہے۔ ورنہ مجھے پیرس میں کون جانتا
ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ یہاں لوگ نام خریدتے ہیں۔ اور نام بنانے میں عمر گذر جانے کے بعد وہ بھی اگر قسمت اور حالات ساتھ دیں۔
خلاصہ یہ کہ غیب کی لامحدود مہربانی ہے۔ مگر یہ مت سمجھو کہ زندگی بس تختۂ گل ہے۔ بستر گل ہی ہو گئی ہے نہیں۔
محنت اور مشقت ہے، خلش اور جستجو ہے۔ ایک درد ہے۔ ایک عرق ریزی ہے۔ مگر یہ کہ حالات آئیڈیل ہیں۔
کوئی تیس دن کے لیے ٹکٹ بیکار ہو جائے گا۔ کشتیاں نذر آتش ہو جائیں گی۔ موقع کام کرنے کا ہے اور لاجواب ہے۔
زمانہ چاہیے کہ سان گمان اور خواب میں بھی اس کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ پیرس ہے یہ۔ اور اوپر سے بڑھ گیا ہے۔
کیا اسٹوڈیو ہے اور کیا موقع ہے اور کیا لوگ ہیں۔ چشم بد دور۔

ہاں تو میں لکھ رہا تھا کہ زندگی ایک جہاد ہے۔ ایک تگاپوئے دوام ہے۔ ایک فکر ہے۔ ایک جد و جہد ہے۔
بستر گل نہیں ہے۔ ورنہ غیر ملک۔ الاماں۔ امریکہ اور انگلستان ایسے غیر ملک نہیں ہیں کیونکہ وہاں کی زبان
تو آتی ہے۔ فرانس تو بالکل ہی غیر ملک ہے اور پیرس۔ یہاں پیسہ خرچ کرنا دنیا میں سب سے زیادہ آسان کام ہے
اور پیسہ کمانا سب سے زیادہ مشکل اور پھر وہ بھی آرٹ سے۔ تو یہ تقریباً ناممکن کے قریب قریب ہے۔ مزید یہ کہ بیدار رہو وقت
کی گردش کچھ اس انداز سے ہے کہ عید اور شب برات (شبرات) بے نور روز ہوگئی ہے۔ مگر یہ کہ فکر تیز رہی ہے اُس کے درمیان
میں۔ گذشتہ اگست کے بعد سے نہ کوئی وظیفہ ہے نہ کچھ اور۔ صرف چرخ کہن کی مہربانی ہے کہ اللے تللے کے ساتھ زندگی گزر رہی
ہے۔ مگر محنتی اور جفاکش آدمی ہوں۔ سخت جان ہوں۔ ورنہ جو انداز زندگی ہے اور جو اس کی تیز رفتاری ہے وہ
ناگفتہ بہ ہے۔ آج اپنے اسٹوڈیو میں کچھ پروجیکٹر لگائے گئے ہیں اور میں ایک عدد خوب بڑی ایش ٹرے خرید لایا ہوں۔
مگر یہ کہ آج کی رات کام نہیں کر رہا ہوں صرف خط لکھ رہا ہوں۔ یہاں مونپارناس میں ایک کیفے لا روتوندے ہے جہاں
لینن اور ٹراٹسکی کا جلا وطنی کے زمانے میں ٹھکانہ تھا اور موڈگلیانی اپسٹین وغیرہ کی جوانی بھی یہیں خراب ہوئی تھی۔
بہرکیف اس کا مالک اپنا دوست ہو گیا ہے اور کبھی کبھی اپنی دعوت (ڈنر) بھی کرتا ہے۔ ایک دن مذاق مذاق میں ایک لڑکی،
اجنبی لڑکی کی وہاں تصویر بھی بنی۔ وہ اُس نے دیوار کے شیشے پر لگا رکھی ہے اور مجھے پسند نہیں ہے۔ بہرکیف آج کی شام
وہیں گذری، کھانا بھی وہیں کھایا گیا اور کونیاک کا شغل بھی اُس کے اصرار پر وہیں ہوا۔ رد دعوت یہاں اخلاقاً طور
پر اچھی بات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا میں نے کج اخلاقی کا ثبوت نہیں دیا۔

ہاں۔ تین چار روز ہوئے کہ تمہارا خط ملا تھا۔ اور وہ تراشہ بھی اُس میں تھا۔ میرے خیال میں اب بہت ہو گئی
اور اب کچھ وقفہ اور تعطل کی ضرورت ہے ورنہ سامعین بھی اُکتا جائیں گے۔ مگر یہ بات ہی ٹھیک۔ اُمید ہے کہ اثر
اچھا ہی ہوا ہوگا۔ بہرکیف آئندہ کچھ تعطل ضروری ہے۔ اپنی نمائش اپریل میں نہیں ہو رہی۔ ویسے تو پروازیں
ہو رہی ہیں لیکن یہ کہ باقاعدہ طریقے پر مستقبل قریب میں نمائش ہوگی۔ گیلری اپنی ہی ہے۔ بینالی پر کہ اپنی رہی ہے۔
اصل میں کام ہونا چاہیے اور اُمید ہے کہ ہوگا۔ اچھا ہی ہوگا۔ کافی کچھ ہوا بھی ہے۔ اچھا ہوا ہے۔ نمائش اچھی ہی ہونی
ہو گی۔ اور جب ہوگی تو مطلع کروں گا۔ (ویسے تو ہو ہی رہی ہے مستقل)۔ میں اگر آرٹ کے بازار کی پیچیدگیاں تحریر
کروں تو خواہ مخواہ صبح بھی ہو جائے گی اور میں بھی تنگ آ جاؤں گا اور تم لوگوں کے لیے بھی اس کا پڑھنا کچھ دلچسپ

نہیں ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ آرٹسٹ کا ایکسچینج! پیرس کا سٹہ بازار۔ وہاں مختلف کمپنیوں کے حصص کی قیمت کے اتار
اور چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے اور یہ اتار چڑھاؤ بالواسطہ تصویروں کی خرید فروخت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حصص کی
قیمت اگر بڑھ رہی ہے تو لوگ تصویر خریدنے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ بہرحال۔ اور یہ میں بھی یہ اندازہ لگا رہا ہوں
کہ میں اب جو کام کرنے والا ہوں وہ گذشتہ کام کے مقابلے میں زیادہ اچھا ہوگا۔ لہٰذا وہ کام جو ہو رہا اور ہونے والا ہے
وہ بھی نمائش میں کیوں نہ شامل ہوتا کہ اور بھی زیادہ اچھی ہو۔ ورنہ یہ کہ گیلری میں اپنا کمرہ 'پورا اختیار'
ہے جس وقت مرضی ہو نمائش ہو جائے اور پھر یہ کہ کاموں والی کتاب بھی اگر نمائش سے پہلے تیار ہو جائے تو اُس کا
فوراً نمائش کی کامیابی پر اثر پڑے گا۔ مختصر یہ ہے کہ نمائش اپریل میں نہیں ہو رہی۔ اچھا ہے۔
وہی بات جو میں سلطان احمد اور اُن کی برادری کو لکھ چکا ہوں کہ ـــ "دیر آید درست آید"۔
اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ میں ابھی آ نہیں رہا۔ جب سردیاں یہاں گذر گئیں تو موسم بہار یہاں کیوں نہ گذرے۔
لیکن دوسرا اے ان گا۔ دیکھا جائے گا۔

تو پیڑوں میں پتیاں آ رہی ہیں، پھول کھل رہے ہیں اور گل فروشوں کی دُکانیں رنگا رنگ ہیں، موسم خوشگوار ہونا
شروع ہو گیا ہے اور اپنے اسٹوڈیو میں کام کرنے کا بہترین ماحول ہے ـــ سب کچھ ہے۔ رنگ روغن سے مطلب ہے۔
ـــ کلر کیا ہے۔ بس کھڑکیوں کا حال اللہ نہ پوچھو۔ عجیب ہے۔ پیارا ہے اسٹوڈیو کی بات ہے۔ واہ رے غیب۔
ہوٹل اگرچہ اتنی بڑی جگہ نہیں ہے جتنا کہ پیرس ہے مگر واہ رے غیب۔ ٹھاٹ ہی ہیں۔ الامان۔ اور کیا کہوں
بس یہ کہ ـــ "ہر ایک رنگ کی ہوتی ہے غیب سے امداد" واقعی۔ یہ بات تو ہے۔ رنگ سے مطلب ہے
"ہرچہ بادا باد" والا جو زندگی کی طرف رویہ ہے وہ بھی اللہ میاں کی بڑی دین ہے۔ قناعت اور استغنا والا
رویہ اگر ہو تو "ہم نہ" کھل جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تجربہ ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
سنتوش یاد آ رہی ہیں۔ اُنہیں پیار کر لو ذرا۔ اُن کے چچا جان کی طرف سے۔
اور شیرین فاطمہ سے کہہ دو کہ اُن کے خط کا جواب جلد از جلد یعنی دو ایک روز میں دیا جائے گا۔
اور شیرین فاطمہ کو مطلع کر دو کہ الماری میں بہت سے ہینگر ہیں لیکن ابا کا اوور کوٹ دروازہ کی چٹخنی پر
ٹنگا ہوا ہے۔ اور عرفان احمد کو بتاؤ کہ جب کبھی چچا جان آئیں گے تو تمہارے لیے بیسٹ بال لائیں گے
اور سلطان احمد سے کہو کہ اے جانِ عزیز تو اگر کوئی بھی پہنے تو تیرے جسم پر جا کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشک
ہے۔ ریشم ہے۔ یا اُٹ۔ کیا ہے۔ بہت کچھ اچھی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اور سلطان احمد کو بتاؤ کہ تمہارے
مردانہ حسن کی داد سب سے زیادہ پیرس ہی میں مل سکتی ہے۔ کیا بات ہے۔ چشم بد دور۔ بقول بزرگاں:
اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور طاقتور بنائے۔ تگڑا کرے اور توانا کرے اور صحت والا کرے۔
نیک و بد کی تمیز دے۔ اُن کے ابا جی کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ پڑھنے لکھنے میں لگے ہوئے ہیں۔ امید ہے
کہ سب اچھے نمبروں سے پاس ہوں گے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ محسن بھی بڑی محنت سے پڑھ رہا ہے۔ اللہ اُس کی
محنت کی راحت اور اجر دے اور سرخرو کرے اور کامیاب کرے۔ بھابی جی کیسی ہیں اور اُن کی طبیعت
کیسی ہے۔ اُمید ہے کہ آرام کرتی ہوں گی اور طبیعت کے بندہ نواز انداز کو برطرف کر کے کھانے پینے اور آرام
کی طرف توجہ کرتی ہوں گی۔ ورنہ تبلیغ کی ضرورت ہے کہ آرام کرو اور دودھ پیو۔ شوہر بزرگ تو ایک
طرف اب تو ماشاءاللہ اولاد بھی تبلیغ کر سکتی ہے۔ وہ تو وہ۔ اُن کے ابا کو بھی یاد کر لیا جاتا ہے۔
شوہر و شادی تو خیر مذاق کی بات ہے مگر اس میں ایک خلوص کی لہر شامل ہوتی ہے۔ وہ بھی اُن ہی کی
خوشنودیٔ طبع کے لیے ـــ اور کیا۔ اُمید ہے کہ اُن کی صحت اچھی ہوگی اور خوش ہوں گی۔
سنتوش کو پیار کرو نینی میشی کو اور شیرین فاطمہ کو بتاؤ کہ اُن کو اپنے خط کے جواب کا دو تین روز
اور انتظار کرنا ہوگا اور پھر اُس کے بعد وہ فوراً ہی خط لکھیں گی۔ ابو (شیرین فاطمہ) کے مزاج کے بارے
میں مطلع کریں گی اور عرفان احمد کی خیریت خاص طور سے لکھیں گی۔ اور سیمین فاطمہ کے بالوں کی لمبائی
اور انداز آرائش بتائیں گی۔ بابا اور اماں کو سلام کہنا۔ بچوں کو دعا و پیار۔ بھائی جی اور محسن کو سلام۔
میں خود بھی یاد کرتا ہوں اور تمہاری صحت و سلامتی کا اور جانِ عزیز کا مشتاق اور خواہش مند ہوں۔
آخر الذکر تو ماشاءاللہ ہے۔ فکر مت کرو۔ اطمینان رکھو اور بچوں کو پیار کرو۔

کراچی کی نامور آرٹ گیلری جو پاکستان کے عظیم سپوت مرحوم صادقین کے نام سے موسوم ہے اپنی مقبولیت اور خدمات کے اعتبار سے کراچی کی ایک شاندار آرٹ گیلری کا روپ دھار چکی ہے تاریخی عمارت فریئر ہال کی بالائی منزل جہاں مرحوم صادقین نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے اور شہر کراچی کا قرض اتارنے کے لئے اس کی چھت کو علم کائنات جیسے دقیق مضامین سے مزین کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور اس کی تکمیل کے لئے رات دن ایک کردیئے تھے۔

اس کے علاوہ سورۂ رحمٰن پر مشتمل ہم سنگِ مرمر کی الواح بھی جو اہلیان کراچی کو تحفتاً دیئے تھے وہ بھی اس گیلری میں عوام کی نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔

بلدیہ کراچی نے اس گیلری کی تیاری پر بھرپور توجہ دی اور وسائل کی کمی کو بالائے طاق رکھ کر اس کی سجاوٹ اور دلفریبی بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بالآخر ۳۰ اگست ۱۹۹۰ء کو اس کا شایانِ شان افتتاح بدستِ چیئرمین سینیٹ جناب وسیم سجاد کیا گیا۔

کئی اعتبار سے اس گیلری کی اپنی ایک منفرد اور ممتاز حیثیت ہے اس کا نکتہ خاص یہ ہے کہ بلدیاتی سطح پر فن و ثقافت کی ترقی اور ترویج کے لئے عظیم فنکار صادقین کے نام سے ایوارڈ کا اجراء نوجوان فنکاروں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

بلدیہ عظمیٰ کراچی نے اس عظیم فنکار کے نام و فن کو زندہ رکھنے کے لئے اور فنون لطیفہ کی عوام میں مقبولیت اور اس کی ترقی کے لئے فنکاروں کو معاشرہ میں ان کا جائز مقام دلانے کے لئے "صادقین ایوارڈ" کا ۱۹۹۱ء میں مرحوم کی چوتھی برسی پہ اجراء کیا۔

صادقین کا نام اور ایوارڈ کے اجراء نے دنیائے فنون میں ایک ہل چل مچادی اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی فنکار اپنے اپنے فن پاروں کے ساتھ اس مقابلہ میں شرکت کے لئے نکل آئے۔ بلدیہ نے اس مقابلہ کے لئے بہترین تخلیقات پر انعامی کا شیلڈ کے ساتھ نقد انعامات کا بھی (اوّل انعام پر دس ہزار، دوم پہ پانچ ہزار، اور سوم پر تین ہزار۔ حوصلہ افزائی کے تین انعامات پانچ پانچ سو روپیہ اور خطاطی کے خصوصی انعام پر دو ہزار) اعلان کیا تھا۔ یہ انعامات ہر سال بہترین مصوری پہ دیئے جائیں گے۔

یہی نہیں بلکہ مرحوم صادقین نے جیسے اپنی زندگی فنون لطیفہ کے لئے وقف کردی تھی۔ اور ان کا مشن بھی یہی تھا کہ عوام تک اس فن کو مقبول کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے عارضی نوعیت کی نمائشوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔